آموزش

۱۰ شماره ۱۰] لاهور [جنوری ۸

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہنامہ

آموزش لاہور

جنوری ۱۹۵۸ء

جلد ــــــــــــ ۱۰

شمارہ ــــــــــــ ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

سیرت سازی کی ذمہ داری

ایم۔ اے مخدومی

پنجاب یونیورسٹی کی ۸۵ ویں کونوکیشن کو خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ میجر جنرل اسکندر مرزا نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان لوگوں کے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں جن کے کندھوں پر ملک کی اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری ہے، صدر پاکستان نے کہا :۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کو آج ایک کثیر الاطراف چیلنج کا سامنا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب جو ہری توانائی کی کہانی پرانی ہو چکی ہو اور چاند میں سیر و تفریح کے لیے جانا مستقبل قریب میں ممکن نظر آرہا ہو۔ ایسے ناقابل یقین امکانات کے دور میں یہ بات ناگزیر ہے کہ تعلیم کی ماہیت اور اس کے نظام سے غیر معمولی مطالبے کیے جائیں۔ یونیورسٹی کا وہ پرانا روایتی تصور جس نے اسے گنے چنے صاحب حیثیت لوگوں کی اعلیٰ تعلیم کا الگ تھلگ مرکز بنا رکھا تھا۔ زندگی کے بے پناہ تقاضوں کے زیر اثر ختم ہو چکا ہے لیکن اب خطرہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا موجودہ دور تعلیمی توازن کو دوسری سمت میں نہ دھکیل دے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک خوفناک غلطی ہوگی کیوں کہ زندگی کبھی بھی ایک بے جان کل نہیں بن سکے گی۔ یہ بدستور ان احساسات اور جذبات سے دھڑکتی رہے گی جو انسانی ذہن کے سب سے زیادہ پُر اسرار خصائص ہیں اور جو سائنسی تجربہ گاہ اور مشینی کارخانے کی زد سے باہر ہیں۔ اس لیے سائنسی ترقی کے حد درجہ ہوش ربا کارناموں اور امکانات کے زمانے میں بھی تعلیم کی بنیادی ذمہ داری یہی رہے گی کہ وہ موزوں قسم کے آدمی اور عورتیں تیار کرے۔ پاکستان جیسے ملک کے لیے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ایسے مرد اور عورتیں تیار کیے جائیں جو اپنے وقت کی ضرورتوں کو بہترین طور پر پورا کر سکیں۔ کیوں کہ اس ملک کو ابھی نئی نئی آزادی ملی ہے اور وہ ان طرح طرح کے معاشی۔ سیاسی۔ اور

معاشرتی اثرات کا شکار ہے جو ایک نئے ملک کے حصے میں آیا کرتے ہیں"۔

صدر جمہوریہ نے اپنے اس خطاب میں تعلیم کی سب سے بڑی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے تعلیم کی اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے شہری تیار کرے جو وقت کے تمام تقاضوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کر سکیں۔ جدید دور سائنس اور ٹکنالوجی کی ہوش ربا ترقی کا دور ہے۔ اس لیے تعلیم کی ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ علمی اور سائنسی تحقیق و جستجو کی حدود کو لگاتار وسیع تر کرتی چلی جائے، تاکہ مستقبل کے شہری سائنسی تہذیب کے تقاضوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر سکیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی دوڑ میں پیچھے رہ کر آج کوئی ملک آبرومندانہ زندگی کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ معاشی طور پر خودکفیل ہونے کے لیے سائنس سے خدمت لینا ناگزیر ہے

———————— لیکن تعلیم کی ذمہ داری اس جگہ ختم نہیں ہو جاتی۔ سائنس اور ٹکنالوجی لاکھ ترقی کر جائیں، انسانی زندگی کی رونق اور بہار ہمیشہ ان لطیف احساسات اور جذبات سے قائم رہے گی جو انسانی دل و دماغ کی لطیف ترین اور بلند ترین پیداوار ہیں۔ اس لیے تعلیم کی دوسری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جذبات و احساسات کی موزوں تربیت کرے۔ وہ ایسے مرد اور عورتیں پیدا کرے جو حساس دل رکھتے ہوں اور دوسرے انسانوں کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دیکھ کر بے قرار ہو جاتے ہوں۔

تعلیم کی یہ دوہری ذمہ داری ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں پر زیادہ خصوصیت کے ساتھ عائد ہوتی ہے۔ یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے مرکز ہی وہ تربیت گاہیں ہیں جو مستقبل کے رہنما تیار کرتی ہیں۔ صدر جمہوریہ نے بجا طور پر اس نکتہ پر زور دیا ہے کہ پاکستان جیسے نئے ملک کو ایسے آدمیوں کی شدید ضرورت ہے جو وقت کے تمام تقاضوں کو خوبی اور کامیابی کے ساتھ پورا کر سکیں۔ ہم قومی زندگی کے تعمیری دور میں سے گزر رہے ہیں۔ ایسے دور میں معماروں کی مہارت اور ان کی سیرت دونوں یکساں طور پر اہم ہو جاتی ہیں۔ امید ہے صدر جمہوریہ کا یہ بروقت انتباہ ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔

عِلم! انسانی زندگی کی ایک ابدی ضرورت

فضل احمد

پرانے بھلے زمانوں کی یاد

انسانی ذہن کا یہ ایک عجیب خاصہ ہے کہ اسے گذرا ہوا زمانہ بھلا معلوم ہوتا ہے، اور موجودہ دور طرح طرح کی مشکلات اور غیر یقینی حالات سے بھرپور نظر آتا ہے۔ بڑے بوڑھے مرے لے لے کر پرانے زمانوں کی زندگی کا حال بیان کرتے ہیں اور اس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جس میں دلکش رنگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس موجودہ زندگی میں انہیں برائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ حسرت بھری آوازمیں شکایت کیا کرتے ہیں کہ دنیا زمانہ جلد از جلد تباہی کے گڑھے میں کود پڑنے کے درپے ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ بڑے بوڑھے اپنی جوانی کے پُرآشوب دور اور اس کی تلخیوں کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ بیتے ہوئے واقعات کے نتائج خواہ بھلے تھے یا بُرے مدت ہوئی مرتب ہو چکے۔ اب وہ ایک بیتی ہوئی کہانی ہیں اور بس۔ ماضی میں جو فیصلے کیے گئے اور جو طریقہ ہائے کار اختیار کیے گئے انھیں بعد کے علم و تجربہ کی روشنی میں بدلا نہیں جا سکتا۔ باوجود انتہائی خواہش اور کوشش کے بھی بیتے ہوئے واقعات کے رُخ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا نتیجہ یہ ہے کہ نگاہِ بازگشت بالکل بے ضرر نظر آتی ہے۔ اس سے کسی قسم کا کھٹکا نہیں۔ ماضی کے ہنگامے اور اس کی صبر آزما گھڑیاں عرصہ ہوا اپنی تلخیاں کھو چکیں۔ اب ان کے متعلق غیر متوقع نتائج کا خدشہ باقی نہیں۔ موجودہ وقت سے نگاہ اٹھا کر ماضی کے کسی زمانے پر بھی نگاہ ڈالیں راستہ بالکل صاف نظر آتا ہے۔ یہ چیز ماضی کو ایک پُرسکون حُسن عطا کرتی ہے۔

اب اس کے مقابلے میں زمانہ حال پر نظر ڈالیے۔ کوئی شخص زندگی میں خواہ کتنے ہی ادنیٰ درجے کا مالک کیوں نہ ہو وہ اپنے آپ کو لگاتار زندگی کے چوراہے میں کھڑا پاتا ہے۔ اسے قدم قدم پر فیصلے کرنے پڑتے ہیں

ان فیصلوں کی صحت یا عدم صحت اس کے دلی سکون اور اس کی بدنی راحت پر گہرا اثر ڈالنے والی ہوتی ہے۔ مگر کوئی فیصلہ کرتے وقت وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا قدم متوقع نتائج پیدا کرکے رہے گا۔ پوری سوجھ بوجھ اور باخبری کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بعد بھی یہ کھٹکا بدستور لگا رہتا ہے کہ کہیں نتائج خلاف توقع نہ نکلیں۔ مستقبل کی طرف جانے والی کوئی راہ بھی چند انچوں سے آگے نظر نہیں آتی۔ آنے والے زمانے کی یہ بے یقینی زمانہ حال کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔ وہ اسے سکون سے خالی کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو جن مادی اور معاشرتی حالات سے گھرا پاتا ہے وہ ان فیصلوں کی پیداوار ہیں جو اس کے پیشروؤں نے کیے جو فیصلے وہ خود کرنے والا ہے ان کے نتائج آگے آنے والوں کے لیے ایک نیا ماحول پیدا کریں گے۔ یہ ذمہ داری قدرتی طور پر اتنی بوجھل محسوس ہوتی ہے کہ ایک عام انسان اس سے بلبلا اٹھتا ہے۔ اسے اپنا زمانہ غیر معمولی مشکلات اور مصائب کا زمانہ نظر آنے لگتا ہے، اور وہ بڑی حسرت کے ساتھ بیتے ہوئے زمانوں پر نگاہ ڈالتا ہے اور ان پرانے بھلے زمانوں کے لوگوں کی خوش بختی پر رشک کرتا ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب لوگ اسے خوش بخت اور اس کے زمانے کو پرانا بھلا زمانہ کہہ کر پکاریں گے اور خود اپنے زمانے سے پناہ مانگیں گے۔

علم کا سہارا

انسان کو ہمیشہ یہ تلاش رہی ہے کہ اسے کچھ ایسے قابل اعتماد ذرائع مل جائیں جن کی مدد سے وہ مستقبل کے متعلق درست فیصلے کر سکے۔ اس تلاش نے تاریخ کے مختلف دوروں میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ وحشی اور نیم وحشی انسان پرندوں اور حیوانوں کی حرکات و سکنات سے اچھا اور برا شگون لیتا تھا۔ وہ چاند، سورج، ستارں اور دوسرے مظاہر فطرت کو اپنی روزمرہ زندگی پر اثر انداز خیال کرتا تھا۔ وہ مستقبل کا علم حاصل کرنے کے لیے نجومیوں، کاہنوں اور غیبی آوازوں کی طرف رجوع کرتا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور انسانی ذہن تہذیب و تمدن کی جلا حاصل کرتا گیا، انسان نے حالات کا جائزہ لینے اور اپنے فیصلوں کے نتائج کا تخمینہ کرنے کے لیے مختلف علوم کا سہارا لینا شروع کیا۔ یہ سہارا بیشتر حالتوں میں نجومیوں، کاہنوں اور غیبی آوازوں کے فتووں کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد ثابت ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے علوم و فنون کے جمع اور مرتب کرنے پر زیادہ توجہ دینا

رع کیا اور رفتہ رفتہ مختلف علوم اور سائنسوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا ۔

گو اس بیسویں صدی میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لیے نجومیوں۔ نیوں۔ پیروں۔ فقیروں اور شعبدہ بازوں پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن جدید دنیا اپنے فیصلے کرتے وقت عموماً علوم سائنسوں کی رہنمائی قبول کرتی ہے ۔ نوع انسان نے طویل صدیوں میں زندگی کا جو تجربہ حاصل کیا ہے اس کا بل تر دید سبق یہی ہے کہ فیصلے کرتے وقت سب سے زیادہ قابل اعتماد سہارا علم کا سہارا ہے۔ جدید سائنسی م نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی موجودہ ضرورتوں کو تسلی بخش طور پر پورا کر سکے بلکہ آنیوالی رتوں کو بھی کافی صحت کے ساتھ خاصہ عرصہ پہلے دیکھ لے اور ان کے لیے پہلے سے تیار ہو جائے ۔

ریہ ہائے حیات کا اختلاف

اگر انسانی زندگی محض مادی ضرورتوں سے عبارت ہوتی تو سائنسی علوم اس کی تقریباً ساری ضرورتیں ی کرنے کے لیے کافی ہوتے اور انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان زیادہ گہرے اختلافات کبھی رونما رتے۔ لیکن علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیا میں مختلف نظریہ ہائے حیات بھی پرورش پاتے رہے نظریہ ہائے حیات کے اختلاف نے انسانوں کے مختلف گروہوں کو ہر زمانے میں مختلف دھڑوں میں لے رکھا ہے۔ تاریخ کے سب سے زیادہ پُرآشوب دور وہ ہیں جب متخاصم نظریوں میں زور کی ٹکر ہوئی ہے ے زمانوں میں انسانوں کی وفاداریوں کی کڑی آزمائش ہوتی ہے، انہیں دو مخالف نظریوں میں سے ایک کو نا پڑتا ہے ۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ نظریۂ حیات کے متعلق فیصلہ کرنا انسانی زندگی کا دشوار ترین فیصلہ ہے رے فیصلے بالعموم زندگی کے کسی خاص شعبے کو ایک مقررہ عرصہ کے لیے متاثر کرنے والے ہوتے ہیں ی نظریۂ حیات زندگی کے ہر گوشے کو بھرپور طور پر متاثر کرتا ہے اور اس کا اثر نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والا ہ ہوتا ہے، اس لیے جب انسانوں کو زندگی کی متضاد قدروں کے درمیان انتخاب کرنے پر مجبور کیا جائے قدرتی طور پر اپنے آپ کو بے حد کٹھن فیصلے سے دوچار پاتے ہیں۔ ایسے دور میں طرح طرح کے مشکل مسائل ا تے ہیں، جن کے تسلی بخش حل کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کس قسم کی زندگی کو پسندیدہ خیال کیا جائے

پسندیدہ زندگی کا جو تصور قبول کیا جائے گا علوم و فنون کی تدوین بھی اسی نہج پر ہو گی۔

جب کوئی معاشرتی معاشی نظام اپنی افادیت کے زمانے کو عبور کر لیتا ہے تو اس کے بطن سے اس قسم کے نظریاتی اختلاف پیدا ہوتے ہیں اور آخر کار ان کا دباؤ اس قدر بے پناہ قوت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ معاشرتی معاشی نظام بھک سے اڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا نظام جنم لیتا ہے جو ایک مختلف نظریہ حیات پر مبنی ہوتا ہے۔ برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ اس قسم کا ایک پُر آشوب دور ہے۔ سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگیوں نے اس ملک میں آ کر مسلمانوں سے اقتدار چھینا اور اس اقتدار کو اپنے محفوظ بنانے کے لیے صدیوں کے محکوم ہندوؤں کو اپنا ایک اتحاد دار بنا لیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی اس ملی بھگت نے مسلمانوں پر آبرومندانہ زندگی کے تمام دروازے بند کر دیے۔ حکمران قوم کے مقاصد کے تابع اس ملک میں جو معاشرتی اور معاشی نظام وضع ہوا وہ بیسویں صدی کے آغاز تک کامیابی سے چلتا رہا۔

پہلی عالمی جنگ نے اس نظام کو اس شدید دھکا لگایا۔ عالمی سیاست میں انگریز کی ساکھ اکھڑتی ہوئی ہندو کے منہ میں پانی بھر آیا، اور وہ انگریز کی جانشینی کے خواب دیکھنے لگا، اس پر انگریز بھی چونکا۔ لیکن حکومت کارخانے پر ہندو کی گرفت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اسے اکھاڑ پھینکنا انگریز کے بس کی بات نہ تھی۔ ملک کی معاشی ہمیشہ سے ہندو کے ہاتھ میں چلی آئی تھی۔ ان واقعات نے ہندو کو اس قدر غلبہ عطا کر رکھا تھا کہ اس پر غلبہ پانا طاقت کے بس میں نہ تھا۔ ادھر انگریزی تعلیم نے مسلمانوں کے درمیانے طبقے میں سے وکیلوں اور روشن خیال لوگوں کی ایک ایسی جماعت تیار کر رکھی تھی جو اس صورتِ حال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ آپ کو ہندو سے کسی طرح فروتر نہ سمجھتی تھی اور اس کا غلبہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اپنے لیے حکومت اور تجارت دونوں میں خود مختاری چاہتی تھی۔ پاکستان کا تصور اس طبقے کے لیے ایک حسین اور سنہری دنیا کا تصور تھا۔ چنانچہ اس طبقے نے پاکستان کے تصور کو اپنایا اسے عام کیا اور آخر اسے ایک ٹھوس حقیقت کی شکل دی۔

لیکن گیارہ سال گذر جانے پر اب یہ احساس پھر زور پکڑتا دکھائی دیتا ہے کہ ملکی حالات دن بدن بد تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ وہ نظری اختلاف ہے جو حکمران طبقہ اور عوام کے درمیان پیدا ہو رہا ہے۔ پاکستان کی قیادت اگرچہ ایک چھوٹے سے طبقے نے کی تھی، اس کی کامیابی عوام کی بے پناہ قربانیوں

مرہونِ منت تھی۔ عوام بجا طور پر یہ امید باندھے بیٹھے تھے کہ نئے ملک میں ان کو آبرومندزندگی گزارنے کے بھرپور مواقع حاصل ہوں گے۔ پچھلے گیارہ برس میں یہ توقعات بہت کم پوری ہوئی ہیں۔ دستور سازی میں صبر آزما تاخیر اور عام انتخابات کی عدم موجودگی نے عوامی مایوسی میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ تاہم یہ امر یقینی ہے کہ عوام کو ترقی اور خوش حالی کے یکساں مواقع بہم پہنچائے بغیر وہ نظریاتی اختلاف دور نہیں کیا جا سکتا جو اب ابھرتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔

تحریکِ پاکستان میں دراصل ہمارے لیے ہمیشہ ایک قیمتی سبق موجود رہے گا۔ یہ تحریک مروجہ قدروں کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ انگریز نے اپنے طویل زمانۂ حکومت میں محکوم قوم کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ ملکی سیاہ و سپید کا مالک انگریز کے بغیر دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہمیشہ یہ کہا تھا کہ جدید زمانے کے تقاضے اس قدر پیچیدہ اور ہندوستانی ذہن اس قدر خام ہے کہ وہ انہیں کبھی پورا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا محکوم ہندوستانیوں کے لیے اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں کہ وہ حکومتی کاروبار برطانیہ کو سونپے رکھیں اور خود مزے کی نیند سوئیں۔ بادی النظر میں یہ ایک فائدے کا سودا تھا۔

ملکی دفاع اور ملک کے دوسرے سیاسی مسائل کو ایک اجنبی قوم کے حوالے کر دینے سے کوئی قوم ایک اچھے خاصے دردِ سر سے بچ جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ پر نااہلی کی لعنت بھی مسلط کر لیتی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے رہنماؤں کی کمی نہ تھی جو فرنگی استدلال میں پورا یقین رکھتے تھے۔ وہ اپنے علم و تجربہ سے قوم کو یہ سبق دیتے تھے کہ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں میں سے کسی ایک کے دامن کے ساتھ بندھی رہے۔ لیکن قائداعظم نے اپنی قوم کی قسمت کو ایک مختلف قسم کے علم پر تعمیر کیا۔ انہوں نے اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں قوم کو یہ سبق دیا کہ وہ اپنے ہر قسم کے معاملات خود طے کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اسے آگے بڑھ کر اپنے لیے مکمل آزادی اور خود مختاری کا مقام حاصل کرنا چاہیے۔ آبرومند زندگی حاصل کرنے کی اکیلی یہی ایک راہ ہے۔ عوام نے اس مشورے کو قبول کیا، اور ان لوگوں کے علم و تجربہ کو قابلِ سند نہ سمجھا جو انگریزوں یا ہندوؤں کی غلامی کا سبق دیتے تھے۔ آزادی اور خود مختاری کا یہ سبق تحریکِ پاکستان کی اصل جان ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں آج ملکی اقتدار کی باگ ڈور ہے وہ عوام سے اسی صورت میں قریب رہ سکتے ہیں جب وہ ملکی اقتدار کو عوام کی امانت سمجھیں اور اسے انہیں کے مفاد کے لیے استعمال کریں۔

انگریزی دور میں ہر قسم کے غلط فیصلوں کی ذمہ داری غیر ملکی حکمرانوں پر ڈالی جاتی تھی۔ ہر ملکی مشکل کے تسلی بخش طور پر حل نہ ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ جو علم اور نقطۂ نگاہ غیر ملکی حکمرانوں کے فیصلوں کو جنم دیتا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے، اس لیے اس سے جاری ہونے والے تمام اقدام از خود غلط ہیں۔ یہ صورت حال اب ختم ہو چکی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور حکومت پاکستان ملکی عوام کی طرف سے اس حاکمیت کی امین ہے۔ تمام ملکی معاملات قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیے جائیں گے، اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں جائے گا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ دستور اساسی کی اس بنیادی دفعہ نے قرآن و سنت کو ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ یہ سرچشمۂ ہدایت خواص و عوام ہر دو کے لیے کھلا ہے۔ لہٰذا ہمارے ملکی معاملات اسی طور پر طے ہونے چاہئیں کہ ہر شخص قرآن و سنت کی روشنی میں ان پر موثر رائے زنی کر سکے۔

غرض پاکستان نے اپنی قومی زندگی کے فیصلے کرنے کے لیے علم کے دو سرچشموں سے رہنمائی حاصل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان میں سے پہلا سرچشمہ قرآن و سنت کا ہے اور دوسرا جدید سائنسی علوم کا۔ قرآن و سنت کو ہمارے نظریہ حیات کا درجہ حاصل ہے۔ جدید علوم کو اس نظریہ حیات کی خدمت انجام دینا ہے۔ یہ سارا کام عوام کے ہاتھوں انجام پانا ضروری قرار دیا گیا ہے کیونکہ حکومت انہیں کے نام پر حاکمیت کی امین بنائی گئی ہے۔ یہ طریق کار پاکستانی عوام کو وہ پاکیزہ اور پسندیدہ زندگی عطا کر سکتا ہے جس کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔

علوم محض ایک آلہ کار ہے

اس بحث سے ایک بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ انگریزی دور میں بھی ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں میں جدید علوم پڑھائے جاتے تھے۔ غیر ملکی حاکم اس بات کے لیے بخوشی تیار رہتے تھے کہ یہ تعلیمی سہولتیں دو چند یا سہ چند کر دی جائیں۔ مگر ان کے اور خود ہمارے نزدیک زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ ان علوم سے کس قسم کے معاشرتی نظام کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں۔ انگریزوں کا اصرار تھا کہ ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگ برطانوی سامراج کی تقویت کا باعث بنیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس سرزمین کے سپوت تاج برطانیہ کی عظمت کے لیے

ہر قسم کی قربانیاں پیش کریں۔ دوسری طرف ہندو کانگریس نے اس بات کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی کہ اس برصغیر کے نوجوان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان قدیم و جدید علوم سے لیس ہو کر ہندو راج کے سنگھاسن کو سہارا دیں اور مردہ ہندو سامراج میں از سر نو جان ڈالیں۔

ان دونوں نظریوں سے مختلف مسلم لیگ کا نقطۂ نگاہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی ثقافتی قدریں انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے الگ ہیں۔ ان کے لیے اچھی زندگی وہ ہے جس میں قدیم و جدید علوم سے سچی اسلامی قدروں کی خدمت لی جائے۔ انگریزوں یا ہندوؤں کی سیادت میں یہ کریہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا انگریز اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کو اولیت دیتا ہے اور ہندو اپنا نیا سامراج قائم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ سچی اسلامی قدریں اسی صورت میں پنپ سکتی ہیں جب مسلمان اپنا ایک الگ معاشرہ قائم کریں۔ یہ معاشرہ اس قابل ہو سکے گا کہ قدیم و جدید ہر قسم کے علوم سے سچی اسلامی قدروں کو تقویت اور فروغ دے۔

اس مقصد کو قومی نصب العین قرار دے کر پاکستان نے جہاں اقوام عالم میں اپنے لیے ایک آبرومند مقام حاصل کر لیا ہے وہاں اس نے اپنے آپ کو ایک آزمائش میں بھی ڈال لیا ہے۔ سربلندی اور ذمہ داری ہمیشہ لازم و ملزوم ہوا کرتی ہیں۔ اگر آج ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم ہیں تو یہ آزادی لہو و لعب کی آزادی نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کی تکمیل کی آزادی ہے۔ اب ہم پوری آزادی کے ساتھ ہر قسم کے علوم و فنون کو پوری تندہی اور انہماک سے حاصل کر سکتے ہیں اور ان علوم کی مدد سے دنیا میں اللہ اور اس کے رسول کا نام بلند کر سکتے ہیں جس حد تک ہم اس کوشش میں کامیاب ہوں گے اسی حد تک ہم اس آزمائش میں پورے اتریں گے جو ہم نے خود اپنے لیے پسند کی تھی۔ قائداعظم کی قیادت میں جو جنگ آزادی لڑی گئی تھی اس کا مقصد بالکل غیر مبہم تھا ہم مروجہ راہوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو میں اپنی پسند کا معاشرہ تعمیر کرنے کی پوری آزادی مل گئی۔ آزادی کی آمد کے بعد ہر سال جو گذرتا ہے وہ ہم سب سے سوال پوچھتا ہے کہ پرانی اور فرسودہ راہوں سے کس قدر نجات حاصل کی گئی اور نئی بنیادیں کس قدر بلند دی ہیں؛ پاکستانی نوجوانوں اور رہنماؤں نے اندرون ملک اور غیر ممالک میں علم و تجربیت کے جو خزانے جمع کیے ہیں ان سے سچی اسلامی قدروں کی کیا خدمت انجام دی گئی ہے؛

مدرسے کی ذمہ داری

اس اہم قومی ذمہ داری کی انجام دہی میں مدرسے پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ماضی قریب میں جب ہماری قسمت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں تھی مدرسے کے ذمے اس کے سوا اور کوئی فرض عائد نہ ہوتا تھا کہ وہ طلبہ کو انگریزی پڑھنا لکھنا سکھا دے اور حکمرا قوم کی ہر چیز کا ایک رعب ان کے دلوں پر طاری کر دے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی پسندیدہ یا بلند مقاصد قرار نہیں دیے جا سکتے۔ لیکن ہماری قسمت کی طرح ہماری تعلیمی حکمت عملی بھی ایک اجنبی قوم کے ہاتھ میں تھی اور اس قوم کی دلچسپی ہماری قومی سربلندی سے نہیں بلکہ اپنی قومی سربلندی سے تھی۔ اس کے نقطۂ نگاہ سے ایک محکوم قوم کی تعلیم کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ وفادار اور بے چون و چرا حکم بجا لانے والے غلا تیار کرے۔ چنانچہ ہندوستانی مدرسوں کا نصاب اس مقصد کو بہت اچھی طرح پورا کرتا تھا۔

تاہم جو قوم اپنے اجتماعی معاملات میں آزاد اور خود مختار ہو وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت ایک مختلف نقطۂ نگاہ سے کرتی ہے۔ اسے پہلی فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی آنے والی نسلیں اس کے مقابلے میں زیادہ خوش حا اور زیادہ بھرپور زندگی گذاریں۔ یہ غرض حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی اولاد کو نہ صرف حصول معاش کے مر طریقے سکھاتی ہے بلکہ اس کے دل میں ان اعتقادات کے لیے والہانہ محبت بھی پیدا کرتی ہے جن کے سا اسے خود دل بستگی ہو۔ اس معاملے میں وحشی سے وحشی قبائل بھی ایسے ہی حریص نظر آتے ہیں جتنی کو مہذب اور ترقی یافتہ قوم۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ وحشی اور نیم وحشی قومیں اپنے بچوں کو بالغ سرگرمیو میں شریک کر کے ان کی تربیت کرتی ہیں۔ لیکن مہذب قومیں یہ خدمت مدرسے کے سپرد کر دیتی ہیں۔ مدر بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا اور دوسری مفید سرگرمیوں کا بندوبست کرتا ہے۔ لیکن ان تمام تعلیمی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے بڑے ہو کر جب بالغ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو وہ نہ صرف عزت اور فرا کے ساتھ روٹی کما کھائیں بلکہ قوم کی ثقافتی میراث کی سرگرمی سے حفاظت بھی کریں۔

مدرسے کی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جیمز اول کے زمانے کے انگ میں ملکی اقتدار کلی طور پر بادشاہ کے ہاتھوں میں تھا۔ بادشاہ اپنے آپ کو براہ راست خدا کا نائب

اس کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ اسے قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ اور اس کے فیصلوں کے سامنے بلا چون وچرا گردن جھکانا رعایا کا ایک مقدس فرض ہے۔ کلیسائے انگلستان کے پادری بھی ان عقیدوں کے سختی سے قائل تھے۔ لہٰذا بادشاہ اور پادری مل کر ملکی اقتدار پر چھائے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا مفاد ایک تھا اور وہ مل کر اس مفاد کی حفاظت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرتے تھے۔ سٹوارٹ عہد کے انگلستان میں بادشاہ کے آسمانی حقوق میں اندھا دھند اعتقاد سب سے قیمتی قومی قدر بنا دی گئی تھی، اور اس قدر کو اگلی نسلوں کے دلوں میں پیوست کرنا تعلیم کی پہلی ذمہ داری قرار بنا دی گئی تھی۔

اس زمانے میں انگلستان میں چند پبلک سکولوں کے سوا اور کوئی مدرسے نہ تھے یہ مدرسے کلیسائے انگلستان کے لاٹ پادریوں نے قائم کر رکھے تھے۔ نتیجہ یہ تھا ان میں داخلہ لینے کے لیے شاہی تقرب ضروری تھا۔ جن والدین کو بادشاہ کی نظروں میں کوئی مقام حاصل نہ ہوتا ان کے بچوں کا پبلک مدرسوں میں تقریباً تقریباً داخل ہونا ناممکن ہو جاتا۔ ان پبلک مدرسوں میں آٹھ سالہ بچوں کو داخل کیا جاتا، داخلے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ بچہ پہلے سے پڑھنا جانتا ہو اور انگریزی زبان کے بنیادی قواعد سے واقف ہو۔ اس ابتدائی تعلیم کے لیے کوئی مدرسے موجود نہ تھے بلکہ اس کا اہتمام والدین کو خود کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اہتمام خاصہ گراں پڑتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان کا نظام تعلیم مستقبل کے لیے ایسے رہنما اور حکمران تیار کرتا تھا جو اپنے آپ کو عوام سے بلند اور خصوصی استحقاق کا حامل سمجھتے تھے۔ یہ صورت حال اٹھارہویں صدی کے آخر تک قائم رہی۔ اگرچہ ۱۵۶۲ء کے قانون شاگرداں اور ۱۷۰۱ء کے قانون غربا میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ عوام کے بچوں کو جو مختلف پیشے سیکھتے ہیں معمولی لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جائے لیکن یہ دونوں قوانین محض کتابِ قانون تک محدود رہے۔ مدرسے چلانا اور استادوں کی تربیت کرنا ۱۸۷۰ء تک کلیسائے انگلستان کے لاٹ پادریوں کی واحد اجارہ داری رہی۔ شہریوں کی کسی تنظیم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ مدرسہ کھولے یا استادوں کی تربیت کے لیے کوئی ادارہ جاری کرے۔ اس قسم کی اجازت دینا اس پرانے نظام حیات کی بنیادوں کو ہلانا تھا جس پر بادشاہ اور پادریوں کی مطلق العنانی کا مدار تھا۔

اس کے بالکل برعکس نوآبادیاتی امریکہ کا نظام تعلیم تھا۔ نئی دنیا میں اوّل اوّل ان انگریزوں سے

جا کر بستیاں قائم کی تھیں جو بادشاہ اور پادریوں کے استبداد سے تنگ آئے ہوئے تھے، وہ مذہبی معاملات میں بادشاہ یا لاٹ پادریوں کی مداخلت قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انجیل سے ہر شخص خود رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس مطلب کے لیے اسے کسی پادری کے توسط کی ضرورت نہیں۔ چناں چہ انگریز تارکان وطن نے جب شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل پر چند نو آبادیاں قائم کیں تو انہیں پہلی فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ اپنی اولاد کو اپنے عقاید کی تعلیم دیں۔ اس مطلب کے لیے ایسے مدرسے کھولے گئے جہاں انگریزی زبان میں انجیل پڑھائی جاتی تھی۔ بچوں کو انجیل تک براہ راست رسائی عطا کرنے کے لیے انہیں انگریزی پڑھنا اور لکھنا سکھایا جاتا۔ نوشت و خواند کے اولین اسباق انجیل کے الفاظ سے شروع ہوتے۔ بعد میں جو کتابیں پڑھائی جاتیں وہ بھی انجیل کی کہانیوں اور عبارتوں پر مشتمل ہوتیں۔ اس معمولی سی خواندگی کے ساتھ طالب علم کی تعلیم ختم ہو جاتی۔ بعد میں بار بار انجیل پڑھنے اور اجتماعی عبادتوں میں شریک ہونے سے خواندگی کی یہ استعداد مزید ترقی کر جاتی کیوں کہ امریکی آباد کاروں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ انجیل سے زندگی کے ہر معاملے میں پوری رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے اور اسی رہنمائی کی روشنی میں ایک پاکیزہ اور خوش حال معاشرہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

بالغوں کے اعتقادات کی عکاسی

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر مدرسہ وقت کے غالب فلسفۂ زندگی کی عکاسی کرنے پر مجبور رہے۔ حکمران طبقہ خواہ کچھ زبانی دعوی کرے وہ مدرسوں میں انھیں قدروں کی حکمرانی دیکھنا چاہتا ہے جن پر وہ دل سے یقین رکھتا ہو۔ انگریزی دور میں وائسرائے، صوبائی گورنر، برطانوی وزرا اور دوسرے انگریز رہنما ہندوستان اور اس کے باشندوں کے لیے بہترین جذبات کا اظہار کرتے نہ تھکتے تھے۔ مگر ان اعلانوں کے باوجود نصاب تعلیم میں سر مو فرق نہ آنے پاتا تھا۔ ان کے اخباری بیانات اور پبلک تقریریں محض نمائشی الفاظ ہوتے تھے۔ ہندوستانی مدرسوں میں مروجہ نصاب ان کے دل کی اصل آواز تھی۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ صاف کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض استادوں کو شکایت ہے کہ والدین ہمیں اپنے سے بلند تر اخلاق پر پرکھنا چاہتے ہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ مثلاً اگر ایک والد خود سگریٹ پیتا ہے یا سینما کا شیدائی ہے تو اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ استاد کی سگریٹ نوشی یا سینما بینی پر اعتراض کرے

ستدلال درست نہیں وجہ یہ کہ والدین اپنی اولاد کو بہترین زندگی عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اپنی اولاد کی
ت خود اچھی طرح انجام دے سکتے تو وہ اسے کبھی مدرسے میں نہ بھیجتے، لیکن وہ محسوس کرتے ہیں
ایسا نہیں کر سکتے۔ اکثر حالتوں میں ان کے پاس نہ اس کام کے لیے وقت ہوتا ہے، تاہم انہیں اپنی
اخلاقی کمی کا ہمیشہ احساس رہتا ہے اور وہ خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ ان کی اخلاقی کمزوریاں ان کی
یں منتقل نہ ہونے پائیں، وہ بچے کو اس یقین کے ساتھ مدرسے میں بھیجتے ہیں کہ مدرسے کا اخلاقی
مثالی طور پر پاکیزہ ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے یہ توقع پوری نہ ہو تو والدین کے دل کو سخت ٹھیس لگتی ہے
دوں کو ان ہی اخلاقی کمزوریوں کا شکار دیکھ کر جو خود ان میں موجود ہوں وہ جائز طور پر یہ کہنے کا حق
ہیں کہ اگر مدرسے کو بھی ایسے ہی کردار کی مثال ہمارے بچوں کے سامنے پیش کرنا تھی تو پھر اسے کیا بر
قیت حاصل رہی؛

غرض مدرسے کے ماحول اور اس کی غالب قدروں کو ان معتقدات کی عکاسی کرنا پڑتی ہے جن پر معاشرے
اد قائم ہو۔ مدرسے کو وجود بخشنے والا معاشرہ ہی تھا اور اس نے مدرسے کو اپنے آلہ کار کے طور پر
یا۔ ان حالات میں یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ معاشرہ مدرسے سے یہ توقع رکھے کہ وہ اس کے بنیادی معتقدات
نہ داری کرے، اس سے ظاہر ہے کہ تعلیم کے غالب مقاصد کی تعین استاد کی طرف سے نہیں خود معاشرہ کی
سے کی جاتی ہے۔ استاد کا کام محض ان مقرر کردہ مقاصد کی تحصیل ہے۔

اس استدلال سے معاً ایک اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر مدرسے کو مروجہ معاشرتی قدروں کی پاسبانی
ری ہی کرنا ہے تو نظام کہن کی اصلاح و ترمیم کی کیا صورت ہو؟ غالب معاشرتی قدریں لامحالہ حکمران
ی قدریں ہوں گی۔ یہ طبقہ قدرتی طور پر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے ہی میں ملک و قوم کی بھلائی دیکھے گا۔ وہ
تی سے یہ خیال کرے گا کہ آنے والی نسلوں کا مقدس فرض یہ ہے کہ حکمران طبقے کے اقتدار کو سہارا دے۔ اگر
درسہ عمداً اپنے آپ کو حکمران طبقے کی اطاعت کے حوالے کر دے تو وہ یقیناً تعلیم کے ایک بلند مقصد سے
ی کرے گا کیوں کہ تعلیم کی جہاں یہ ذمہ داری ہے کہ نئی نسل کو اپنے ماحول کے ساتھ خوش اسلوبی سے
کے قابل بنائے وہاں یہ فرض بھی اس پر ہی عاید ہوتا ہے کہ نئی پود میں تنقیدی نگاہ پیدا کرے تاکہ

وہ مروجہ نظام کی خوبیوں اور کوتاہیوں کا اندازہ کر سکے اور آگے چل کر کوتاہیوں کے تدارک کی عملی راہیں سوچ سکے۔ واضح تر الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ گو مدرسے کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مروجہ نظام کے خلاف بغاوت یا نفرت پھیلائے۔ اس کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ نئی پود کو اپنے طور پر سوچنے کا خوگر بنائے۔ اس کے دل میں تلاش حق کی تڑپ پیدا کرے۔ اور سچائی کی خاطر سختیاں جھیلنے کا جذبہ پیدا کرے۔ یہ طریق کار ان لوگوں کو بھی مطمئن کر دے گا جو یہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے آلہ کار کے طور پر مدرسے کو نظام کہن کے خلاف کچھ کہنے کا حق نہیں پہنچتا اور اس سے تعلیم کی وہ اہم تخلیقی ذمہ داری بھی پوری ہو جائے گی۔

کونسا علم طاقت ہے

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ "علم طاقت ہے"۔ لیکن پیچھے جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ علم اسی صورت میں طاقت ہے جب اس سے موزوں خدمت لی جا سکے۔ جو علم زندگی کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا وہ ہرگز طاقت نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ وبال ثابت ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس لطیف نکتے کو ایک بلیغ فقرے میں یوں سمجھایا ہے:-

افرأیت من اتخذ الٰہہ ھواہ واضلہ اللہ علیٰ علم وختم علیٰ قلبہ وسمعہ علیٰ بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعد اللہ افلا تذکرون

ترجمہ:- کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی پست خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ (نتیجہ یہ ہے کہ) اللہ نے باوجود اس کے علم کے اسے گمراہ کر رکھا ہے، اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم (اتنی سی بات بھی) نہیں سمجھتے؟

جو علم بلند مقاصد کی بجائے پست خواہشات کی خدمت کے لیے وقف ہو کر رہ جائے وہ طاقت نہیں بلکہ ایک لعنت ثابت ہوتا ہے۔ آج مشرق کے پسماندہ ممالک پر اس قسم کے علم کی لعنت مسلط ہے۔ ان ملکوں کے بیشتر رہنما مغرب کی مشہور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل گریجوایٹ ہیں۔ قومی زندگی کے تمام رشتے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان ملکوں کی بگڑی بننے میں نہیں آتی، وجہ یہ کہ یہ نام نہاد رہنما عموماً قیادت کے منصب کو حصول منفعت کا موقع خیال کرنے لگتے ہیں اور اس طرح اپنے علم کو اپنی پست

کی تشفی کا ذریعہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ ایک اٹل خدائی قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ ان کے دل سوچنے کی طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے کان عوام کی آہ و فریاد کو سننے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی آنکھیں عبرت کے ان اسباق کو دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہیں جن سے تاریخ کے اوراق اٹے پڑے ہیں ان کی بدبختی کی انتہا یہ ہے کہ چوں کہ وہ اللہ سے منہ موڑ بیٹھتے ہیں اس لیے اب دوسری اور کوئی ایسی روشنی نہیں رہ جاتی جو انہیں ہدایت کا راستہ دکھائے۔ یہ سارا استدلال اس قدر صاف اور عام فہم ہے کہ اسے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہیے۔ لیکن محرومان ازلی ان پیش پا افتادہ حقائق کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

علم کے متعلق خالص اسلامی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اسے منشائے الٰہی کے تابع رہنا چاہیے تقویٰ کو تمام دانائیوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرے میں رہ نمائی کا مقام ان لوگوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہوں علم کی ساری فضیلت تسلیم کر لینے اور اس کے حصول پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ علم محض ایک آلۂ کار ہے۔ ایک ایسا آلہ جس سے نیکی۔ سچائی اور عدل و انصاف کی خدمت لی جانی چاہیے۔ لیکن اگر اس کی بجائے علم کو ظلم و طغیان اور نفس پرستی کا آلہ بنا لیا جائے تو وہی علم جو رحمت ثابت ہو سکتا تھا عذابِ الٰہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کی صرف ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ علم سے صحیح خدمت لی جائے یعنی اسے رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے اس کی مدد سے عوامی بہبود میں اضافہ کیا جائے، اس سے مدد لے کر قومی خوش حالی کو بڑھایا جائے۔ اس کی مدد سے دنیا سے ظلم و طغیان کا نام مٹایا جائے اور حق و انصاف کی حکمرانی کو عام کیا جائے۔

اصل مقصود حیات طیبہ ہے

غرض علم بذات خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود وہ حیات طیبہ ہے جس کا وعدہ مومنوں سے کیا گیا ہے۔ علم اس منزل مقصود تک پہنچنے کا زینہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ تحصیل علم کی ہر منزل پر یہ مقصود آنکھوں کے سامنے رکھا گیا ہو۔ اگر ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے نصابوں میں اس نہائی منزل کو درس و تدریس کا محور قرار نہیں دیا گیا تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے لوگ اپنے علم کی قوت کو اپنی پست خواہشات کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے کیوں کہ انہیں کسی بلند تر نصب العین کے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہوگا۔ بلند مقاصد کے ساتھ

جذباتی لگاؤ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے لیے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی تربیت جو آغاز زندگی سے شروع ہو کر تعلیم کے آخری مدارج تک پھیلتی چلی گئی ہو۔ جو نظام تعلیم ایسی تربیت کا بندوبست نہیں کرتا اور محض علوم و فنون کی تدریس کو ہی اپنا معراج خیال کرنے لگتا ہے، وہ نہ صرف بدیہ ملک و قوم کے لیے فائدہ رساں ہونے کی بجائے ضرررساں ثابت ہوتا ہے۔

اس معاملے میں مغرب کی مثال اکثر سادہ لوح لوگوں کے لیے گمراہی کا سبب ہوسکتی ہے۔ مغربی تہذیب اپنی لادینیت کا ڈھنڈورہ پیٹتے نہیں تھکتی۔ وہ اپنی تعلیم کو سیکولر تعلیم کا نام دیتی ہے۔ مگر حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ مغرب کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیاں کلیسا کی قائم کردہ ہیں۔ مدتوں تک ان کا بیشتر نصاب مسیحی تعلیمات پر مشتمل رہا۔ بعد میں گو ان میں جدید سائنسی علوم بھی پڑھائے جانے لگے مگر ان کی کلیسائی بنیادوں کا اثر ان کے تمام نصابوں اور ان کے سارے ماحول میں برابر جھلکتا رہا۔ یہ کیفیت آج تک باقی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نکتہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جدید علوم اور سائنسوں کو مرتب کرنے والے زیادہ تر مسیحی عالم ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو لاکھ لادین کہیں ان کا سارا ذہنی پس منظر مسیحی ثقافت سے لبریز ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ان عالموں کے سائنسی اور علمی مباحث بھی اس پس منظر سے رنگ اختیار کیے بغیر نہیں رہتے یہ چیز مغرب کی لادینی سے لادینی تعلیمی ادارے کو بھی ایک مخصوص ثقافتی رنگ عطا کرتی ہے۔ اس معاملے میں ہماری حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں اور دوسری چھوٹی بڑی درس گاہیں ہر قسم کے جدید علوم مغرب سے مستعار لینے پر مجبور رہیں۔ یہ علوم لامحالہ ایک اجنبی ثقافت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے آتے ہیں۔ یہاں تک تو چنداں مضائقہ نہیں کیوں کہ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ مگر اصل مصیبت یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو لوگ درس و تدریس کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ اپنے تدریسی مواد کو اجنبی ثقافتی رنگ سے آزاد کر کے اسے اپنی ثقافت کا مخصوص رنگ دے سکیں۔ اس افسوس ناک کوتاہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی علم جو مغرب میں جادو اثر ثابت ہوتا نظر آتا ہے مشرق میں اپنی جادو اثری کو بیٹھتا ہے۔

بعض لوگ علم کو بذات خود مطلوب کرتے ہیں۔ اوپر کی بحث میں اس نظریے کی بنیادی غلطی پر

کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ انسان کی اصل ضرورت علم نہیں بلکہ اچھی زندگی ہے، وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر پاکیزہ، پرسکون اور خوش حال زندگی گذارنا چاہتا ہے۔ اچھی زندگی کی تلاش نے اسے تاریخ کے ہر دور میں بے قرار رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہا ہے کہ خود اچھی زندگی گذارے اور اپنے بعد اپنے حالات اور وسائل چھوڑ جائے کہ اس کی اولاد اس سے بھی زیادہ اچھی زندگی گذارے۔ اچھی زندگی کی تلاش نے ہی انسان کو علوم و فنون کا راستہ دکھایا۔ انسان نے بہت جلد یہ راز پایا کہ علوم و فنون کی مدد سے وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آسانی کے ساتھ حسن و خوبی عطا کر سکتا ہے۔

لیکن اچھی زندگی کا مفہوم ہر زمانے اور ہر ملک میں ایک سا نہیں رہا، جو زندگی انگلستان یا روس میں اچھی کہلائے گی۔ اغلب یہ ہے کہ پاکستان میں اسے زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ لہٰذا علوم و فنون کی راہ اچھی زندگی کی منزل پر اسی صورت میں لے جا سکتی ہے جب علوم و فنون کو اچھی زندگی کے مطلوبہ مفہوم کے مطابق ڈھال لیا گیا ہو۔ اگر اس مفہوم اور علوم و فنون کے درمیان کوئی مناسبت پیدا نہیں کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ مایوسی کی شکل میں نکلے گا۔ علوم و فنون اچھی زندگی کی طرف لے جانے کی بجائے اس سے دور تر لے جائیں گے۔ ثقافتی مزاج اور تعلیم کا باہمی بُعد بڑھتا جائے گا اور طرح طرح کے مشکل معاشرتی مسائل سر اٹھائیں گے۔

آج پاکستان اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ ہم اب تک اپنے ثقافتی مزاج اور جدید تعلیم کے درمیان کوئی گہری مناسبت پیدا نہیں کر سکے۔ ہمارا سب سے مشکل تعلیمی مسئلہ یہی ہے۔ جدید علوم و فنون زندہ رہنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن اپنی ثقافت کی بقا بھی ہمیں کم از کم اس قدر عزیز ہونی چاہیے۔ ہم نے اسی ثقافت کو زندہ رکھنے کے لیے ہی الگ وطن حاصل کیا تھا۔ ان دونوں قومی تقاضوں کو ایک ساتھ پورا کرنا ہماری تعلیم کی پہلی ذمہ داری ہے۔ قومی اور ثقافتی روح سے آنکھیں بند کیے محض علوم و فنون کی اشاعت کیے جانا مکمل تعلیم نہیں۔ ہماری تعلیم کو اپنا یہ ادھورا پن جلد از جلد ختم کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ قومی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔

صنعت و حرفت اور ذہنی صحت

ڈاکٹر عبد الرؤف

کس قدر خوشی کی بات ہے کہ ہمارا عزیز وطن صنعت و حرفت کے میدان میں خوب ترقی کر رہا ہے، جا بجا کارخانے کھل رہے ہیں۔ ان کارخانوں میں طرح طرح کی مشینیں نصب ہو رہی ہیں اور ہم زندگی کی بیسیوں ضروریات کے لیے روز بروز خود کفیل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مشین اور انسان

کسی کارخانے میں مشین نہیں بلکہ انسان کو مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے، مشینوں کی اپنی انفرادی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر لوہے کی ایک بے جان سی چیز کو تخلیق کرتا ہے۔ اور پھر اس سے اتنے حیرت انگیز کام لیتا ہے جس طرح صنعت و حرفت میں انسان کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح انسان کی اپنی کائنات میں اس کے ذہن کو اہم ترین مقام ملا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو صنعت و حرفت کی ترقی کارانہ دراصل کاریگروں کی ذہنی صحت پر ہی منحصر ہے۔ اگر کاریگر خوش رہتے ہوں، انہیں اپنے کام میں حقیقی دلچسپی محسوس ہوتی ہو، ان کی زندگی طرح طرح کی الجھنوں سے پاک ہو، ارباب صنعت و حرفت ان سے حسن سلوک سے پیش آتے ہوں، انہیں کام کی معقول اجرت ملتی ہو وغیرہ وغیرہ تو اس سے ان کی زندگی بہت خوشگوار طریقے سے بسر ہوتی ہے جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ کارخانہ میں اپنا کام خوب محنت سے کرتے ہیں۔ حادثے لڑائی جھگڑے اور ہڑتالیں بہت کم کرتے ہیں۔ کارخانہ دار کو ایسے کاریگروں کی بدولت بہت نفع ہوتا ہے۔ ایسے صحت مند کاریگروں کو اپنے ہاں ملازم رکھ کر کارخانہ دار کو مالی نفع کے علاوہ ذہنی سکون اور مسرت بھی نصیب ہوتی ہے۔

مضطرب کاریگر

اس کے برعکس اگر کاریگر طرح طرح کے اضطراب اور تشویش انگیز حالات میں الجھے رہتے ہوں، کارخانہ دار ان کے جبر و تشدد کے بل بوتے پر کام لینے کا عادی ہو اور اجرت کے معاملوں میں بخیلی اور ٹال مٹول سے

کام لیتا ہو تو کاری گر کام کے دوران میں سر ٹھتے کڑھتے رہتے ہیں: ظاہر ہے کہ ایک غیر مطمئن اور پریشان کاریگر کام میں حقیقی دل چسپی نہیں لے سکتا۔ بلکہ اس سے حادثوں کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے۔ صنعتی تنازعوں اور ہڑتالوں وغیرہ میں حصہ لینے والے بھی عموماً اسی قسم کے پریشان کاری گر ہوتے ہیں۔ ایسی باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صنعتی کام کی رفتار اور نوعیت بہت نیچے گر جاتی ہے اور کارخانہ دار کو یا تو مالی نقصان ہوتا ہے یا پھر بہت کم منافع۔ کاریگروں سے متعلق انسانیت سوز رویہ اختیار کرنے سے کاری گروں کی زندگی میں افسردگی اور یاس کے عناصر مزید تقویت پکڑتے جاتے ہیں۔ مگر یہ بات یہیں نہیں رکتی۔ اپنے ارد گرد مضطرب اور پژمردہ مزدوروں کے انبوہ دیکھ کر اور پیہم مالی پریشانیوں کی وجہ سے کارخانہ دار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسے بھی ایک گھن سا لگ جاتا ہے۔ وہ پریشانی اور کم خوابی کا شکار ہو جاتا ہے اور صحت و سکونِ قلب کی تلاش میں طبیبوں اور ماہرینِ نفسیات کے پیچھے مارا مارا پھرتا نظر آتا ہے۔

اس صورتِ حال کا فقط ایک علاج ہے۔ کارخانہ دار اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ مشینوں پر جتتے ہوئے کاری گر مشین نہیں بلکہ انسان ہیں اور انسانوں کا محور ان کا ذہن ہے۔ اگر ان کے ذہن کی بستی میں سکون، طمانیت اور مسرت کا دور دورہ ہے تو کام نہ صرف صحیح ہو گا، بلکہ زیادہ سے زیادہ منافع بھی دے گا۔ اور اگر ان کے ذہن پر پریشانیوں کی یلغار ہو رہی ہو تو کام بھی ناقص ہو گا اور نفع بھی کم۔ کاری گروں کے عام مفاد کے علاوہ کارخانہ دار کے ذاتی مفاد کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنے تمام مزدوروں کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنے کے لیے پیہم جدوجہد کرتا رہے۔

کاری گروں کی ذہنی صحت بیشتر طور پر کارخانہ دار کے نظریہ کار پر منحصر ہے۔ اگر کارخانہ دار یہ سمجھے کہ باقی مشینوں کی طرح کاریگر بھی بس ایک مشین ہی ہے اور یہ کہ تھوڑی بہت اجرت دے کر اس سے زیادہ سے زیادہ کام لینا اس کا فطری حق ہے تو کاری گر کی حیثیت ایک زرخرید غلام کی سی ہو جاتی ہے جس کی زندگی خوش حالی اور مسرت و اطمینان کو ترستی ہے۔ بدقسمتی سے کاشتکاری کے میدان میں اس مریضانہ تصور کی جھلک اب تک موجود ہے۔ بعض زمیندار اب بھی اپنے مزارعین کو گائے بھینس ہی تصور کرتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ صنعت و حرفت کی دنیا میں کام کا یہ سقیم تصور اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

زندگی کے بنیادی تقاضے

صنعتی دنیا میں کام کا ایک اور تصور یہ بھی ہے کہ مزدور کو کام کی مناسب اجرت تو باقاعدگی سے ادا کر دی جائے مگر اس کے دُکھ درد، اس کی امیدوں، آرزوؤں اور اس کی ذہنی زندگی کے باقی پہلوؤں سے قطعی بے تعلقی اختیار کر لی جائے۔ اس قسم کے کارخانہ جات اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایک کاریگر کی بنیادی ضرورتیں فقط اقتصادی ہوتی ہیں، جن کی مناسب تسکین کے بعد کسی مزید آسائش اور سہولت کی قطعی ضرورت نہیں رہتی۔ حالاں کہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ زندگی کا بنیادی تقاضا جذباتی خوش حالی ہے۔ جس کاریگر کو یہ نعمت میسّر آجائے وہ خود خوش رہتا ہے اپنے ساتھیوں کو خوش رکھتا ہے اور انجام کار کارخانہ کی مالی ترقی کا باعث بھی بنتا ہے۔

صنعتی کام کا سب سے صحت مندانہ نظریہ یہ ہے کہ کارخانہ میں اس قسم کا ماحول قائم کیا جائے جس میں کام کر کے کاریگر ایک گونا گوں اطمینان اور لذّت محسوس کرے، اسے نہ صرف معقول اجرت ملے بلکہ اس کے جذباتی زندگی کے مختلف تقاضوں کی تسکین کے مناسب سامان بھی مہیّا ہوں تاکہ اپنے صنعتی فرائض بخوبی ادا کرنے کے علاوہ، وہ کارخانہ کے اندر اور باہر کی فضا میں طبعی مسرّت محسوس کرے۔

چند مفید اصول

وہ اکابرِ صنعت و حرفت جو صنعتی کام کے اس بہتر نظریہ پر یقین رکھتے ہیں اس پر عمل کرنے کے لیے منظم اور مخلص کوششیں کرتے ہیں۔ کسی صنعتی ادارے میں ذہنی صحت برقرار رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل عناصر کو مدِّنظر رکھنا ہر لحاظ سے نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔

(۱) ہر کاریگر کو اس کی لیاقت اور ذہنی رجحان کے مطابق کارخانہ میں مناسب جگہ پر کام کے لیے مقرر کرنا چاہیے۔ اکثر کارخانوں میں چھٹی کی درخواستوں کا عام آنا صنعتی حادثے، ہڑتالیں اور تنازعے وغیرہ اس لیے عام ہوتے رہتے ہیں کہ متعدد کاریگروں کو ان کی اپنی پسند اور لیاقت کے منافی جگہ پر کام کے لیے بغیر سوچے سمجھے لگا دیا جاتا ہے۔

(۲) کاریگروں اور کارخانہ دار کو ایک دوسرے کے نکتۂ نگاہ سمجھنے کے لیے محنت اور تعاون سے

کام لینا چاہیے۔ کاری گر معقول اُجرت اور کام کا بہترین ماحول چاہتا ہے۔ کارخانہ دار زیادہ محنت زیادہ کام اور زیادہ سے زیادہ مالی منافع چاہتا ہے۔ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے زاویہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ میں کوئی خاص تضاد نہیں ہے۔ کارخانہ دار کو اس بات کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کہ کاری گر کو معقول اجرت ملے اور اس کے کام کا ماحول آرام دہ بھی ہو اور الجھنوں سے مبرّا بھی۔ اگر اس کے کاری گر دل جمعی سے اور خوشی خوشی کام کرتے ہوں تو مالی منفعت کا مقصد کبھی بھی فوت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کاری گروں کو چاہیے کہ کارخانہ کی مالی ترقی کے لیے محنت اور خلوص سے کام کریں۔ جوں جوں کارخانہ مالی طور پر ترقی کرتا جائیگا توں توں ان کی اُجرت سہولتوں اور مراعات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

۳) کاری گروں کے مختلف طبقوں، ماتحتوں اور افسروں وغیرہ سب کے مابین خوش گوار رفاقت اور گروہ بازی وغیرہ کی موجودگی میں ذہنی خوشی اور مالی فائدہ دونوں کے امکان گھٹ جاتے ہیں۔

۴) کاری گروں کی نگرانی کے کام کو فراست سے سرانجام دینا چاہیے۔ نگرانی اس قدر کڑی نہیں ہونی چاہیے کہ کاری گر ذراسی ڈھیل ملتے ہی بگڑ جائے اور اس قدر ڈھیل بھی نہ ہو کہ کاری گر یہ سمجھنے لگے کہ وہ شتر بے مہار کی طرح جو چاہے کر سکتا ہے۔ افسروں کو کام کی نگرانی کے دوران میں کاری گروں کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔ اور ان کے کام کی نوعیت کو سراہنا بھی چاہیے۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ ان کی نگرانی ان کے نقائص کا کھوج لگانے کے لیے ہی نہیں بلکہ ان کے محاسن کو نمایاں کرنے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔

۵) سارے کارخانہ میں ایک ایسی خوش گوار جذباتی فضا قائم کرنے کے لیے منظم کوششیں ہونی چاہئیں جس سے کارخانہ ایک خاندان کی طرح دکھائی دے جس میں ہر چھوٹا بڑا اپنی بساط اور فراست کے مطابق اپنے مخصوص فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اگر تمام کاری گر، ان کے تمام نگران، کارخانہ کے تمام کلرک اور تمام افسر یہ محسوس کریں کہ وہ ایک منظم اور مربوط گروہ ہیں تو ہر فرد کی ذہنی صحت میں اضافہ ہوتا ہے اور کارخانہ مالی اعتبار سے بھی فائدے میں رہتا ہے۔

ری گروں کی جذباتی الجھنیں: ۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ غیر معمولی اضطراب، پریشانی خوف اور ہم

کی حالت میں ہر انسان کے کام کی صلاحیت گھٹ جاتی ہے۔ نیز موزوں جذباتی عناصر سے صنعتی کام کی رفتار اور نوعیت پر جو بے پناہ اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صنعت و حرفت کا مشینی ماحول بعض کاریگروں پر اس قدر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ طرح طرح کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جانے والے کاریگروں کی اکثریت عموماً ایسی ہوتی ہے جو پہلے سے ہی کسی ذاتی یا خاندانی جذباتی الجھن میں گرفتار ہوں۔ صنعتی ماحول کی ناسازی ان کی الجھن کے لیے آگ پر تیل کا کام دیتی ہے۔ چناں چہ اسی قسم کے اکثر کاریگر ذہنی توازن میں تزلزل کی وجہ سے چھٹیاں لینے، صنعتی فضا میں کشیدگیاں پیدا کرنے، حادثوں، تنازعوں اور ہڑتالوں کو فروغ دینے کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کاریگر کی ذہنی پریشانی کا بر وقت مداوا کر دیا جائے۔ تاکہ یہ بڑھتے بڑھتے دیوانگی کی صورت اختیار نہ کر جائے، اور اگر معاملہ دیوانگی کی حد تک پہنچ بھی جائے تو مریض کاریگر کے علاج کا مناسب اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

حادثہ مائل کاریگر

مضطرب جذباتی زندگی والے کاریگروں کی الجھنوں سے غفلت برتنا کسی اعتبار سے بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایک ماہر نفسیات نے چند کارخانوں میں صنعتی حادثوں کا جائزہ لیا، اسے معلوم ہوا کہ جو کاریگر "حادثہ مائل" ہوتے ہیں ان کی شخصیت میں مندرجہ ذیل مریضانہ عناصر کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتے ہیں

(۱) خودکشی کی مستقل رغبت

(۲) دوسروں کو نقصان پہنچانے کا قوی جذبہ۔

(۳) غیر معمولی اضطراب کی بہتات

(۴) ذہن پر چند مضطرب خیالات کا بری طرح تسلط۔ مثلاً گھریلو مشکلات، دوسروں کے جور و ستم اور ناانصافیوں کا خیال۔ ہڑتال اور صنعتی کشیدگی پیدا کرنے کا مجنونانہ جذبہ۔

ذہنی معائنہ اور علاج

کارخانوں میں اگر مزدوروں کے باقاعدہ ذہنی معائنوں کا اہتمام کر دیا جائے تو کئی کاریگروں کی ذہنی پریشانی کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان کی تکالیف کے اسباب دریافت کر کے ابتدائی

مدارج ہی میں ان کا مناسب علاج کیا جا سکتا ہے۔ ذہنی صحت کی دیکھ بھال کے لیے کارخانہ کے شاف میں ماہر نفسیات کا موجود ہونا لازمی ہے۔ کاری گروں کی ذہنی شکایات اور بیماریوں کا علاج کر کے اور کارخانہ دار کو کاری گروں کی ذہنی صحت سے متعلق مفید مشورے دے کر ماہر نفسیات ساری صنعت کے لیے عظیم خوش حالی کا باعث بن جاتا ہے۔

کسی صنعتی ادارے میں ماہر نفسیات جو خدمات سرانجام دیتا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) ماہر نفسیات کاری گروں کی جذباتی زندگی کا عمیق جائزہ لیتا ہے، وہ ان کی تمام ایسی چھوٹی بڑی الجھنوں کا تجزیہ اور علاج کرتا ہے جن کا کسی بیماری یا صنعتی حادثہ کی صورت نمودار ہونے کا خدشہ نظر آتا ہو۔

(۲) وہ کاری گر کے دکھ درد کی داستان عموماً اور ذہنی مریض کاری گر کی باتیں خصوصاً غور اور ہمدردی سے سنتا ہے اور انہیں اپنی الجھنوں سے خود بنرد آزما ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک جذباتی مریض کسی ماہر نفسیات کو محض اپنی رام کہانی سنا کر ہی اس قدر سکون محسوس کرتا ہے کہ مزید علاج کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۳) اپنے مخصوص علم اور تجربہ کی بنا پر ماہر نفسیات صنعتی الجھنوں کے بنیادی اسباب کا کھوج لگانے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ کاری گروں سے تبادلہ افکار کرتا ہے۔ صنعت کے طریق کار اور کام کے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے، اور کارخانہ دار کے عمومی رویّہ اور کاری گروں پر اس کے اثر کا جائزہ لیتا ہے۔ اس طرح ماہر نفسیات حتمی طور پر یہ بات بتا سکتا ہے کہ کسی صنعتی ادارے میں کون کون سے مخصوص عناصر کام کی رفتار اور نوعیت میں کمی اور حادثوں اور ہڑتالوں میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں، وہ ان سب کے مناسب علاج کے طریقے بھی تجویز کرتا ہے۔

(۴) انسانی ذہن میں بصیرت کی وجہ سے وہ ان کاری گروں کو فوراً پہچان لیتا ہے جو طبعًا حادثہ مائل ہوتے ہیں ایسے افراد کی بر وقت نفسیاتی امداد کی جائے تو وہ اکثر ٹھیک ہو جاتے ہیں جس سے صنعتی ادارہ ان کے ہاتھوں رونما ہونے والے متعدد قسم کے جانی اور مالی نقصانوں سے بچ جاتا ہے۔

صنعتی حادثے :- صنعتی حادثات کی تعداد کو کیوں کر کم کیا جائے؟ —— یہ مسئلہ صنعتی ماہر نفسیات کے لیے

ت اہمیت رکھتا ہے۔ نفسیاتی تجزیوں سے پتہ چلا ہے کہ جذباتی عدم مطابقت۔ اضطراب۔ تکان جسمانی بیماری
در لبا اوقات ناتجربہ کاری حوادث کی طرف میلان کا باعث بن جاتی ہے۔ مزدوروں کو مشینوں پر احتیاط سے کام
رنے تکان کے وقت کچھ عرصہ کے لیے کام بند کردینے خوش وخرم رہنے۔ ذہنی اور جسمانی صحت کا پاس رکھنے کی
تلقین کرتے رہنے اور اپنے مخصوص کام میں مہارت پیدا کرنے کی رغبت دلاتے رہنے سے صنعتی حادثوں میں کمی
واقع ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ صنعتی فضا میں دل چسپیوں کے اہتمام سے بھی مالی نقصان اور حادثوں میں کمی ہو جاتی
ہے۔ ریڈیو کے فرحت بخش نغمے۔ رستورانوں کی چہل پہل کھیل کے کھلے کھلے میدان۔ موسمی شدتوں سے بچاؤ کے خاطرخواہ
انتظامات۔ مزدوروں کے رہائشی مکانوں اور ان کے اہل وعیال کی سہولتوں کا مناسب بندوبست ان میں یہ احساس
پیدا کردیتا ہے کہ کارخانے میں ان کی آسائش کے سامان بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس سے ان کی زندگی میں مطابقت
توازن اور مسرت کا اضافہ ہوتا ہے، وہ اپنا کام دل جمعی اور دل چسپی سے کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں جس کا ایک
لازمی نتیجہ مشینی حادثوں میں کمی کی صورت میں نکلتا ہے۔

ماہر نفسیات ایسے افراد کو بھی بہت جلد پہچان لیتا ہے جو اپنی زندگی میں عدم مطابقت کا شکار ہو چکے
ہوں۔ عدم مطابقت کا مریض اپنے گردوپیش کے لوگوں سے ہر لحظہ الجھتا رہتا ہے۔ ماہر نفسیات ایسے کاریگروں کا
باقاعدہ علاج کرتا ہے اور انہیں جسمانی اور ذہنی صحت کے مبادیات سے روشناس کراتا ہے۔ اگر ضرورت
پڑے تو انہیں کارخانہ میں کسی اور کام پر تبدیل کردینے کے بارے میں کارخانہ دار کو مشورہ دیتا ہے۔ مگر
اس کی اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ کاریگروں میں عدم مطابقت کی شکایت بڑھنے ہی نہ پائے۔ اس امر کے لیے
وہ کارخانہ میں ذہنی حفظ ماتقدم کے تمام متعلقہ اصولوں کا عملی اطلاق کرتا ہے۔ وہ کلبوں۔ مجلسوں۔ کھیلوں اور تفریحوں
وغیرہ کی تنظیم کی نگرانی کرتا ہے اور صنعتی ادارہ کے تمام افراد کے باہمی تعلقات کو خوش گوار تر بنانے کی ہر ممکن کوشش
کرتا ہے۔

صنعتی شاخ میں ماہر نفسیات کے وجود سے کاریگروں کی ذہنی صحت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے
لگتے ہیں، اور مسرت اور مطابقت کا دور دورہ ہونے لگتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کئی ایسے

کاری گر جو پہلے چھوٹی موٹی پریشانیوں کا شکار رہتے تھے، اب اس بدلے ہوئے اور بہتر ماحول میں خود بخود روبہ اصلاح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ملازموں کی نفسیاتی تربیت

فقط ایک خصوصی ماہر کی خدمات حاصل کر لینے سے سارے صنعتی ادارے کے جملہ شعبوں میں کس قدر خاطر خواہ اثر پڑ جاتا ہے؟ بہتر صورت تو یہی ہے کہ ہر کارخانہ میں کم از کم ایک ماہر نفسیات ضرور موجود ہو مگر بعض اوقات یہ بات ممکن نہیں ہوتی۔ مثلاً ممکن ہے ہمارے ہاں کارخانہ دار سٹاف میں ایک مزید عملی رکن کے اضافہ کو مالی پہلوؤں کے پیش نظر پسند نہ کرتا ہو۔ ہمارے وطن میں ابھی مستند ماہرین نفسیات کا سخت قحط ہے۔ اس لیے اس پہلو سے بھی ہر کارخانہ میں ایک ماہر نفسیات کا تعین ناممکن ہے۔ مگر کاری گروں کی ذہنی صحت کو نظر انداز کر دینا بھی خطروں سے خالی نہیں ہے۔ اس صورت حال کا ایک کم خرچ اور بالانشین علاج یہ ہے کہ کارخانہ دار اپنے ادارہ کے چیدہ چیدہ اراکین مثلاً فورمین، نگرانوں، کلیدی افسروں وغیرہ کے لیے صنعتی نفسیات کے مبادیات میں عملی تربیت کا اہتمام کرے۔ بلکہ اس قسم کی عملی تربیت سے وہ خود بھی مستفید ہو۔ کارخانہ دار، فورمین، صنعتی نگران، کارخانہ کے دوسرے اکابر صنعتی نفسیات میں عملی تربیت پا کر کاریگروں کو بہترین طریق سے سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کی مشکلات پر ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں۔ وہ ذہنی صحت کے موٹے موٹے اصولوں کے عملی اطلاق سے کارخانہ میں ایک خوش گوار جذباتی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جو کارخانہ دار، کاری گر اور معاشرہ سب کے لیے ہر اعتبار سے منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔

صنعتی صحت اور معاشرہ

صنعتی اداروں کی ذہنی صحت کی طرف خصوصی توجہ دینا کارخانہ دار یا اراکین کارخانہ ہی کا کام نہیں ہے، یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس میں معاشرہ کو بھی نمایاں حصہ لینا چاہیے۔ کاری گروں کی فلاح و بہبود کے لیے خصوصی انجمنیں قائم ہونی چاہئیں جو ان کی صحت اور تفریح کا اہتمام کیا کریں۔ ان مخصوص فلاحی انجمنوں کے علاوہ ہر شہر کی عام معاشرتی انجمنوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے حلقۂ عمل میں صنعتی کاری گروں کی بہتری

اور بہبود کے لیے کلب اور مرکز کھولیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ صنعتی آبادیاں اور کاری گروں کے اہل وعیال ان جذباتی نعمتوں سے محروم نہ رہ جائیں۔

مگر یہ فرض سب سے بڑھ چڑھ کر لیبر یونینوں کے لیڈروں پر عائد ہوتا ہے۔ لیبر یونینوں کو چاہیے کہ جہاں وہ مزدوروں کی اجرتوں اور مادی آسائشوں کے لیے آئینی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں وہاں ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کریں کہ کاری گروں کی جذباتی ضرورتوں کا احترام بھی بے حد ضروری ہے۔ کاری گروں کی صحیح، ٹھوس اور جامع خدمت کا بہترین طریق یہ ہے کہ انہیں بُری عادات سے بچنے کی تلقین کی جائے۔ انہیں خوش رہنے کے ڈھنگ سے روشناس کیا جائے۔ انہیں اپنے کام میں دلچسپی لینے اور اس میں کمال پیدا کرنے کا اشتیاق دلایا جائے۔ انہیں اپنے بیوی بچوں اور کارخانہ کے ساتھیوں سے خندہ پیشانی سے نباہ کرنے کے اصولوں سے متعارف کروایا جائے اور اپنی جذباتی الجھنوں کے مناسب علاج کی مالی اخلاقی اور معاشرتی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ ایک روشن خیال اور ترقی پسند لیبر یونین کاری گروں کی فلاح و بہبود کے مراکز کھولنے اور ان میں ذہنی صحت کے اصولوں کی اشاعت کرنے سے ملک کی صنعت و حرفت، صنعتی کارکنوں اور معاشرہ کے لیے اس قدر مفید اور ٹھوس خدمات سرانجام دے سکتی ہے جس کا مالی اور تمدنی فائدہ بے پناہ ہے۔

ذہنی انقلاب

آج دنیا میں ایک عظیم نفسیاتی انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مدتوں گمراہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد انسان سرعت سے پھر صحیح راہ کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ آج انسان پھر انسانی قدروں کو مقدم سمجھنے لگا ہے۔ تلخیوں اور دکھ درد کے طویل تجربوں کے بعد وہ پھر اس نظریے کا قائل ہوتا چلا جا رہا ہے کہ انسانی زندگی میں مرکزی اہمیت مسرّت، مطابقت اور صحت ہی کو ملنی چاہیے۔ آج دنیا کے تمام صنعتی ادارے بھی انسانیت کے سنہرے اصولوں کو اپنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج سنگدل ترین سرمایہ دار بھی اپنے کاریگروں کی بہتری کے لیے واقعی مضطرب نظر آتے ہیں۔ مزدوروں اور کاری گروں کی بہتری کے اس بڑھتے ہوئے جنون سے ساری صنعتی دنیا میں ایک ایسا خوشگوار تمدنی انقلاب رونما ہو رہا ہے جو ہر اس فرد کے

باعث مسرّت ہے جو جمہوری قدروں کا دل دادہ ہو۔

پاکستان بھی صنعتی میدان میں کافی ترقی کرنے لگا ہے۔ ترقی کی اس رفتار کو تیز تر کرنے اور روحِ ترقی کو انسانیت کے قریب تر لانے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ صنعتی اداروں میں مسرّت اور انسانیت کو فروغ دیا جائے۔ اہلِ صنعت و حرفت کی منفعت کے مفاد کا راز بھی اسی نکتہ میں مضمر ہے کہ ان کے کاری گر کارخانہ کے اندر اور باہر کی فضا میں ایک ایسی خوش گوار زندگی بسر کرتے ہوں جو ہر قسم کی تلخیوں اور الجھنوں سے پاک ہو۔

افریقی اقوام کا تمدّن

خدا داد خاں

افریقہ میں انسانی زندگی میں جتنا تنوع اور تضاد ہے، اتنا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ یہاں انسانوں کی صورتیں اور نسلیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ رنگ اور قد جُدا جُدا ہیں۔ لباس، مذہب، کردار اور طرز معاشرت الگ الگ ہیں۔ عام طور پر ایک ہی قوم یا ایک ہی علاقے کے لوگوں کی زبان اور طرز زندگی میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ چوں کہ افریقہ میں دنیا بھر کے تمام براعظموں سے زیادہ اقوام بستی ہیں جن کا تمدن اپنا اپنا ہے۔ اس لیے کسی سیاح کے لیے یہ ممکن نہیں کہ معمولی عرصے میں سارے براعظم کی تہذیب اور معاشرت کا مطالعہ کر سکے۔ اکثر سیاحوں نے کسی ایک ہی افریقی قوم یا خطے کے لوگوں کے متعلق جو کچھ دیکھا اسی کی بنا پر تمام براعظم کی معاشرت کا اطلاق کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریک براعظم کے متعلق اب تک جو بھی قیاس اور اندازے کیے گئے ہیں ان میں حقیقت بہت کم ہے۔

اہل امریکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے ہاں سب سے زیادہ انسانی نسلیں آباد ہیں۔ لیکن افریقہ میں ان سے دس گنا زیادہ مختلف اقوام بستی ہیں، جن میں اکثر کی قدامت ابھی تک محفوظ ہے۔ اگرچہ بعض نے بیرونی دنیا کے اثرات کو قبول کر لیا ہے اور ان کی معاشرت میں غیر ملکی امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ افریقہ میں صحرائی خطوں کو چھوڑ کر ہر جگہ نقل و حمل میں کسی دقت سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ افریقی اقوام جگہ بہ جگہ پھرتی رہتی ہیں۔ اکثر قومیں تو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر کسی اور حصے میں فاتحانہ حیثیت سے مقیم ہو گئی ہیں اور مغلوب قوم کو وہاں سے نکال کر خانہ بدوشی پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح یہ فاتح اور مفتوح قومیں جہاں بھی گئیں وہاں کی اصل تہذیب سے متاثر ہو کر مقامی باشندوں کے ساتھ گھل مل گئیں ان مخلوط قوموں کی تعداد میں افریقہ میں بہت زیادہ ہے۔ بانتو، سوڈانی، وادی نیل کے لوگ، حبشی حامی اور بربر کی سفید نسل قومیں سب مخلوط فہرست میں آتی ہیں۔ بے شمار قومیں جب دوسری قوموں میں مدغم ہو گئیں

تو ان کے معاشی اختلاط کے بعد ان کے نام بھی تبدیل ہو گئے۔ یعنی دو قومیں ملنے سے ان کا ایک نام ہی رہ گیا۔ جیسے حبشی اور ہمتی قوم سے ہوتنو نام مشہور ہوا۔ بانتو اور بونوں کی قوم سے باتوا قوم بنی۔ بربا اللہ حبشی قوم سے تبّو نام پڑا۔ وادی نیل کے لوگ جب بانتو قوم سے ملے تو ایک نئی قوم لُو بن گئی۔ ازمینڈ اور سینگبیٹو، عام طور پر سوڈانی کہلاتے ہیں۔ افریقہ کی ایک خانہ بدوش قوم واتوسی۔ خالصتاً ہمتی ہے۔ لیکن ان میں حبشی اور بانتو قومیں بھی خلط ہو رہی ہیں۔

افریقہ میں تقریباً پانچ چھ سو قومیں بستی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غیر ملکی لوگوں کی کثیر تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ترک۔ انڈونیشی۔ ہندوستانی چینی۔ فرانسیسی۔ انگریز۔ ولندیزی۔ ہسپانی اطالوی۔ جرمن۔ بلجیمن۔ یہاں تاجرانہ حیثیت سے کبھی کے آباد ہو چکے ہیں۔ ان میں بعض نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ افریقہ میں تقریباً تین سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بلکہ ایک حد تک تو ان گنت زبانیں ہیں کیوں کہ بلحاظ زبان یہاں اتنا اختلاف ہے کہ ایک چھوٹے سے علاقے میں جہاں کوئی ایک درجن گاؤں آباد ہیں۔ چار یا پانچ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پچھلی صدی میں چند نئی تجارتی زبانیں بھی ایجاد ہوئیں۔ لیکن ان میں بھی غیر معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔

افریقہ میں صرف مصر میں ہی نسل انسانی کے صحیح تاریخی حالات ملتے ہیں ورنہ اس کے سوائے مجموعی طور پر اس برِ عظیم کے تاریخی حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بحیرہ روم کے نواحی ملکوں میں قدیم کارتھیج و رومنوں کا تسلط ضرور رہا۔ لیکن ان کی تہذیب کا اثر افریقہ پر نہیں پڑ سکا۔ پھر اس کے بعد قرون وسطیٰ میں جب عرب یورپین ممالک کو حیطۂ تصرف میں لا رہے تھے اور بحیرہ روم کے نواحی علاقوں پر قابض ہو چکے تھے اور یہاں اسلامی تہذیب عروج پر تھی۔ لیکن انہوں نے بھی افریقہ کی معاشرت پر بہت کم اثر ڈالا۔ اس طرح افریقہ میں سوائے شمالی حصے کے کہیں بھی کسی بیرونی قوم کا تسلط نہیں ہوا۔ اور اس حصے میں رہنے والی قوموں کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بلحاظ نسل افریقہ کی سکہ بند قومیں ہیں۔

انگریزوں نے اگرچہ یوگنڈا میں اپنی ایک مضبوط حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن اس حکومت سے کچھ ایسی بیداری تہذیب کی تخلیق نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر زولو۔ اور سوتو دونوں قوموں کی اپنی اپنی نہایت

ر حکومتیں تھیں، لیکن یہ محض یوروپین اقوام کے دخل کو روکنے کے لیے قائم ہوئی تھیں، معاشی اور ثقافتی
یران کا کوئی دیرپا اثر قائم نہیں ہو سکا۔ افریقہ میں ہر قوم کی تاریخی کہانی کے خدوخال جداجدا ہیں جنہیں ایک
رخ ترتیب تو دے سکتا ہے۔ لیکن درمیان میں کہیں جا کر ان کے سلسلے کچھ ایسے ٹوٹ سے جاتے ہیں
سے سارے واقعات کا ربط قائم نہیں رہ سکتا۔ مثلاً صحرائے اتوری کے بونے حبشی یہ کہتے ہیں کہ ان کے
اجداد شمال کی طرف سے آئے ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کب آئے؟ اور شمال کے کس حصے سے
ے؟ بہر حال تاریخی حالات افریقہ میں قریباً ہر جگہ پردۂ اخفا میں ہیں۔ لیکن علم الانسانی کے ماہرین نے یہ انکشاف
رکر لیا ہے کہ افریقہ میں کون کون سی قومیں آپس میں اختلاط پذیر ہوئی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہے
کون سی قوم کس طرف کو ہجرت کر کے گئی تھی، اور افریقہ کے متعلق تاریخی ضمن میں اس سے زیادہ کچھ معلوم
یں ہو سکا۔

لیکن افریقی اقوام کے تاریخی حالات کی عدم واقفیت سیاحت کو غایت درجہ دلچسپ بنا دیتی ہے
یوں کہ افریقہ جانے سے پہلے ایک سیاح کے ذہن میں وہاں کے لوگوں کے متعلق کوئی جچا تلا تصور یا نظریہ نہیں
ہوتا، اور اس کے تصور میں صرف افریقہ کے اصلی باشندے ہی ہوتے ہیں۔ سیاہ فام، گھنگریالے بالوں
والے، چپٹی اور چوڑی ناک والے حبشی۔ ابھرے ہوئے ہونٹ۔ ننگ دھڑنگ۔ توہم پرست۔ غیر مہذب
طفلانہ حرکات رکھنے والے جاہل اور اجڈ قسم کے عجیب و غریب لوگ۔ لیکن افریقہ میں پہنچ کر اسے نہایت
حیرت ہوتی ہے کہ صرف چند ہی افریقی لوگ اس کے اس تصور کے مطابق ہیں، ورنہ بیشتر مخلوق اس کے
برعکس ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ افریقی لوگوں میں آپ کے لیے بے حد کشش ہے اور آپ جوں جوں ان کا مطالعہ
کرتے جائیں گے آپ کی حیرت بڑھتی جائے گی۔ اور پہلی معلومات کے نقوش نئی معلومات سے بدلتے جائیں گے
یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کو ان معلومات کی دریافت کے لیے تمام افریقہ کی سیاحت کرنا پڑے۔ بلکہ اگر آپ کسی ایک ہی
خطے کی سیر پر ہی قناعت کر لیں تو وہاں کے باشندے تمدن اور معاشرت میں تضاد اور تنوع کی ہزاروں پہیلیاں
پیش کریں گے۔ بلجین کانگو۔ روانڈا۔ یوگنڈا۔ کینیا۔ اور ٹانگانیکا ایسے علاقے ہیں جن کے اندر ہر جگہ جغرافیائی
حالات میں اختلاف اور انسانی نسلوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اور کئی قسم کی قومیں آباد ہیں۔ بلجین کانگو میں

بانتو، سوڈانی حبشی۔ ہمتی، ہمیتی، اور بو نے لوگ آباد ہیں، جو آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور اس اختلاط کے بعد ان کے نام بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ مثلاً باٹو یا۔ باکوبا۔ بالونڈا۔ بابلی۔ بامبول، بابیرا۔ باہادو۔ بامبوبا۔ باکیلے۔ باکوسو۔ باسونگے وغیرہ، درجنوں ایسی قومیں ہیں جن کے نام 'با' سے شروع ہوتے ہیں، 'با' کا مطلب لوگ سمجھا جاتا ہے۔ اسی علاقے میں وادی نیل کے لوگوں کی بھی کئی قومیں ہیں جن الور۔ لوگو۔ لوگواری اور کاکوا کے نام سے مشہور ہیں۔ سوڈانی لوگوں کے کئی اور خاندان بھی یہاں بستے ہیں جن میں آرمینڈو اور منگبیٹو نہایت قابل ذکر ہیں۔ ان کی نسل اگرچہ ایک ہے لیکن زبان اور طرز زندگی میں بڑا فرق ہے۔ یہاں جو نسلیں رہتی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ ترالیسی۔ وا ہیڈ۔ وارنگا وازنبا۔ واسنگولا۔ اور واگینا۔ یہاں بھی وا کے معنی لوگ یا قوم سمجھے جاتے ہیں۔ اب اقوام کی کثرت اور ان کے ناموں کی فہرست ایک سیاح کے لیے خاصی دقت پیدا کر دیتی ہے اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ وہ مطالعہ کی ابتدا کہاں سے کرے، پھر یہ حیرت اور دقت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جبکہ ہر قوم کے آدمی کو اس کے قومی نام کے بجائے ایک عجیب نام سے پکارا جاتا ہے یعنی جب ایک شخص کو بلایا جاتا ہے تو اس کی قوم کا نام تبدیل ہو جائے گا۔ مثلاً باہیرا۔ قوم کے آدمی کو مدہیرا کہتے ہیں۔ کیبوتی خاندان کے آدمی کو ممبوتی اور والینڈ کے آدمی کو موالینڈو اور ایک 'واتوسی' کو 'موتوسی' بولا جاتا ہے۔

مشرقی کانگو میں عربی النسل لوگ آباد ہیں۔ ان کی سیاہ فام عورتیں نہایت خوب صورت اور متناسب قسم کے سفید چغے پہنتی ہیں اور سر پر ٹوپی استعمال کرتی ہیں۔ یہ لوگ بانتو نسل سے ہیں اور راسخ الاعتقاد مسلمان ہیں۔ ابتداً تو یہ قوم وحشیانہ طور پر زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد ان کے اطوار زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ یہ لوگ صاف ستھرے گھروں میں رہتے ہیں جن کو نہایت خوب صورتی سے پلستر کیا ہوا ہوتا ہے۔ ان مکانوں کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں میں مراکش اور عرب ملکوں کی معاشرت کا اثر ہے۔ آج سے کئی صدیاں پہلے جزیرہ نما عرب۔ مسقط اور عمان کے مسلمان زنجبار اور افریقہ کے مشرقی ساحلی ملکوں کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ وہ ہاتھی دانت کی تلاش میں افریقہ کے وسطی اور جنوبی حصوں میں جھیل ٹانگانیکا تک پہنچ گئے۔ تجارت کے ساتھ یہ مجاہد منش لوگوں نے اپنی عسکری روایات کو بروئے کار رکھا۔ اور انہوں نے

کانگو کے مشرقی حصے کو اپنے حیطۂ اثر میں لے لیا۔ ان کے لشکر میں افریقی سپاہیوں کی کثیر تعداد شامل تھی۔ افریقہ کی مشہور قوم بانتو نے انہی عربوں کی بدولت اسلام قبول کیا اور اس قوم کے نوجوان بڑی تعداد میں عرب لشکر میں بھرتی ہو گئے۔ بہت سے عربوں نے بانتو عورتوں سے شادیاں کر لیں اور اس طرح بانتو قوم عربوں سے گڈمڈ ہو گئی۔ ان ایام میں شاہ بلجیم لیوپولڈ نے کانگو میں اپنی ریاست قائم کی ہوئی تھی۔ عربوں کی پیہم لشکر کشی سے شاہ بلجیم کو نہایت تشویش پیدا ہوئی، اور اس نے ان کو کانگو بلکہ تمام افریقہ سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا جہاں جہاں عربوں کو بلجین کانگو ریاست سے بہت سی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ آٹھ سال کی مسلسل خوں ریزی کے بعد بلجین ریاست نے عربوں سے صلح کر لی جس میں یہ طے ہوا کہ بلجین ریاست کا وجود قائم رہے گا اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر عربوں کا تسلط باقی رہے گا۔ عرب وطن سے دور ہونے کے باعث انہی علاقوں میں رہائش پذیر ہو گئے اور یوں ان مقامات پر عربی تمدن اور اسلامی تہذیب کو پھیلنے کا موقع ملا۔ عربوں کی کئی اور بھی بستیاں ہیں جن میں شیشلے ول بہت مشہور ہے۔ یہاں بعض اور قومیں بھی بستی ہیں لیکن اس کی شہرت عربوں کے نام سے ہی ہے۔ یہاں عربوں کا اپنا بادشاہ ہے، جسے بلجین ریاست نے باقاعدہ طور پر تسلیم کیا ہوا ہے۔

عربوں اور بانتوؤں سے مل کر جو نئی قوم پیدا ہوئی اس کا شمار افریقہ کے قدیم باشندوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ بانتو قوم نے جس سرعت سے عربی لباس اور عربی معاشرت اختیار کی وہ نہایت دلچسپ ہے، حالاں کہ افریقہ کی باقی قومیں کم و بیش اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں۔

لیکن پہلی جنگ عظیم میں وسطی افریقی اقوام جدید تہذیب کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اتحادیوں کو چوں کہ اس جنگ میں اسلحہ سازی کے لیے دھاتوں کی شدید ضرورت تھی۔ اس لیے کانگو کے شمالی حصے میں باوجودیکہ راستے نہایت دشوار گذار تھے۔ ہر جگہ ٹرک دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے اور پاؤلس کے چھوٹے سے قصبے میں جو کانگو کی آخری حد پر واقع ہے ہزاروں کی تعداد میں ٹرک آ کر ٹھہرتے تھے اور جس عرصے میں شمالی افریقہ میں جنگ جاری تھی۔ یہاں ڈاکسی کانگو کمپنی نے اپنا دفتر قائم کیا اور سینکڑوں دکانیں کھل گئیں جہاں ٹرکوں کی مرمت کی جاتی تھی اور جدید طرز کے ہوٹل بھی کھل گئے۔ اس جنگ کے دوران میں

ڈلس تک باقاعدہ سڑک تعمیر ہونی شروع ہوگئی۔ ہزاروں کی تعداد میں کاریگر، مستری اور ڈرائیور کام کرنے لگے اور ہر جنگی سامان سے بھرے ہوئے سینکڑوں ٹرک صحرا، بسوڈاں کے راستے اتحادی فوجوں کے کیمپوں میں پہنچنے شروع ہو گئے، یہ سب کچھ جرمن جرنیل رومیل کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے کیا جا رہا تھا اور جب جرمنوں نے ان ٹرکوں کو روکنے کے وسیع انتظامات کر دیے تو اتحادیوں کو نئے راستے تلاش کرنے پڑے تاکہ ان کی سپلائی میں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔ اس طرح انہوں نے کانگو کے ساحل کے ساتھ ساتھ کا نیا راستہ اختیار کیا اور رشیلے ول تک ایک ریلوے لائن بچھا دی۔ پاؤلس تک سڑک تعمیر کر دی گئی جنگ ختم ہوئی تو کانگو میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور نہایت تیزی سے صنعتی ترقی کا آغاز شروع ہوگیا۔ موجودہ وقت میں کانگو کی وادی ایک رنگین سرزمین ہے لیکن بعض مقامات پر یہاں اب بھی وحشی اقوام بستی ہیں اور انہوں نے نئے تمدن سے قطعاً کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ ان میں صحرائے اتوری کے حبشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میگنبیٹو اور بابیرا میں آہستہ آہستہ اپنے پرانے طرز معاشرت اور اسلام کو چھوڑ رہی ہیں کیونکہ یہاں پادریوں، ڈاکٹروں اور سیاحوں کا گذر اکثر ہوتا رہتا ہے میگنبیٹو عورتوں نے نوزائیدہ بچوں کے سروں کو پٹی سے باندھنا چھوڑ دیا ہے۔ اور بابیرا لڑکیوں نے اپنے ہونٹوں کی آرائش ترک کر دی ہے۔

ہونٹوں کی آرائش کا عجیب طریق یہ ہے کہ عورتیں اوپر کے ہونٹ کے نیچے تین یا چار انچ کی ایک گول لکڑی ٹھونس دیتی ہیں تاکہ ہونٹ اوپر کو اٹھا رہے یہ عورتیں غیر ملکی سیاحوں کے سامنے ہونٹوں کی آرائش کو تصویر کشی کے لیے پیش کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتی ہیں۔ ایک اور طریق یہ ہے کہ اوپر کے ہونٹ کو چیر کر ایک گول سوراخ بنا دیا جاتا ہے اور اس سوراخ میں جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ قطر کی لکڑی کی گولی ڈال دی جاتی ہے۔ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ موٹی سے موٹی گولی سے کام لے۔ لکڑی کی یہ گولی ہونٹ کے نیچے باقاعدہ اور مضبوطی سے ٹکانے کے لیے اوپر کے چار دانت نکال دیے جاتے ہیں تاکہ یہ گولی گرنے نہ پائے اور باقاعدہ جمی رہے۔ آرائش کا یہ دل فریب طریق اس قوم میں قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، اور یہ خیال درست بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپین اقوام کی آمد پر ان لوگوں کو بطور غلام فروخت کیا جاتا تھا اور بالخصوص عورتیں کثرت سے بکنے لگی تھیں۔ بابیرا لوگوں نے اس مصیبت سے بچنے کے لیے عورتوں کو غیر دلکش بنانے کے لیے یہ ترکیب اختیار کی تاکہ ان میں

کوئی جاذبیت باقی نہ رہے اور کوئی شخص انہیں چرا نہ سکے لیکن غلاموں کی تجارت ختم ہونے پر بھی ہونٹوں کی آرائش کا یہ طریق ان میں بدستور باقی ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ افریقی لوگ پرانی رسوم کے امانت دار ہوتے ہیں اور روایات کو برقرار رکھنا ان کا خاص امتیاز ہے۔ باہیرا مرد عورت کے ہونٹوں کی اس آرائش کو غایت درجے پسند بھی کرتے ہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی اعضا کی قطع و برید کی رسم باہیرا قوم میں غلاموں کی تجارت سے بہت پہلے کی چلی آرہی ہے یہ لوگ بڑی خوشی سے اپنے اعضا کاٹ کر اپنے جسم اور چہرے کو بدصورت بنا دیتے ہیں جس سے ان کی صورتیں بڑی کریہہ نظر آتی ہیں۔ مثلاً ٹانگانیکا کے مرد اپنے کانوں کی لو کو چیر دیتے ہیں اور پھر مختلف طریقوں سے ان کو اتنا لمبا بنا لیتے ہیں کہ وہ کندھوں تک جا پہنچتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ طریق مردانہ حسن کا وصف خیال کیا جاتا ہے۔ بعض عورتیں اپنے دونوں ہونٹوں کے علاوہ نتھنوں کو بھی چیر دیتی ہیں۔

جھیل ایڈورڈ کے شمال میں دریائے سیملکی کے قریب بانیالی قوم کے لوگوں میں بھورے رنگ کے مرد اور عورتیں اکثر دیکھے گئے ہیں۔ ان کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایک آدمی کے متواتر چار بچے سرخ رنگ اور سرخ بالوں والے بچے پیدا ہوئے۔ لیکن پانچواں بچہ جب پیدا ہوا تو اس کا رنگ گندمی تھا۔ بھورے رنگ کا کوئی آدمی جب دیہات میں جاتا ہے تو لوگ اس کو بڑی محبت اور پیار سے دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہیں عرض کیا جا چکا ہے کہ افریقہ میں ہر قوم بلحاظ تمدن دوسری اقوام سے جدا ہے۔ اس لیے کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر فوقیت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ معاشی کردار کے لحاظ سے کون سی قوم کو دوسری اقوام پر شرف حاصل ہے۔ اور اگر کوئی قوم از خود اپنے کو برتر و ارفع خیال کرے بھی تو یہ اس کی فوقیت کی صحیح دلیل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کوئی غیر ملکی سیاح پوری دیانت کے ساتھ ان اقوام کا مطالعہ کرے تو اس کا یہ موازنہ بھی صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ وہ جو فیصلہ یا اندازہ لگائے گا وہ اس کے اپنے ذوق اور معیار کے مطابق ہوگا اور یہ ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو بعینہٖ صحیح سمجھیں، بلکہ ہر آدمی اپنے مذاق کے مطابق افریقی اقوام میں سے کسی خاص قوم کی معیشت اور اطوار زندگی کو پسند کرے گا اور ظاہر ہے۔ دوسرے لوگوں کی پسند اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔

تاہم کم وبیش تمام سیاحوں کا اس پر اتفاق ضرور ہے کہ واگینیا، قوم کے مرد خوب صورت متناسب جسم اور مردانہ صفات کے حامل ہیں۔ وہ شکار کے دوران جس جرات اور والہانہ جوش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ بے مثال ہے اور کچھ انہی لوگوں کا حصّہ ہے۔ واگینیا، کا گاؤں سٹینلے ول سے ذرا باہر دریائے کانگو کی آبشاروں کے قریب واقع ہے اور یہاں جو قوم بستی ہے وہ صدیوں سے اپنی قدیم روایات کے تقدس کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ سٹینلے ول کے ترقی یافتہ شہر کے نزدیک ہونے کے باوجود ان لوگوں نے ابھی تک جدید معاشرت اختیار نہیں کی۔ مچھلی کا شکار، تیراکی اور کشتی بانی ان کے محبوب مشاغل ہیں اور اس پر اس کو بے پناہ فخر ہے۔ وہ اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھنے میں کچھ اتنے متعصب واقع ہوئے ہیں کہ انہوں نے ہر اس بیرونی اثر کے خلاف جنگ کی جس سے ان کی ان روایات کے وجود پر زد پڑتی تھی۔ انہوں نے سٹینلے اور عرب لوگوں سے اس سلسلے میں لڑائیاں لڑیں، بلجین حکومت نے جب کانگو پر قبضہ کیا تو اس نے اس قوم سے مصلحتاً کچھ تعرض نہ کیا اور اس طرح واگینیا، قوم بدستور اپنی پرانی روش پر قایم رہی۔

مچھلی، واگینیا، قوم کی پسندیدہ غذا ہے۔ یہاں کے دریاؤں میں ایک خاص قسم کی مچھلی جسے کسا نگالا، کہا جاتا ہے پائی جاتی ہے اور دریائے کانگو میں تو یہ نہایت افراط سے ملتی ہے۔ اس مچھلی کا وزن پانچ سو اسّی ۵۸۰ پونڈ تک ریکارڈ کیا گیا ہے۔ دریائے کانگو کا بپھرا ہوا پانی جب آبشاروں سے گذرتا ہے۔ تو سفید جھاگ کے تودوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ پتھریلے اور چٹیلے کناروں کی وجہ سے دریا کسی قدر تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی روانی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پانی کے تند و تیز ریلوں میں جگہ جگہ لمبے لمبے بانس گڑھے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے تیز بہاؤ میں ان کو کس طرح گاڑا گیا ہے۔ یہ بانس واگینیا، ماہی گیر گاڑتے ہیں اور ان کی مدد سے مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں۔ خشک موسم میں جب پانی کی رفتار ذرا مدھم ہو جاتی ہے اور اوپر ابھری ہوئی چٹانوں کے سر ننگے ہو جاتے ہیں تو بانس گاڑنے کا موسم آجاتا ہے۔ اس موسم میں اگر پرانے گڑھے ہوئے بانسوں میں کوئی خرابی آگئی ہو تو ان کی مرمت بھی کر دی جاتی ہے۔ اور پھر سے چٹانوں میں مضبوطی کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ بانس جالوں کو تھامنے کا کام دیتے ہیں۔ جالوں کے سائز مختلف ہوتے ہیں جو اکثر بارہ اور چودہ فٹ قطر کے ہوتے ہیں۔ اگر ان کو پھیلا دیا جائے تو نیچے سے گول اور اوپر سے مخروطی شکل میں ہوتے ہیں ان جالوں میں

بیت درجے کی لچک اور مضبوطی ہوتی ہے۔ ماہی گیر انھیں پانی کی سطح پر پھیلا کر ڈوریوں کو بانسوں سے باندھ دیتے ہیں۔ جب پانی شدت کے ساتھ ان جالوں میں سے گذرتا ہے تو اس کی تند لہریں مچھلیاں ان میں پھنسا دیتی ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے جال لگا دیے جاتے ہیں۔ درمیان میں تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے میں پانی کی لہریں گذرتی ہیں۔ مرا گینی ملاح ڈونگو میں بیٹھ کر گیت گاتے ہوئے ادھر اُدھر سطح آب پر پھرتے رہتے ہیں۔ ان کے ننگے ننگے سیاہ کندھے دھوپ میں چمکتے ہوئے عجیب منظر پیدا کرتے ہیں۔ اور جب وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے چپو مارتے ہیں تو وجد انگیز سماں بندھ جاتا ہے اور جوں ہی کشتی تیز لہروں کے بہنے لگتی ہے تو ان کے گیتوں میں بھی تیزی اور جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ خوشی خوشی جال کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

مینگبیٹو قوم میں فنِ تعمیر اور اسلحہ سازی نہایت ہی دل کش انداز میں رائج ہے جو غیر ملکیوں کے لیے نہایت درجہ باعث کشش ہے۔ مینگبیٹو عورتیں نہایت ہی جاذب نگاہ اور خوب صورت ہیں۔ ان کی جاذبیت کی وجہ بتانا آسان نہیں۔ ان میں ایک وہبی قسم کی کشش ہے جو اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان عورتوں کے کولہے بھاری، انگلیاں لمبی اور چھاتیاں نہایت سخت ہوتی ہیں۔ کسی اور قوم کی عورتوں میں یہ جسمانی خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اگر بظاہر خوبصورت ہوں بھی تو محض صحت، جوانی اور خون کے جوش کی وجہ سے ہوں گی ورنہ ان میں مینگبیٹو عورتوں کا سا قدرتی حسن نہ ہوگا۔ مینگبیٹو عورتیں اپنے چوتڑوں پر گول یا بیضوی پنکھا باندھتی ہیں اور جب وہ رقص کرتی ہیں تو ان کے حسن میں ان پنکھوں کی وجہ سے اور بھی دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ پنکھا رقص میں حرکت کے ساتھ پھڑپھڑاتا اور لرزتا ہے، جس سے عجیب سا سحر انگیز سماں بندھ جاتا ہے۔ یہ پنکھے عام طور پر کھجور کے رنگدار ریشوں سے بنائے جاتے ہیں۔ مینگبیٹو عورتوں میں ایک خاص قسم کا وقار اور عظمت پائی جاتی ہے۔ اور واتوسی، قوم کے حکمران طبقے کی عورتوں کی طرح ان کا حسن نکھرا نکھرا سا رہتا ہے۔ واتوسی اور مینگبیٹو عورتیں اتنی خوش گفتار اور ملنسار ہیں کہ ان کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ایک اجنبی کچھ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات میں ایک غیر شعوری طور پر انگیخت سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن جنسی انگیخت کی یہ غلط فہمی بہت جلد ہی دور بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ مینگبیٹو عورتیں کردار کے لحاظ سے نہایت ہی مضبوط اور

باعثِ احترام ہیں، وہ خاصی سنجیدہ اور جنسی اختلاط کے معاملے میں سخت محتاط ہیں۔ ان کی رفتار اور گفتار سے یہ کبھی ظاہر نہ ہوگا کہ وہ اپنے حسن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ وہ تمام ناشائستہ حرکات خواہ وہ اجنبی کی طرف سے ہوں یا غیر اجنبی سے سرزد ہوں، سخت ناپسند کرتی ہیں۔

مینگبیٹو، مرد اپنی حسن شناسی اور حسن پرستی کے لیے خاصے شہرت پذیر ہیں۔ ان کے یہاں کثرت ازدواج کا رواج عام ہے۔ قوم کے سرکردہ اور سربرآوردہ لوگوں کے ہاں چار چار سو تک بیویاں ہوتی ہیں۔ متوسط طبقے کے مرد بھی اپنی حیثیت کے مطابق کئی کئی شادیاں کرتے ہیں لیکن غریب اور نادار لوگ ایک ہی بیوی پر قناعت کرتے ہیں۔ مینگبیٹو مرد اعلیٰ درجے کے فن کار اور مہذب سمجھے جاتے ہیں اور ایک غیر ملکی سیاح کے لیے ان میں بہت سی دل چسپیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قدیم زمانے میں ان میں مردم خوری کا عام رواج تھا۔ مردم خوری کی مکروہ رسم کم و بیش افریقہ کی ہر قوم میں پائی جاتی تھی لیکن مینگبیٹو اس کے لیے زیادہ بدنام ہیں۔ ایک جرمن ماہر علم الانسان پروفیسر شیوین فورتھ نے افریقی استوائی خطے کے متعلق بہت دل چسپ حقائق کا انکشاف کیا ہے اور اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ ۱۸۷۰ء تک مینگبیٹو قوم بدستور غیر مہذب تھی۔ بیرونی دنیا کے سیاح اور سائنس دان جب یہاں آتے تھے تو وہ یہاں کے باشندوں سے تانبے کے عوض میں انسانی ہڈیاں خریدتے تھے اور یورپ کی لیبارٹریوں میں جا کر ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ افریقہ میں تانبا قدیم باشندوں کے لیے بڑی قیمتی چیز تھی اور وہ اس کے حصول کے لیے انسانی ہڈیوں کے ذخیرے جمع کرتے رہتے تھے۔ اس جرمن پروفیسر نے اپنے دورے میں بہت سی ہڈیاں جمع کیں۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کھوپڑی کی تمام ہڈیاں کھلی ہوئی ہیں اور ان میں ایک بھی سلامت نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ مینگبیٹو لوگوں کے لیے انسانی دماغ نہایت ہی مرغوب غذا ہے اور وہ کھوپڑی کو کھول کر دماغ نکال لیتے تھے۔ ایک اور جرمن سیاح نے جو امین پاشا کے نام سے کئی سال تک وسطی افریقہ میں مقیم رہا بیان کیا ہے کہ مینگبیٹو والہانہ طور پر انسانی گوشت کھاتے ہیں۔ ان کے ملک میں کوئی قید نہیں ان کے دسترخوانوں پر انسانی گوشت ایک قیمتی اور ٹھاٹ کا کھانا سمجھا جاتا ہے اور وہ اسے مہمانوں کے سامنے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ مردم خوری کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مینگبیٹو لوگوں کے ہاں مویشیوں کی شدید قلت تھی، اور وہ انسانی گوشت کھانے میں قدرتی طور پر مجبور تھے اور اسے سچ بھی سمجھا

جاسکتا ہے کیونکہ زولو اور ماسی قوم کے لوگوں میں جہاں مویشیوں کی بہتات ہے۔ مردم خوری بالکل نہیں۔ مگر اب میننگبیٹو قوم میں بھی مردم خوری متروک ہو چکی ہے۔ لیکن مردم خوری کے بہت سے واقعات ان لوگوں سے منسوب ہیں ایک پادری نے بتایا کہ ایک میننگبیٹو عورت نے اپنے خاوند کو دفن کرنے کے بجائے اس کا گوشت نہایت محنت اور اہتمام سے پکایا اور اپنے رشتہ داروں کو مدعو کیا، دعوت کے اختتام پر اس نے مہمانوں سے کہا کہ میں نے آج اپنے خاوند کا حق ادا کر دیا ہے۔" میننگبیٹو بادشاہ مونزا کے دسترخوان پر روزانہ ایک نازک بچے کا گوشت سجایا جاتا تھا۔

میننگبیٹو لوگ بڑے عجیب طرز سے سلام کرتے ہیں، وہ جب کسی سے ملتے ہیں تو دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بجا کر کہتے ہیں گاسگی (ہیلو) یہ لوگ اپنے لمبوترے سر کی بدولت بہت مشہور ہیں ان کی عورتیں نوزائیدہ بچوں کے سروں کو تسمے سے کس کر باندھ دیتی ہیں اور مسلسل بندھے رہنے سے سر کی کھوپڑی اوپر اٹھ جاتی ہے اور بیضوی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ سر کی اس تبدیلی سے کھوپڑی پر کچھ اثر نہیں پڑتا لیکن آنکھیں اوپر کو کھچ جاتی ہیں۔ مرد اور عورتیں یکساں طور پر لمبوترے سروں کو پسند کرتے ہیں بلکہ عورتیں تو مصنوعی بال لگا کر سروں کو اور بھی ابھار لیتی ہیں اور کچھ ایسے طریقے سے آراستہ کرتی ہیں کہ ایک تاج سا بن جاتا ہے۔ جس میں وہ ہاتھی دانت یا چاندی کا کلپ لگا لیتی ہیں۔ وہ اپنے سر کی زیبائش میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتی ہیں اور سنگھار کے تمام جوہر استعمال میں لاتی ہیں۔ میننگبیٹو قوم کے عامل اور مذہبی رہنما سر باندھنے کی اس رسم کو اہم فریضہ قرار دیتے ہیں اور بلجیئن ریاست نے تو اس رسم کی باقاعدہ سرپرستی کر رکھی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک قابل تعریف اقدام ہے۔ اگر جدید تہذیب کے علمبردار افریقی رسومات کو ان کے حال پر چھوڑ دیں تو بھی بہتر ہے کیونکہ افریقہ کے حسن کا دارومدار محض اس کی قدامت پر ہی ہے۔ اور اگر افریقہ میں کچھ کشش ہے تو اسی سے ہے۔

میننگبیٹو سردار پاؤلس کے قریب ایک دیہات میں رہتا ہے۔ اس کے مکان کی دیواروں پر خوش نما پلستر کیا ہوا ہے اور جن ستونوں پر چھت قائم ہے ان پر تمام قسم کے جانوروں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ مگرمچھ، سانپ اور مچھلیوں کی تصاویر کے نادر نمونے ان پر نظر آتے ہیں۔ ان ستونوں پر نہایت باریک اور صاف ستھری جیومیٹری کی اشکال بھی کھچی ہوئی ہیں۔ عام لوگوں کے گھروں کی دیواروں پر بھی رنگین مصوری کے نمونے ملتے ہیں۔ میننگبیٹو سردار اب انگریزی لباس پہنتا ہے اور اس کی کلائی پر گھڑی بھی ہوتی ہے، وہ چکدار بیدوں اور چھال سے بنے ہوئے لباس کو چھوڑ کر

بڑا خوش معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دربار میں رقص و سرود کی پُر لطف محفل جمتی ہے جس میں اس کی بیویاں اور اس کی جوان اور خوب صورت لڑکیاں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

ٹانگولو قوم کا سردار بھی اینٹوں کے خوش نما مکان میں رہتا ہے اور اپنے دربار میں ایک بلند کرسی پر بڑے فخر سے بیٹھتا ہے۔ اس کا یہ تخت بینگبیٹو قوم کے صنّاعوں کی فن کاری کا عجیب نمونہ ہے۔ یہ لوگ ہاتھی دانت، لکڑی اور دھات کا کام نہایت صفائی سے کرتے ہیں۔ ٹانگولو سردار کے دربار میں بھی مغنیوں کا ایک گروہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ بینگبیٹو قوم کی موسیقی اب تو تمام دنیا میں مشہور ہے اور اس کی دھنیں بڑی تیزی سے یورپین موسیقی میں شامل ہو رہی ہیں۔ بینگبیٹو عام طور پر کورس کی صورت میں بھجن گاتے ہیں۔ ان کے مغنی دوسری اقوام کے فنکاروں کی نسبت زیادہ مشاق اور صاحب فن سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر قسم کے ساز استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے طبلے اور ڈھول تکون اور مربّع شکل کے ہوتے ہیں جن پر ہرن کی کھال مڑھی ہوتی ہے ان کے پاس ہاتھی دانت کی شہنائیاں بھی ہوتی ہیں جو تقریباً دو گز لمبی ہوتی ہیں وہ ان پر چیتے کی دھاری دار کھال مڑھ دیتے ہیں اور خوابصورتی کے لیے طوطے کے پر لگا دیتے ہیں۔ ان شہنائیوں سے کچھ ایسی آوازیں نکلتی ہیں گویا جنگل کے بہت سے جانور غرا رہے ہیں۔ ان کا ایک اور ساز بھی ہوتا ہے جو وائلن سے ملتا جلتا ہے۔ یہ ہرن کا سینگ بھی بجاتے ہیں۔ لکڑی کے جھنجھنوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈال کر ڈھولک کے ساتھ سُر اور تال کے ساتھ بجاتے ہیں اور جب یہ سارے ساز ایک ساتھ بجائے جائیں تو وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مرد اور عورتیں ایک ساتھ رقص کرتے ہیں۔ ایک دائرے میں مرد کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے اندر عورتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ساز بجنے شروع ہو جاتے ہیں اور تمام رقاص آہستہ آہستہ زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چکر میں پھرتے ہیں اور کورس کی شکل میں گاتے جاتے ہیں۔ جوں جوں سازوں کی آواز تیز ہوتی ہے گیتوں میں جوش پیدا ہوتا جاتا ہے اور پاؤں بھی تیزی سے زمین پر مارے جاتے ہیں عورتیں بڑے دلفریب اور حسین انداز میں اپنے جسموں کو موڑتی اور جھٹکے دیتی ہیں۔

باکوبا قوم میں نقاش، نغمہ گو اور مورخین کے علاوہ فنون لطیفہ کے ماہرین بھی موجود ہیں۔ نمبی دیوی باکوبیوں کے نزدیک زمین اور زمین پر کی تمام مخلوق کی محافظ ہے۔ ان کے بادشاہ کو اتنے بھاری زیور پہنتے

مدارس کی تعلیم کا معیار کیسے بلند کیا جا سکتا ہے؟

ملک فلک شیر خاں مسلسل نمبر ۲

زیر نظر مقالہ کا ایک حصہ دسمبر ۸۳ء کے آموزش میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ آج قارئین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

۲۴ ریفریشر کورس:۔ مختلف مضامین میں تعلیم دینے کے لیے وقتاً فوقتاً ریفریشر کورس منعقد کرنا ضروری ہے اس طرح کا انتظام کیا جائے کہ ہر پانچ سال کے بعد ہر ایک استاد کو کورس میں شامل ہونے کا موقع ملتا رہے اس ضمن میں یہ تجویز بہت مفید رہے گی کہ ریفریشر کورس کا عملہ مخصوص اور مستقل ہو جو جگہ جگہ پر جا کر کورس منعقد کرے۔ تمام ساز و سامان ہر قسم نقشہ جات، تعلیمی چارٹ، کھیلیں اور کتب وغیرہ ان کے پاس ہونا چاہیے۔

۲۵۔ معائنہ:۔ معائنہ زیادہ مفصل اور جامع ہونا چاہیے۔ تاکہ اساتذہ ہدایات سے اچھی طرح مستفید ہو سکیں۔ افسران معائنہ کو ہیڈ ماسٹر اور ان کے معاونین کی تکالیف کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ ان کا رویہ نہایت ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ تاکہ استاد ہوا سمجھنے کی بجائے انہیں اپنا ہمدرد سمجھیں۔ ہر سکول کے سال میں دو معائنے ہونا ضروری ہیں۔ ایک سالانہ اور ایک سرسری۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ہائی سکولوں کے سالانہ معائنہ کئی سالوں تک نہیں ہوتے۔ معائنہ کے وقت اساتذہ کو سبق پڑھاتے ہوئے دیکھا جائے اور ان کی رہنمائی کی جائے۔ معائنہ کے بعد میٹنگ میں ہیڈ ماسٹر اور عملہ کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا جائے اور افسران معائنہ کا انتخاب ایسے افراد سے کیا جائے جو تعلیم و تدریس میں اعلیٰ درجہ کی فنی قابلیت بھی رکھتے ہوں اور انتظامی صلاحیت کے مالک بھی ہوں۔

۲۶۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کی تعداد میں اضافہ:۔ تعداد طلبہ اور مدارس میں اضافہ ہونے اور دفتری کام کے بڑھ جانے کی وجہ سے اور ترقیاتی سکیموں کے کام کی وجہ سے اے۔ ڈی۔ آئی سکولز کا کام بہت بڑھ گیا ہے، اس کی تحویل میں زیادہ سے زیادہ پچاس مدارس ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ سکولوں کی

نگرانی کا کام بطریق احسن سرانجام دے سکے۔ ضلع کے صدر مقام پر ہر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے ماتحت مدارس کی تعداد چالیس سے زیادہ نہ ہو تاکہ دفتری کام میں وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کا ہاتھ بٹا سکے۔

۲۷۔ **ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے لیے خاص الاؤنس:۔** ڈسٹرکٹ انسپکٹر کا مقام بلحاظ فرائض ذمہ داری ضلع کے دیگر افسران و سربراہوں کے مقابلہ میں بہت اہم ہے۔ اس کی مصروفیات گوناگوں ہیں۔ اسے بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بلحاظ اہمیت عہدہ ضلع کے دوسرے افسران کے مقابلے میں اس کی تنخواہ نہایت کم ہوتی ہے۔ اس کے عہدے کا وقار بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہیڈ ماسٹر۔ انسپکٹر اور پرنسپل صاحبان کی طرح اسے بھی معقول الاؤنس یا سپیشل پے دی جائے۔ ہر ڈسٹرکٹ انسپکٹر اور ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کو کم ازکم بی۔ اے۔ ایس ہونا چاہیے۔ اور ابتدائی تنخواہ کم ازکم ۵۰۰ روپے ہو۔

۲۸۔ **ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے لیے سرکاری جیپ کا انتظام:۔** اگر سرکاری طور پر ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے لیے جیپ کا انتظام ہو تو وہ ضلع کے دور افتادہ اور پس ماندہ علاقہ کے مدارس کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکے گا۔

۲۹۔ **ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے لیے کیمپ کلرک:۔** جس طرح دوسرے محکمہ کے افسران دورہ پر کیمپ کلرک اپنے ہمراہ رکھ سکتے ہیں اسی طرح ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے لیے کیمپ کلرک کا دورہ پر ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی امداد سے سکولوں کے مختلف ریکارڈ اور فنڈوں کی پڑتال بہ آسانی ہو سکے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ڈاک کا کام ساتھ ساتھ دورہ پر ہوتا رہے گا۔ محض ڈاک کی خاطر اسے ہیڈ کوارٹر پر زیادہ دن نہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ نیز دیہاتی مدارس کی پہلے کی نسبت بہتر نگرانی ہو سکے گی۔

۳۰۔ **تعطیلات میں کمی:۔** دوران سال میں مدارس تخمیناً ۱۷۵ دن سالم اور ۷۰ نصف یوم۔ تقریباً ساڑھے چھ ماہ کھلے رہتے ہیں اور بقیہ ساڑھے پانچ ماہ میں دنیا کے چند دیگر ترقی یافتہ ممالک کے بچوں کی طرح ہمارے بچوں کے سامنے کوئی واضح مفید اور دلچسپ پروگرام وقت گذارنے کا نہیں ہوتا اور عملاً یہ ان کی تضیع اوقات ہے۔ میری رائے میں ہائی مدارس میں تعطیلات گرما چھ ہفتہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی تعطیلات کینسل ہوں تاکہ بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے حرف گیری بھی نہ ہو سکے اور تعلیم کا نقصان

بھی نہ ہو۔ اگر تعطیلات کچھ کم کر دی جائیں تو یقینی طور پر اس کا تعلیمی معیار پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ چھٹیوں کے کم ہو جانے کی وجہ سے اساتذہ ایک رعایت سے محروم ہو جائیں گے اور وہ اسے بہت محسوس کریں گے۔ لیکن ان کی تلافی یوں ہو سکتی ہے کہ ان کے پڑھانے کے اوقات کم ہو جائیں اور ان کو دیگر مراعات دی جائیں۔ اگر تعطیلات سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے والدین اور اساتذہ کے تعاون سے کوئی مفید اور منظم پروگرام عمل میں لایا جائے تو مناسب ہے۔

۳۱۔ نظامِ تعلیم میں یکسانیت:۔ ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بورڈ مدارس کے انتظام میں موجودہ دو عملی سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہو رہے۔ اصولی طور پر مجھے اس سے اتفاق ہے، کہ پبلک کے نمائندوں کو بلدیاتی اداروں کے چلانے کے لیے تربیت دی جائے۔ لیکن قوم کی پود کو ان کا تختۂ مشق بنانا ایک خطرناک تجربہ ہے۔ بہر نوع ممبران و افسران بورڈ آخر انسان ہیں۔ مقامی ہونے کی حیثیت سے انہیں اپنے مقامی مفاد کی نگہداشت کرنا پڑتی ہے۔ جمہوریت کے اس ابتدائی دور میں ووٹ لینے کی خاطر بعض اوقات اپنے علاقہ کے اساتذہ کے ناجائز تبادلوں کے لیے سفارش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس کا تعلیم پر خوش گوار اثر نہیں پڑتا۔

۳۲۔ ورنیکلر ہائی سکولوں کا اجرا:۔ انگریزی کی اہمیت کم ہونی چاہیے اور اردو کی اہمیت بڑھنی چاہیے۔ درجہ دہم تک طلبہ کے لیے اردو ضروری مضمون قرار دیا جائے اور انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت ہونی چاہیے۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد انگریزی کی اہمیت کم ہو جانی چاہیے تھی، باوجودیکہ انگریزی کو ایک بین الاقوامی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے اور اس زبان کے بولنے والوں کا عالمی سیاست پر غلبہ ہے، یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ بغیر کسی مقصد اور فائدے کے ہمارے طلبہ کی اکثریت کا بہت سا قیمتی وقت انگریزی پڑھنے میں صرف ہوتا ہے جس کا عملی طور پر انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اب چونکہ اردو اور بنگالی ہماری قومی زبان بن چکی ہیں۔ انگریزی کی افادیت اور بھی کم ہو گئی ہے۔ ان حالات میں انگریزی کا مضمون صرف ان طلبہ کے لیے لازمی ہونا چاہیے جنہیں ڈاکٹری یا انجینئرنگ ایسے پیشوں کو اختیار کرنا ہو۔ یا جو اعلیٰ اسامیوں اور سفارتی عہدوں کے امیدوار ہوں ضروری ہے کہ انگریزی پڑھنے والے امیدواروں کا انتخاب قابل اور ذہین طلبہ میں سے کیا جائے اور سابقہ دستور کے مطابق انگریزی کو پورا وقت دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عام طلبہ کا بہت سا وقت جو انگریزی پڑھنے میں

صرف ہوتا ہے۔ وہ دیگر مضامین از قسم اردو، حساب پر صرف ہوگا۔ اس طرح ان مضامین کی تعلیم کا معیار بلند ہو جائے گا یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ورنیکلر مڈل سکولوں کے نمونے پر ورنیکلر ہائی سکول بھی کھولے جائیں۔ یہاں ایک بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریزی مضمون لینے والوں کے انتخاب کا امتحان یا تو محکمانہ ہو، یا جماعت پنجم کے تمام امتحان محکمانہ ہوں۔ انگریزی پڑھنے کی اجازت صرف ان طلبہ کو دی جائے جو اس میں اچھے نمبروں میں پاس ہوں۔ اگر یہ احتیاط نہ برتی گئی تو اس بات کا خدشہ ہے کہ امرا اور افسر اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اپنے بچوں کو انگریزی کا مضمون دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور غریب طلبہ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ اختیاری انگریزی کا مضمون صرف ان طلبہ کو لینے کی اجازت ہو، جن کے نمبر اچھے ہوں۔ ان میں سے جو غریب بچے ہوں انہیں وظائف دیے جائیں۔

۳۳۔ **مڈل کلاسوں میں انگریزی کا معیار ترقی**:۔ اس وقت مڈل اور ہائی طبقہ کے انگریزی کے معیار میں بہت تفاوت ہے۔ اسے دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مڈل جماعتوں میں انگریزی کے معیار کو بلند کیا جائے۔ اور تقسیم کے قبل کے معیار کو بحال کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مڈل کلاسوں میں انگریزی کے پیریڈ زیادہ کرنے پڑیں گے اور نصاب میں بھی نمایاں تبدیلی کرنا پڑے گی۔ بالآخر کالج کی تعلیم پر بھی اس کا خوش گوار اثر پڑے گا۔

۳۴۔ **وظائف کی تعداد اور رقم میں ایزادی**:۔ مڈل سکول وظائف (جماعت پنجم پاس کرنے والوں میں سے وظیفہ خوار طلبہ) کی تعداد اب بھی تقریباً وہی ہے جو تیس پینتیس سال پہلے تھی اور رقم میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان ایام میں بھی چار روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ جب روپیہ کا سوا سیر گھی اور ڈیڑھ روپیہ فی من گندم اور اچھے سے اچھا کپڑا ۵ اور ۶ آنے گز مل جاتا تھا۔ روپیہ کی قیمت گھٹنے کی وجہ سے وظیفہ کی رقم میں متناسب اضافہ ضروری ہے۔ بجائے چار روپے ماہوار کے وظیفہ کی رقم کم از کم ۱۵ روپے ہونی چاہیے۔ اور تعداد وظائف میں بھی نمایاں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وظائف کی تعداد اور رقم میں اضافہ ہونے کی صورت میں تعلیم پر نہایت خوش گوار اثر پڑے گا۔ فیس کی رعایت ہر غریب طالب علم وظیفہ خوار کو ملنی چاہیے جو عام رعایت کے علاوہ ہو۔

۳۵۔ **ہیڈ ماسٹر مڈل سکول کے لیے سپیشل الاؤنس**:۔ اگر ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کی طرح

مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر کو بھی سپیشل پے یا الاؤنس دیا جائے تو کافی تعداد میں اچھے اساتذہ میسر آجائیں گے جو مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر کام کرنے کے لیے رضامند ہوں گے۔ اس وقت صرف وہی استاد مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر بننے کے لیے رضامند ہوتے ہیں جنہیں اپنے نواحی مڈل سکول میں لگایا جائے۔ اس منصب میں جب تک کشش نہ پیدا کی جائے گی ہمیں موزوں استاد نہ مل سکیں گے۔ ان کا الاؤنس ملبغ پچیس روپے ماہوار مقرر کیا جائے۔

۳۶۔ ٹیوشن کا سدِ باب :- عام شکایت ہے کہ اساتذہ سکول کے اوقات کے بعد زیادہ وقت ٹیوشن کرنے میں گذارتے ہیں اور مدرسہ میں اس قدر تھکے ماندے آتے ہیں کہ اپنا سبق پورے انہماک کے ساتھ نہیں پڑھا سکتے۔ یہ شکایت بھی عام ہے کہ بعض طلبہ کی ٹیوشن اساتذہ کرتے ہیں انہیں سالانہ امتحان میں ہر جائز و ناجائز طریقہ سے پاس کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ استاد اپنی جماعت کے طلبہ کو ٹیوشن رکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور جو طالب علم ان کی ٹیوشن نہیں رکھتے ان کی طرف توجہ نہیں دیتے اس دستور کا یکسر بند کرنا تقریباً محال ہے۔ لیکن بُرے نتائج سے بچنے کے لیے اس کا سدِ باب کسی حد تک اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ محکمہ کی طرف سے سکول کے اوقات کے بعد خواہشمند طلبہ کو اجتماعی طور پر اساتذہ کی طرف سے زائد وقت دینے کی اجازت دی جائے۔ اس سے استادوں کی مالی امداد بھی ہو جائے گی اور ہر امیر غریب لڑکے کی ٹیوشن کا کم خرچ پر انتظام ہو جائے گا۔ اور اساتذہ کی ذاتی دلچسپی کا سوال بھی پیدا نہ ہوگا اس کے لیے وقت کا تعین بھی ضروری ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت ٹیوشن کے لیے نہ دیا جائے۔ اساتذہ کے تنخواہوں کے اضافہ کی صورت میں ٹیوشن کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ بہرحال ٹیوشن کی بدعت معلمین تعلیم کے لیے دعوت فکر ہے۔

۳۷۔ اساتذہ کے لیے کتب کا مطالعہ :- عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ہاں کتب کے مطالعے کی بہت کم عادت ہے۔ ہمارے علم کی بنیاد وہی چند کتب ہوتی ہیں جو ہم سکول یا کالج میں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر تعلیمی رسائل اور تازہ ترین کتب کے پڑھنے کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ضروری ہے کہ ہم تمام بالخصوص تعلیمی اداروں کے نگران زائد مطالعہ کے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالیں۔ افسران معائنہ جہاں معائنہ

کے وقت اس امر کی پڑتال کرتے ہیں کہ طلبہ نے کتب لائبریری کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔ وہاں یہ بھی دیکھ لیں کہ اساتذہ نے کس حد تک ذاتی طور پر مطالعہ میں دلچسپی لی ہے۔

۳۸۔ **ہیڈ ماسٹر کے تدریسی کام میں کمی اور اس کی رہائش کا انتظام**:۔ اساتذہ کے کام اور ان کی ڈائریوں کا ملاحظہ تحریری کام کی پڑتال۔ تفریحی مشاغل اور غیر تدریسی مشاغل وغیرہ دیکھ بھال کرنا اور دفتری نظام چلانا ہیڈ ماسٹر کے فرائض میں شامل ہے۔ ان کی بجاآوری بطریق احسن تب ہی ہو سکتی کہ ہیڈ ماسٹر کے پاس تدریسی کام کم ہو اور یہ بھی سکول کے مفاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رہائش سکول کے نزدیک ہو جس کا انتظام متعلقہ گورنمنٹ یا متعلقہ لوکل باڈی کرے۔

۳۹۔ **تدوین نصاب**:۔ ایک نہایت اہم معاملہ جس کا تعلق تعلیمی معیار کو بلند کرنے سے ہے نصاب کی تدوین ہے۔ میں اس سلسلہ میں اظہار رائے کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ارباب اختیار تدوین نصاب کے لیے ماہرین تعلیم و نفسیات کی ایک کمیٹی مقرر کریں اور اس کمیٹی کو مواقع دیے جائیں کہ سکول کے طلبہ کی ذہانت اور یادداشت کا ترقی یافتہ طریقوں کے مطابق نہایت وسیع پیمانے پر تجزیہ کرے۔ اور پھر اسی سے معیار قائم کرے۔ تاکہ اوسط درجہ کی ذہانت کا طالب علم تعلیم کے مختلف درجات تک ضرور پہنچ جائے۔ اور پھر مختلف نصاب ہائے تعلیم کا انتخاب ایک ایسی کمیٹی کرے جس میں ماہرین نفسیات تعلیم کے تجربہ کار افراد اور اساتذہ شامل ہوں۔ اس طریق کار سے اساتذہ اور طلبہ کے سر سے نصاب کا غیر ضروری بوجھ اتر جائے گا اور بچے کی فطری صلاحیتیں ضائع نہیں ہوں گی۔ تعلیم عوام کے ماحول کے مطابق اور ان کی ضروریات اور مقاصد کے تحت ہونی چاہیے۔ اور نصاب روزمرہ کی ضروریات کی روشنی میں مرتب ہو۔

۴۰۔ **کتب کی قیمتوں میں کمی**:۔ پاکستان ایسے غریب ملک کا شہری جس کی اوسط ماہوار آمدنی بیس روپے سے بھی کم ہے۔ موجودہ نصابی اور امدادی کتب کی گراں قیمتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عوام میں تعلیم کو رواج دینے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ تعلیم ارزاں سے ارزاں تر ہو تاکہ دولت۔ تعلیم صرف خوش حال طبقہ میں ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نصابی اور امدادی کتب کی قیمتیں کم سے کم مقرر کی جائیں۔

۴۱۔ **فیکلٹی مجالس**:۔ شروع سال میں فیکلٹی مجالس کا منعقد کرنا نہایت ضروری ہے۔ تمام سال کی تعطیلات علیحدہ

کرکے تعلیمی ایام علیحدہ نکال لیے جائیں اور ان کے مطابق سلیبس کو مہینوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر مضمون کے سینئر اساتذہ ہر فیکلٹی کے صدر ہوں گے۔ اور ان سب سے بڑا کام یہ ہوگا کہ ششم سے دہم تک مضمون کے سلیبس کو اس طرح ترتیب دیں کہ وہی چیز ہر سال نہ پڑھائی جائیں اور ان کا کوئی ضروری حصہ بھی باقی نہ رہنے پائے علاوہ مضامین کی آپس میں مطابقت بھی ضروری ہے۔ بالخصوص انگریزی اور اردو مضمون نویسی میں جغرافیہ اور سائنس انگریزی۔ اور اردو اور فارسی گرامر میں۔

۲۴۔ مضامین میں کمی :۔ روزمرہ زندگی میں ہمیں جتنا حساب درکار ہے مڈل تک اس کی بخوبی تدریس ہو جاتی ہے۔ نہم اور دہم میں محض اس کا اعادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جیومیٹری اور الجبرا کے مضامین جنھیں موجودہ صورت میں پڑھایا جاتا ہے کا تعلق روزمرہ زندگی سے قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے یہ مضامین صرف ان طلبہ کو پڑھائے جانے چاہئیں جو خاص طور پر ان میں ذاتی دلچسپی رکھنے کے علاوہ ایسے شعبوں میں تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں جن میں فی الواقع ان علوم کی ضرورت ہے مثلاً انجینئرنگ وغیرہ۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ایسے دو چار فی صد طلبہ ہوں گے جنہیں ان مضامین میں دلچسپی ہوتی ہے اور جو آگے چل کر کالج میں ان مضامین کو پڑھیں گے۔ باقی نوے یا پچانوے فی صد طلبہ کو یہ مضامین صرف یہ امتحان پاس کرنے کی خاطر پڑھنے پڑتے ہیں جو بالعموم ان کو سمجھانے کی بجائے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں کیونکہ '' کا اکثر وقت حساب اور انگریزی میں صرف ہوتا اور دوسرے مضامین جن کا تعلق روزمرہ زندگی سے زیادہ ہے۔ ان کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔ پرائمری اور مڈل کے مضامین بہت زیادہ ہیں۔ بچوں کے دماغ پر اتنے مضامین پڑھنے سے بہت زور پڑتا ان درجات کے نصاب کو ہلکا کرنا ضروری ہے۔ درجہ پرائمری میں واقفیت عامہ کو اردو کا حصہ بنایا جائے

۲۵۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت اور رجحان معلوم کرنے کے لیے نفسیاتی جائزہ :۔ مدرسوں کی تعلیم کا موجودہ خاکہ جو لارڈ میکالے نے مرتب کیا تھا اور جس کا واحد مقصد کلرک پیدا کرنا تھا یکسر بدلنا چاہیے اور امریکہ میں اوائل عمر ہی سے بچوں کی ذہنی صلاحیت اور رجحان معلوم کرنے کے لیے متعدد نفسیاتی سائنٹیفک طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن پر بڑی کامیابی سے عمل کیا جا رہا ہے اور ان جائزوں سے پتا چلتا ہے کہ ان کے اندر کیسے کیسے چھپے ہوئے جوہر اور صلاحیتیں اوائل عمر ہی سے

لگتی ہیں۔ ان طریقوں سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے۔ اس طرح ایک بچہ اچھا طالب علم بن جاتا ہے۔ اور ایسے اچھے طلبہ بھی تعلیمی معیار کو اونچا کرنے کے لیے ممد ثابت ہوتے ہیں۔

۴۴ - **طالب علم کی خصوصیات** :- جہاں والدین، اساتذہ اور حکومت کا فرض ہے کہ معیار تعلیم کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ وہاں طلبہ کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے کام کی طرف پوری توجہ دیں۔ اچھے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ استاد سے پورے طور پر تعاون کرے۔ حصول علم کا جذبہ رکھے۔ محنتی ہو۔ پڑھنے لکھنے کا شوقین ہو۔ مودب اور سخت کوش ہو۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو جو اسے اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں استاد کی نگرانی اور رہنمائی میں بروئے کار لائے اور اپنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے استاد کی رہنمائی سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ جو ہدایات تعلیم کے سلسلہ میں استاد اسے دے ان پر پورے طور پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آجکل کے طالب علم ان خصوصیات سے عاری ہیں۔ اس ضمن میں یہ نہایت ضروری ہے کہ طلبہ سینما بینی، سگریٹ نوشی اور ہوٹل بازی کی قبیح عادات سے احتراز کریں۔

۴۵ - **کھیلوں کی طرف مناسب توجہ** :- کھیلوں کی افادیت سب پر عیاں ہے اور کردار کی تشکیل میں کھیل تعلیم کے مقابلے میں کچھ کم اہم نہیں۔ کھیل اور تعلیم لازم و ملزوم ہیں۔ بچے کی شخصیت کی مکمل نشوونما جماعت کے کمرہ اور کھیل کے میدان دونوں کی یکساں رہین منت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کھیلوں کی تنظیم مستقل اور وسیع بنیادوں پر کی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بجائے چند طلبہ کے جو ٹورنامنٹ جیتنے کی خاطر صرف ٹورنامنٹ کے انعقاد تک مختلف کھیل کھیلتے ہیں زیادہ سے زیادہ طلبہ کو کھیلوں میں سارا سال حصہ لینے کا موقع دیا جائے تمام طلبہ کے لیے پلے فار آل کا انتظام پندرہ بیس منٹ کے لیے سال بھر ہونا چاہیے۔

۴۶ - **مشاغل ماسوائے تدریس** :- بچے کی شخصیت کی نشوونما کی تکمیل کے لیے مشاغل ماسوائے تعلیم از قسم سکاؤٹنگ، کیمپنگ، ماس ڈرل، رائفل ٹریننگ، زائد مطالعہ، قلمی میگزین، بزم ادب وغیرہ کی طرف مناسب توجہ دینا ضروری ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک خطرہ سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے۔ [illegible] ان مشاغل کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے جس کا تعلیم پر خوشگوار [illegible] ضرورت سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے جس کا تعلیم پر خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ اگر ان مشاغل کی طرف [illegible]

متناسب توجہ دی جائے تو اس کا عام تعلیم پر اچھا اثر پڑے گا. ایک اور ضروری احتیاط جسے اس ضمن میں پیش نظر رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ان تمام مشاغل کو درسی اوقات کے علاوہ وقت دینا چاہیے۔ ضابطۂ تعلیم اور محکمانہ گشتوں میں اس کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں. تعلیم میں دلچسپی پیدا کرنے اور پیشہ ورانہ تعلیم سے شرم اور عار دور کرنے کے لیے تفریحی مشاغل کا اجرا بھی ضروری ہے۔

۴۷۔ **نئے مضامین کی طرف مزید توجہ دینا**:۔ نئی اسکیم کے مطابق تمام مضامین از قسم واقفیت عامہ دستی کام۔ عملی کام۔ فنونِ عملی اور دینیات کی طرف مناسب توجہ دینا نہایت ضروری ہے. عموماً ان مضامین کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے. نارمل سکولوں میں ان مضامین کی طرف خاص توجہ دی جانی چاہیے۔

۴۸۔ **سٹاف کی کمی کو پورا کرنا**:۔ تعداد طلبہ بڑھ جانے کی وجہ سے عام مدارس میں خصوصاً قصباتی مدارس میں مدرسین کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے. بعض مدارس میں ایک جماعت میں ستر اسی لڑکے ہوتے ہیں. لہذا ان کی طرف انفرادی توجہ دینا تو درکنار استاد کے لیے انھیں قابو میں رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ سٹاف کی کمی کو پورا کیا جائے (اس میں شک نہیں کہ عمارت. عملہ اور تدریسی سامان کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے. مدارس میں تعلیمی معیار کی پستی کا ایک بڑا سبب سامان. عمارت اور اساتذہ کی کمی ہے۔ بایں ہمہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ صحیح معنوں میں اپنے فرائض کا احساس رکھتے ہوں تو عمارت. سٹاف اور سامان کی کمی کے باوجود بہت کام کیا جا سکتا ہے. ذاتی تجربہ کی بنا پر اس نکتہ کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں. سات سال قبل میں گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ کا ہیڈ ماسٹر تھا. سکول میں بچوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی اور اساتذہ کی تعداد بائیس تئیس تھی جو ناکافی تھی. اساتذہ کی کمی کی وجہ سے جماعت پنجم کے صرف دو سکیشن تھے. باوجودیکہ ہر سکیشن کی تعداد ۸۴ تھی. سکول کا سالانہ معائنہ غالباً نومبر ۱۹۵۰ء میں کیا گیا. اس وقت پیرزادہ ایم. اے مخدومی صاحب ڈویژنل انسپکٹر ملتان نے سکول کا معائنہ فرمایا. میں انھیں پانچویں جماعت کے دونوں فریقوں کے پاس لے گیا جو کھلے میدان میں گھاس پر بیٹھے تھے. صاحب موصوف نے دونوں فریقوں کے طلبہ کا انگریزی کا امتحان خوب ٹھونک بجا کر لیا۔

اساتذہ متعلقہ کے کام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انھیں "گڈ انڈر سٹینڈنگ" دی. اس مثال سے

واضح ہے کہ ہر قسم کی کمی اور کئی مشکلات کے باوجود استاد بہت کچھ کر سکتا ہے

۴۹۔ سمعی اور بصری معاونت:۔ تعلیم کو موثر اور دلچسپ بنانے کے لیے یہ معاونات نہایت ضروری ہیں خصوصاً تختہ سیاہ کا استعمال۔ تصاویر۔ چارٹس۔ مفید سلائڈ اور جغرافیائی ماڈل اور نقشہ جات کا استعمال نہایت مفید ہے تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کی تدریس میں ان توضیحات کا استعمال سونے پر سہاگہ ہے۔

۵۰۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی تقرری:۔ ہمارے ملک کے اکثر مدارس میں ابھی غیر تربیت یافتہ اساتذہ کافی تعداد میں کام کر رہے ہیں خصوصاً مشرقی بنگال، اور سابق صوبہ سندھ۔ سرحد اور بلوچستان میں ٹرینڈ اساتذہ کی بے حد کمی ہے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی بجائے تربیت یافتہ اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔

۵۱۔ تبادلہ جات:۔ دوران سال اساتذہ کے تبادلے بھی تعلیم کے انحطاط کا ایک سبب ہیں۔ بے وقت تبادلوں کی وجہ سے مدرسین دلجمعی سے کام نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ان پر پورے طور پر ذمہ داری عائد کی جا سکتی ہے حتی الامکان تمام تبادلے شروع سال میں ہونے چاہئیں۔ عام حالات میں ایک مدرس کو ایک مدرسہ میں تین سال کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

۵۲۔ سامان مدرسہ:۔ تدریس سے متعلق ہر قسم کا سامان بالخصوص سامان سائنس ادارہ کی ضروریات کے مطابق مہیا کیا جائے۔ بعض بورڈ مدارس میں سامان مدرسہ کی شدید قلت ہے۔

۵۳۔ عمارات مدرسہ:۔ اکثر دیہاتی مدارس کی عمارتیں ہر لحاظ سے غیر موزوں ہیں۔ قصباتی مدارس میں بھی عمارات کی کمی کی عام شکایت ہے۔ اچھی تعلیم کے لیے مناسب عمارت کا ہونا ضروری ہے۔ سردی اور بارش کے موسم میں کمرے میں تعلیم دینا ضروری ہے۔ باہر کھلی جگہ پر بیٹھنے سے طلبہ کی توجہ بھی ادھر ادھر بٹتی ہے۔ اگر عوام گورنمنٹ سے تعاون کریں تو یہ مسئلہ تسلی بخش طریقہ سے حل ہو سکتا ہے۔ کسی بستی یا شہر کے عوام اجتماعی کوشش سے مدرسہ کی عمارات آسانی سے بنوا سکتے ہیں۔ پختہ کمروں کی بجائے چھپر بھی بخوبی کام دے سکتے ہیں۔ اور ان پر خرچ بھی متقابلۃً بہت کم آئے گا۔

۵۴۔ انگریزی کی اہمیت کو کم کرنا:۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مختلف امتحانات کے فیل شدہ

طلبا کی اکثریت ان طلبہ کی ہوتی ہے جو محض انگریزی میں فیل ہوتے ہیں اور ایسے فیل شدہ طلبہ کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے جو انگریزی میں تو پاس ہو جاتے ہیں لیکن اسے اتنا زیادہ وقت دیتے ہیں کہ دوسرے اہم مضامین کی تیاری پوری طرح نہیں کر سکتے اور ان مضامین میں فیل ہو جاتے ہیں۔ ان مختلف امتحانات میں فیل شدگان پر ڈھائی کروڑ کی رقم خطیر ہر سال ضائع ہوتی ہے۔ اس ہولناک قومی نقصان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی کو سکول اور کالج کے نصاب میں غیر ضروری طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کالج میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کی تعداد کا صرف ایک چوتھائی حصہ ہے۔ ان تین چوتھائی طلبہ کو جنہیں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرنا ہوتی انگریزی کی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ تمام وقت جو انگریزی کی تعلیم پر ضائع کرتے ہیں۔ دوسرے مضامین کی تیاری پر صرف کریں تو تعلیمی معیار بلند ہو جائے گا۔ اردو اور بنگالی کے قومی زبان بن جانے سے انگریزی کی اہمیت کم ہونا چاہیے تھی۔ اگر ہم ذرا سوچ بچار سے کام لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مختلف محکموں کے دفاتر میں کوئی بھی کام ایسا نہیں جو انگریزی کے بغیر سرانجام نہ دیا جا سکے ماہرین تعلیم و نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی ذہنی صلاحیتوں کی ترقی کے لیے اشد ضروری ہے کہ اسے اپنی زبان میں تعلیم دی جائے۔ انگریزی ایسی مشکل اور دقیق غیر ملکی زبان کے سیکھنے سے بچے کی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس سے بچے کے دماغ پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔

۵۵۔ **انتخاب استاد:۔** اس میں شک نہیں کہ اہم ترین مسئلہ استاد کا انتخاب ہے۔ ایک فرض شناس، قابل دیانتدار اور محنتی استاد بجائے چالیس کے سکشن کے ساٹھ طلبا والے سکشن کو بھی کامیابی کے ساتھ پڑھا سکتا ہے۔ اور تعلیم کرہ کے باہر کھلے میدان میں بھی تسلی بخش طور پر دے سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بہترین عمارت اور نہایت اعلیٰ قسم کا فرنیچر ہو، اور دوسرے لوازمات بھی بہترین ہوں۔ بہترین تدریس ایک جھونپڑے میں بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ مدرس اہل اور موزوں ہو۔ اور تدریس کا پُرخلوص جذبہ رکھتا ہو۔ لہٰذا ازبس ضروری ہے کہ سب سے زیادہ توجہ معلم کے انتخاب کی طرف دی جائے۔ اس اہم اور مقدس پیشہ کو جس کا درجہ سماج میں گر چکا ہے اور جس کی طرف رغبت بہت کم ہے اسی صورت میں قابل عزت اور افتخار بنایا جا سکتا ہے جبکہ مدرس کا انتخاب بہترین ہو اور اس کا مشاہرہ معقول ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ کی قابلیت و دیگر صلاحیتوں کا معیار بلند

عاجائے۔ اس کا حل یہی ہے کہ ان کا معیار بلند کیا جائے، اس صورت میں یہ پیشہ خود بخود دلکش بن جائے گا۔

آخر میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ ہم سالہا سال سے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ لیکن من حیث الجماعت پنے فرائض کی ادائیگی اور پیشے کی توقیر کے احساس کو ابھارنے کے لیے ہم نے اتنا کام نہیں کیا جتنا کرنا چاہیے تھا ہاں ہمیں حقوق کی جنگ جاری رکھنا چاہیے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور سماج ں اپنے اعلیٰ مقام کا احساس ہو۔ سماج میں بلند مقام اور وقار صرف روپے پیسے سے ہی حاصل نہیں ہوتا ہ محنت دیانتداری، رواداری، احساس ذمہ داری، فرض شناسی، بلند کرداری اور ایثار سے حاصل ہوتا ہے ہ ہم یہ اوصاف بدرجہ اتم پیدا کرلیں تو تمام دشواریوں کے باوجود جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، ہم معیار تعلیم کو بلند یے اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہیڈ ماسٹر صاحبان اور نران معائن پہ زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں عوام پہ بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا تجاویز سے چند اہم تجاویز کو عملی امہ پہنانے کے لیے خطیر رقوم درکار ہیں جن کا اکٹھا کرنا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن میری رائے میں تعلیمی قی کے لیے قوم یہ زائد خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی ؛

جغرافیہ (جماعت چہارم)

انور علی قریشی

جغرافیہ کی تعلیم بچوں کو دینے سے، بچے گھر بیٹھے ہی ملک کی سیر کر سکتے ہیں. کیونکہ ملک کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے تجارتی کاروبار میں کافی مدد مل سکتی ہے. ترقی یافتہ ملکوں کی واقفیت حاصل ہونے سے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے. اس لیے جغرافیہ کی تعلیم کو پرائمری حصہ میں نظر انداز کرنا بڑی بھاری غلطی ہے جس کی وجہ سے بچے بہت خسارہ میں رہتے ہیں. کیوں کہ آج کے بچے کل کی قوم ہیں، ان میں اکثر بچے ایسے ہوں گے جن کی تعلیم صرف پرائمری تک ہی رہے گی اور وہ بڑے ہو کر دنیاوی کاروبار میں مصروف ہو جائیں گے جو جغرافیائی علم نہ ہونے کی وجہ سے بہت خسارہ میں رہیں گے. جو ایک قوم بننے والے ہیں تو جب تک قوم ترقی نہ کرے گی ملک کا ترقی کرنا ناممکن ہے. اس لحاظ سے بچوں کو جغرافیہ کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہے. جو آسانی سے کئی طریقوں سے بچوں کو دی جا سکتی ہے. مثلاً بذریعہ نقشہ جات. ماڈل. سوالاً جواباً وغیرہ.

جہاں تک مجھے تجربہ ہے بچوں کو کوئی بھی تعلیم دی جائے آسان سے مشکل کی طرف چلنا چاہیے. معلوم سے نامعلوم کی طرف چلنا چاہیے: تاکہ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو اور وہ شوق سے تعلیم حاصل کریں. کیوں کہ بچے اپنے گاؤں کے حالات سے واقف ہوتے ہیں. اپنے ضلع کے حالات کی سدھ بدھ سابقہ جماعت میں ہو چکی ہے انہیں حالات کے ماتحت جماعت چہارم کو جغرافیہ کی تعلیم دی جا سکتی ہے. مثلاً ملک کے پیشے. زراعت. مکھن اور پنیر کی صنعت. دستکاریاں. کارخانے. معدنیات. ذرائع آمد و رفت. ذرائع آب پاشی. پیداوار. تجارت. پن بجلی وغیرہ.

پیشہ:- کیوں کہ ہر انسان کو اپنی روزی پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے. اس لیے جو کام وہ کرتا ہے وہ اس کا پیشہ ہے. مثلاً کسان اناج پیدا کرتا ہے. جولاہا ہمارے لیے کپڑے بنتا ہے. موچی جوتے تیار کرتا ہے معمار ہمارے لیے مکان تیار کرتا ہے. بڑھئی لکڑی کی چیزیں بناتا ہے. بہت سی چیزیں کارخانوں میں تیار ہوتی ہیں.

س لحاظ سے ہمارے ملک کے پیشے مندرجہ ذیل ہیں۔

دیہاتی لوگوں کے پیشے:- کاشتکاری۔ جوتے بنانا۔ مٹی کے برتن بنانا۔ کپڑا بننا۔ لوہے کی چیز بنانا۔ تیل نکالنا۔ لکڑی کی چیزیں بنانا۔ کپڑے دھونا۔ بھیڑ بکری پالنا۔

شہر کے لوگوں کے پیشے:- زرگری۔ معماری۔ کپڑے دھونا۔ لوہے کی چیزیں بنانا۔ لکڑی کی چیزیں بنانا۔ تجارت کرنا۔ قالین اور غالیچے بنانا۔ جلدسازی۔ کارخانوں میں سوتی اونی کپڑے بننا۔ اخبار بیچنا۔ پنسل۔ کانسی۔ تانبے کے برتن بنانا۔ ملازمت۔ مزدوری۔

پہاڑی لوگوں کے پیشے:- پہاڑی لوگوں کے پیشے بتانے کے لیے استاد کو پہاڑی ماڈل تیار کر کے بچوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے جس میں درختوں کے چھوٹے چھوٹے پودے لگائے ہوئے ہوں۔ بھیڑ بکریوں کی تصاویر۔ چھوٹی چھوٹی کھیتیاں سیڑھیوں کی شکل میں اگائی ہوئی دکھائیں جہاں پہاڑی میں کچھ زمین نرم ہو۔ اب بچوں کو پہاڑی لوگوں کے پیشے بتانا کوئی مشکل نہیں۔ وہ بتا سکیں گے۔ لکڑی کاٹنا۔ بھیڑ بکریاں پالنا۔ کمبل دریاں بننا۔ اگر کوئی پیشہ بچے نہ بتا سکیں تو استاد خود بتا دے۔

زراعت:- ہمارے صوبہ میں نصف سے زیادہ لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں اور وہاں کا زیادہ تر پیشہ کاشتکاری ہے کیونکہ میدانی علاقے کی زمین بہت زرخیز ہے۔ آب و ہوا بھی کاشتکاری کے لیے موزوں ہے آب پاشی کا اچھا انتظام ہے جس کی وجہ سے ہر قسم کی پیداوار کافی ہوتی ہے جو تمام پاکستان کی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں میں بھیجی جا سکتی ہے۔

پھلوں کی کاشت:- جس میں رس دار پھل شامل ہیں۔ مالٹا۔ سنگترہ۔ لیموں۔ میٹھا۔ انگور۔ ناشپاتی۔ آم میدانی حصے میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ انگور۔ آلوبخارا۔ انار۔ سردا۔ سرحدی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کھجور میدانی حصوں کے اکثر علاقوں میں یعنی ملتان۔ مظفر گڑھ۔ سکھر وغیرہ میں ہوتی ہے۔

مکھن اور پنیر کی صنعت:- گاؤں میں لوگوں کے گھروں میں بھی یہ چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ مگر حکومت نے اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے چند سرکاری ڈیری فارم کھول رکھے ہیں، جہاں عمدہ نسل کی گائیں بھینسیں پالی جاتی ہیں انھیں دیکھ کر اور لوگوں نے بھی لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور۔ کوئٹہ وغیرہ میں ڈیری فارم کھول رکھے ہیں۔

دست کاریاں :- جو کام ہاتھوں سے کیا جائے اسے دست کاری کہتے ہیں۔ جب بچوں کو یہ بتا دیا جائے گا وہ بہت سی دست کاریاں خود ہی بتا دیں گے۔ مثلاً چاقو۔ چھریاں۔ تالے۔ مٹی کے برتن بنانا۔ جو دست کاریاں وہ نہ بتا سکیں وہ استاد خود بتا دے۔ مثلاً کھدر بننا۔ اونی کمبل اور قالین بنانا۔ جرابیں اور سوئٹر بننا۔ لوہے کے صندوق۔ تانبے۔ پیتل۔ کانسی۔ ایلومینیم وغیرہ کے برتن بنانا۔ لکڑی کا کام۔ فرنیچر۔ کھیلوں کا سامان وغیرہ۔

کارخانے :- بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں کارخانے پائے جاتے ہیں۔ جو آٹا پیسنے۔ کپاس صاف کرنے۔ اونی سوتی کپڑا بننے۔ کھانڈ بنانے۔ سیمنٹ بنانے۔ دیا سلائی۔ شیشے کا سامان بنانے کے کارخانے ہیں۔

آٹا پیسنے کے کارخانے :- لاہور۔ لائل پور۔ گجرات۔ شاہدرہ۔ ملتان یہ کارخانے ہیں۔

کپاس صاف کرنے کے کارخانے لائل پور۔ منٹگمری۔ لاہور میں ہیں۔ اونی کپڑا تیار کرنے کے کارخانے۔ کوئٹہ کراچی۔ گوجرانوالہ شاہدرہ وغیرہ میں قائم ہیں۔ سوتی کپڑا بننے کے کارخانے شاہدرہ۔ لائل پور۔ اوکاڑہ۔ لاہور رحیم یار خاں میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح کھانڈ تیار کرنے کے کارخانے۔ راہوالی ضلع گوجرانوالہ اور مردان میں اور سیمنٹ کا کارخانہ۔ واہ۔ ڈنڈوت۔ حیدر آباد میں ہیں۔ دیا سلائی بنانے کے کارخانے شاہدرہ اور خیر پور میں۔ شیشے کی چیزیں بنانے کے کارخانے گکھڑ ضلع گوجرانوالہ۔ حیدر آباد۔ سکھر۔ سرگودھا اور گجرات میں ہیں۔ جن جگہوں پر یہ کارخانے پائے جاتے ہیں بچوں کو نقشہ پر یہ مقامات استاد خود دکھائیں۔

معدنیات :- نمک۔ پتھر کا کوئلہ۔ مٹی کا تیل وغیرہ بچوں کو دکھا کر استاد کو بتانا چاہیے کہ ایسی چیز جو زمین سے نکالی جاتی ہے اسے معدنیات کہتے ہیں۔ اور جہاں سے نکالی جائے۔ اس جگہ کو اس چیز کی کان کہیں گے۔ بعد میں کانوں کے مقامات نقشہ پر دکھائے جائیں۔

ذرائع آمد و رفت :- ریلیں اور کچی پکی سڑکیں جو آمد و رفت کا پسندیدہ ذریعہ ہیں۔ اور جن کا ہمارے صوبے میں جال بچھا ہوا ہے۔ کچی سڑکیں تو صرف دیہاتوں میں ہیں جن پر آمد و رفت بہت کم ہوتی ہے اور گاؤں کے لوگ گدھوں اور چھکڑوں پر اپنی پیداوار شہر کی منڈیوں میں لاتے ہیں۔ صوبے کے تمام شہر اور قصبے پکی سڑکوں اور ریلوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں آسانی سے سامان لایا جا سکتا ہے۔

ذرائع آبپاشی :- چوں کہ کاشت کاروں کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس لیے وہ بتا سکتے ہیں کہ کنوئیں اور نہریں آب پاشی کا ذریعہ ہیں۔ باقی ذرائع استاد کو بتانے چاہئیں اور ذرائع آب پاشی کی وجہ بھی بچوں کو بتائی جائے۔ کہ بارش کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کنوؤں نہروں۔ ٹیوب ویل۔ کاریز۔ اور تالابوں کے ذریعہ کھیتوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے صوبہ کی نہروں کے نام۔ جس جس مقام سے نکالی گئیں اور جس جس دریا سے لی گ
اور جن علاقوں کو سیراب کرتی ہیں مندرجہ ذیل نقشہ سے بتائی جائیں۔

	نام نہر	کس مقام سے نکالی گئی	کس دریا سے نکالی گئی	کون سے علاقے کو سیراب کرتی ہے
۱	اپر باری دوآب	مادھوپور	دریائے راوی	تقریباً سارا حصہ لاہور کے علاقہ کو سیرا
۲	لوئر باری دوآب	بلوکی	دریائے راوی	ضلع منٹگمری اور ملتان کے علاقے
۳	اپر چناب	مرالہ	دریائے چناب	سیالکوٹ۔ گوجرانوالہ۔ شیخوپورہ کے ع
۴	لوئر چناب	خانکی	دریائے چناب	گوجرانوالہ۔ شیخوپورہ۔ لائل پور۔ جھنگ
۵	اپر جہلم	منگلا	دریائے جہلم	اس سے بجلی پیدا کی گئی ہے۔
۶	لوئر جہلم	مونگ رسول	دریائے جہلم	جھنگ اور سرگودھا کے علاق

ایسی نہریں جو زمین کے اندر چھپی رہتی ہیں انہیں کاریز کہتے ہیں۔ یہ نہریں بلوچستان میں بنائی گئی ہیں

پیداوار :- جب بچوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گاؤں کی پیداوار کیا ہے تو بچے خود بخود بتا دیں گے کہ گیہو جو۔ چنے۔ چاول۔ مکی۔ جوار۔ باجرہ۔ توریہ۔ تل۔ سرسوں۔ گنا۔ ماش۔ مونگ۔ موٹھ۔ اس کے بعد استاد انہیں بتائے ہے کہ تمام صوبہ میں ایسی پیداوار ہے۔ کیوں کہ ہمارے صوبہ کی زمین بہت زرخیز ہے اور ذرائع آبپاشی بھی کا ہے۔ اس لیے ایسی اجناس کی کافی پیداوار ہے۔

تجارت :- چوں کہ ہمارے صوبہ میں پیداوار کافی ہوتی ہے جو اپنے صوبہ کی ضرورت کو پورا کر کے دوسر ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ تجارت دو قسم کی ہوتی ہے نمبر۱ صوبے کے اندر کی تجارت نمبر۲ غیر ملکوں سے تجار

صوبے کے اندر کی تجارت :- گاؤں سے لوگ شہروں میں دودھ۔ گھی۔ اناج۔ لکڑیاں وغیرہ لاتے ہیں۔ اور شہروں سے اپنی ضرورت کی چیزیں مثلاً کپڑا۔ صابن۔ نمک۔ شیشے کا سامان۔ پیتل۔ تانبے

برتن وغیرہ لے جاتے ہیں ۔

غیر ملکوں سے تجارت :۔ گیہوں ۔ روئی ۔ تیل نکالنے والے بیج اور کھالیں ۔ پٹ سن ۔ نمک ۔ دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے ۔ اسے اشیائے برآمد کہتے ہیں ۔ اور دوسرے ملکوں سے سوتی کپڑا ۔ اونی کپڑا ۔ انجن موٹریں ۔ سائیکل ۔ کاغذ ۔ دوائیاں ، مشینیں اور شیشے کا سامان منگوایا جاتا ہے ۔ جسے اشیائے درآمد کہتے ہیں ۔ مشرقی بنگال میں چونکہ دریائے برہم پترا اور گنگا بہتے ہیں اور ان کا ڈیلٹا بھی مشرقی بنگال میں ہے جہاں دونوں دریا بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو کر سمندر میں گرتے ہیں ۔ برسات کے موسم میں ان دریاؤں میں جب سیلاب آتا ہے تو اس کا پانی ہر طرف پھیل جاتا ہے اور ملک کے جنوبی حصے میں بہت سی زمین میں دریاؤں کا پانی ہر سال مٹی کی نئی تہ بچھا دیتا ہے ۔ اس لیے کہ ہر سال بہت عمدہ پٹ سن پیدا ہوتی ہے جو تمام دنیا کی پیداوار کا اسی فی صد ہے چونکہ یہ فصل موسم گرما کی ہے جو کاٹنے کے بعد اس کے پودے بہت دنوں تک جوہڑوں اور تالابوں میں ڈبوئے جا سکتے ہیں ۔ مشرقی پاکستان میں کروڑوں روپوں کی پٹ سن پیدا ہوتی ہے ۔ جس سے بوریاں ، ٹاٹ ، چٹائیاں تیار کی جاتی ہیں ۔

پن بجلی :۔ پاکستان میں کوئلہ کی کمی ہے اور کارخانوں کو چلانے کے لیے یہاں کوئلہ کافی نہیں ۔ اس لیے کارخانوں کو چلانے کے لیے پن بجلی تیار کی گئی ہے نمبر ۱ مالاکنڈ کی پن بجلی ۔ یہ پن بجلی شمال مغربی حصے میں پشاور اور اس کے قصبوں کے لیے مہیا کی گئی ہے نمبر ۲ درگئی کی پن بجلی نمبر ۳ رسول کی پن بجلی جو گجرات گوجرانوالہ ۔ لاہور ۔ لائل پور کے لیے مہیا کی گئی ہے ۔

مغربی پاکستان :۔ بچوں کو صوبہ مغربی پاکستان کا نقشہ دکھایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اسے مغربی پاکستان کیوں کہتے ہیں ۔ چونکہ ہمارے ملک کے دو حصے ہیں جو کافی فاصلے پر ایک دوسرے سے مشرق اور مغرب میں واقع ہیں جس حصے میں ہم ہیں وہ مغرب میں ہے ۔ اس لیے اسے مغربی پاکستان کہتے ہیں ۔ ہمارا صوبہ رقبے میں بہت بڑا ہے ۔ اس کے جنوب میں سمندر ہے اور کراچی کی مشہور بندرگاہ اس کے ساحل پر ہے اور دوسرے حصے کو مشرقی پاکستان کہتے ہیں اور اس کے مشرقی حصے کے ساتھ ہندوستان کا ملک ہے اور شمال مشرق میں کشمیر کی ریاست

کمشنری :- اس کے بعد بچوں کو نقشہ کی طرف متوجہ کرکے بتایا جائے کہ ہمارے صوبے کے اندر جو الگ الگ حصے بنے ہوئے نظر آتے ہیں علیحدہ علیحدہ رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہماری حکومت نے انتظام کی غرض سے اس صوبہ کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک حصہ کو کمشنری یا قسمت کہتے ہیں، اور ان کے نام بھی بتائے جائیں۔

بچوں کو ہر روز جتنا جتنا جغرافیہ پڑھایا جائے، اتنے ہی سوال انہیں یاد کرانے کے لیے دیے جائیں اور انہیں اگلے روز ہر ایک لڑکے سے سن لیا جائے۔ تاکہ پڑھایا ہوا سبق ہر روز یاد ہوتا رہے۔ اس طرح بچوں میں کاہلی اور سستی پیدا نہ ہوگی۔ جغرافیہ پڑھاتے وقت نقشہ کا استعمال ضروری ہے اور جہاں کوئی ماڈل پیش کرنا ہو وہاں ماڈل پیش کرکے تعلیم دی جائے جو اسی وقت یاد ہو جائے گی اور اس کا اثر بھی دیرپا ہوگا اور بچوں میں دلچسپی بھی پیدا ہوگی۔

(نمبرا) جب بچے جغرافیہ کا کچھ حصہ پڑھ چکیں تو انہیں ہر روز ایک ایک سوال یاد کرنے کے لیے دیا جائے اور اگلے روز استاد ہر ایک لڑکے سے اس سوال کو سن لے نمبر ۲ :- بچوں کو گروہوں میں تقسیم کرکے بھی سوال سنا جا سکتا ہے جو بہت کم وقت میں تمام بچے سنا سکیں گے نمبر ۳ بچوں کو رول نمبر کے مطابق بھی یاد کرنے کے لیے سوال دیے جا سکتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ نمبر ایک کو پہلا سوال۔ نمبر ۲ کو دوسرا۔ نمبر ۳ کو تیسرا۔ اسی طرح تمام طلبا کو سوال دیے جائیں اور اگلے روز اسی طرح وہی سوال سن لیے جائیں۔ اگلے روز کے لیے پھر نمبر ایک کو جغرافیہ کا دوسرا سوال نمبر دو کو تیسرا۔ نمبر ۳ کو چوتھا سوال دیا جائے اور آخری لڑکے پر جغرافیہ کا پہلا سوال آجائے گا۔ اس طرح سال بھر میں جغرافیہ کا کافی اعادہ ہو جائے گا۔

بچوں کو جغرافیہ کا سبق پڑھانے کے بعد نقشہ کی کاپی پر نقشے بنوائے جائیں اور انہیں پُر کیا جائے پہلے استاد تختہ سیاہ پر نقشہ خود بنائے مثلاً ریلیں اور پکی پکی سڑکیں۔ پیداوار۔ دریا اور نہریں۔ معدنیات کارخانے بڑے بڑے شہر اور قصبے وغیرہ۔ جب استاد نقشہ بنا چکے تو بعد میں لڑکے یہ نقشہ اپنی کاپی پر بنائیں اور استاد بچوں کی اصلاح کرے۔ اس طرح سابقہ سبق کا اعادہ ہوتا رہے گا۔

معلوماتِ عامہ

انسدادِ جرائم کے لیے علمی اجتماع

مشرقِ بعید میں جرائم کے انسداد اور مجرمین کی اصلاح کے لیے اقوام متحدہ کا دوسرا علمی اجتماع حال ہی میں بمقام ٹوکیو منعقد ہوا جس میں علوم جرم و سزا سے متعلق تقریباً اسّی ماہرین شریک ہوئے تھے۔ یہ سیمینار ۱۵ نومبر کو شروع ہو کر، دسمبر کو ختم ہوا۔ عصمت فروشی۔ نوجوانوں کی بے راہ روی۔ قیدیوں کی اصلاح اور جیلوں میں کام لینے کے اقتصادی عناصر ایجنڈے کے خاص موضوعات تھے۔

ساٹھ ملکوں کے نمائندے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ کے مخصوص اداروں مثلاً اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے، بین الاقوامی ادارہ عمال اور متعدد غیر سرکاری اداروں نے جو ان مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اپنے مبصرین بھیجے۔ یہ اجتماع حکومت جاپان کی وزارت انصاف کے مشیر خاص ڈاکٹر ریسچرو اونزاو اور اقوام متحدہ کے شعبہ امور معاشرت کے ایک افسر ڈاکٹر ایڈورڈ گالوے کی نگرانی میں ہوا۔

لندن پروبیشن سنٹر کے ایک افسر اعلیٰ مسٹر سیلس فارمر نے آزمائشی نظام اور بے راہ نوجوانوں کی اصلاح کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا۔ کولمبو (سیلون) کے کمشنر جیل خانہ جات مسٹر وی این پلائی اور وٹس ول انسٹی ٹیوٹ برن (سوئٹزرلینڈ) کے ڈائرکٹر مسٹر کیلر بالمر اس کوشش میں ہیں کہ جیل خانوں میں کیے جانے والے کام اور قومی اقتصادیات میں رابطہ قائم ہو جائے۔

پاکستان (لاہور) کے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات، لفٹنٹ کرنل بشیر احمد، منیلا کے ڈائرکٹر جیل خانہ جات ڈاکٹر الفریڈو ٹینیبے نے اصلاح مجرمین کے موضوع پر اظہار خیالات کیا۔ ڈاکٹر گوری بنرجی نے جو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز میں پروفیسر ہیں، عصمت فروشی کی روک تھام پر اور ویبل تھاوٹ نے نوجوانوں کی بے راہ روی کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بہت سی حکومتوں نے جن میں جاپان۔ برما۔ جمہوریت کوریا۔ جمہوریت انڈونیشیا۔ جمہوریت چین۔ فلی پین

اور ہانگ کانگ شامل ہیں اپنے علاقوں کے حالات پر بیان دیے۔ ان ملکوں کے نمائندوں نے علمی اجتماع میں حصہ لیا۔ پاکستان۔ افغانستان۔ برما۔ لے اوس۔ ملایا۔ شمالی بورنیو۔ فلپین۔ سنگاپور۔ تھائی لینڈ۔ جاپان۔ کمبوڈیا سیلون۔ ہانگ کانگ۔ بھارت۔ انڈونیشیا۔ جمہوریت کوریا اور ویت نام۔

یہ کانفرنس ٹوکیو کے ایک نوتعمیر ہال۔ سانکئی کیکان میں منعقد ہوئی جس کا نقشہ چھوٹے پیمانے پر اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی ہال سے ملتا جلتا ہے۔ جاپان کے عوام اور صحافیوں نے اس اجتماع میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ اجلاس کے دوران میں اور اس کے بعد شرکائے اجلاس نے جیلوں اور اصلاحی اداروں کا دورہ کیا۔

یونی سیف کی سائنسی خدمات

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کے ڈائرکٹر برائے ایشیا مسٹر ایس۔ ایم کینی نے بحرالکاہل کی نویں سائنسی کانگریس میں جس کا اجلاس آج کل بنکوک میں ہو رہا ہے، حاضرین کو بتایا کہ اس ادارے سے سائنس کو بڑا فائدہ پہنچا ہے اور اس نے خاص طور پر غذائی ترقی پنسلین کی پیداوار اور عملے کی تربیت پر توجہ دی ہے اس کے علاوہ یونی سیف کی امداد سے صحت و تندرستی کی اجتماعی مہمیں سر کی گئی ہیں جن سے صحت عامہ پر بہت عمدہ اثر پڑا ہے۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ صرف ایشیا میں تپ دق سے محفوظ کرنے کے لیے ۱ کروڑ ۲۰ لاکھ بچوں کے بی سی جی کے ٹیکے لگائے گئے ہیں اور دس کروڑ ۷۰ لاکھ انسانوں کو خارش سے بچایا گیا ہے۔

مسٹر کینی نے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ بحرالکاہل کے علاقوں کی سائنسی ترقی میں یونی سیف نے کس حد تک حصہ لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس ادارے نے غذائیت کے ضمن میں خاص دلچسپی پیدا کی ہے اور ان ملکوں میں جہاں لحمی اجزا رکھنے والی غذاؤں کی کمی تھی ان کے استعمال پر خاص زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کمی کو کس طرح پورا کیا جائے۔

انہوں نے انکشاف کیا کہ یونی سیف کو روک فیلر فاؤنڈیشن سے پہلی بار دو لاکھ ۵۰ ہزار کا عطیہ ملا ہے اس میں سے کچھ رقم ایشیا میں غذائی تجربہ گاہیں قائم کرنے کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ خود یونی سیف نے بھی اس ضمن میں ایک لاکھ ڈالر دینے کا فیصلہ کیا ہے

انڈونیشیا میں یونی سیف نے ادارۂ خوراک و زراعت کے ساتھ مل کر لوبیا، مٹر اور دوسرے اناجوں سے دودھ کا سفوف تیار کرنے والے کارخانوں کے قیام میں مدد کی ہے۔ یہ سفوف اصل دودھ کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے اسی طرح ان دونوں نے مل کر بھارت میں بھینس کے دودھ کو خشک کرنے کا کارخانہ قائم کر دیا ہے۔

مسٹر کیمنی نے بتایا کہ یونی سیف نے طبی عملے کو تربیت دینے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ تاکہ دیہی علاقوں میں کام کرنے کے لیے مستند کارکن میسر آجائیں۔ اس نے ۹ لاکھ ۳۰ ہزار ڈالر کا عطیہ دے کر کلکتہ کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں جو صحت و تندرستی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک طبقاتی تربیتی مرکز کھولا ہے۔ بھارت میں پنسلین کے پہلے کارخانے کو بھی یونی سیف نے ۸ لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر کے آلات اور سامان وغیرہ فراہم کیا ہے۔

نئی سائنسی تحقیقات کی بدولت جذام، تپ دق، ملیریا اور امراض چشم کے خلاف اجتماعی مہموں کو سر کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ ایشیا میں کسی نئی دوا کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی اچھی طرح آزمائش کر لی جائے۔ اس مقصد کے لیے بھی یونی سیف نے آلات و سامان کی فراہمی میں مدد کی ہے۔ نتیجہ کے طور پر جو اعداد و شمار جمع ہوئے ہیں وہ بہت ہی امید افزا ہیں۔ مثلاً جہاں تک بی سی جی کے ٹیکوں کا تعلق ہے ایشیا میں ۱۷ کروڑ بیس لاکھ کی آزمائش ہوئی اور ۷۰ کروڑ کے ٹیکے لگے ہیں۔ جذام کے سلسلے میں ۱ کروڑ ۷۰ لاکھ کا معائنہ ہوا اور ان میں سے ۸۰ لاکھ تندرست ہو گئے ہیں۔

یوم حقوق انسانی پر سکرٹری جنرل کا پیغام

ایک صدی گذری ایک بڑی ہستی نے لکھا تھا جب تک آپ انسانیت کی خاطر مرنے کے لیے تیار رہیں آپ کے ملک کی زندگی غیر فانی رہے گی" اس بیان میں جس عقیدت اور جوش عمل کی تلقین مضمر ہے۔ اسے آج یوم حقوق انسانی کے موقع پر یاد کرنا بالکل بروقت معلوم ہوتا ہے۔

افراد کی حیثیت سے ہمارے حقوق اس بات پر منحصر ہیں کہ کیا ہم دوسروں کے حقوق کا احترام کرنے کے لیے آمادہ ہیں، اور اگر اسی اصول کو مختلف قوموں کے باہمی تعلقات پر منطبق کیا جائے تو عالمی امن کی بنیاد پڑ سکتی ہے ضرورت ہے کہ ہم ہر جگہ انسانی وقار کو تسلیم کرنے کے لیے نئے سرے سے وعدہ کریں اور ہمت و استقلال سے کام لے کر اعتراف کریں کہ دوسرے افراد اور دوسری قوموں کے حقوق دعوے اتنے ہی مقدس اور قابل احترام ہیں جتنا کہ

ہم اپنے حقوق وغیرہ کو مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہیں۔ صرف اس جذبے کے ماتحت ہم اس عالم تحفظ اور بیم و رجا کی فضا دور کر سکتے ہیں جس نے آج ہماری نگاہوں کے سامنے پردے ڈال رکھے ہیں اور صرف اسی طرح ہم اپنی کوششوں کو پابند کر سکتے ہیں تاکہ اس زمانے کی للکار کا جواب دیا جا سکے۔

یونی سیف کو امن کا انعام

کارنیگی فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹروں کے بورڈ نے اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کو ۱۹۵۷ء کا امن کا امن کا وظیفہ انعام عطا کیا ہے۔ یہ انعام ہیگ کے قصر عافیت میں ایک تقریب کے وقت دیا گیا۔ انعام کی قیمت ۵ ہزار ۸ سو امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ یونی سیف نے ساری دنیا میں ضرورت مند بچوں کو امداد کے سلسلہ میں جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے انعام کا مستحق سمجھا گیا ہے۔

یونی سیف اپنی ابتدائی صورت میں لڑائی سے تباہ حال بچوں کو ہنگامی امداد دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اور اس کا دائرہ عمل زیادہ تر یورپ تک محدود تھا لیکن پھر ساری دنیا کے بچے اس کی امداد کے مستحق سمجھے گئے حتیٰ کہ جنرل اسمبلی نے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ بچوں کے نقطۂ نظر سے اس ادارے کو زبردست اہمیت ہے اسے مستقل حیثیت دیدی اور ہنگامی امداد کا سوال ختم کر دیا۔ دنیا بھر کی حکومتوں، اداروں اور افراد سے ملنے والے رضاکارانہ چندوں سے یونی سیف کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

پاکستان میں یوم اقوام متحدہ کی تقریبات

اقوام متحدہ کی بارھویں سال گرہ حسب معمول اس سال بھی سارے پاکستان میں جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ نو دن کے پروگرام میں عام جلسے، اعلیٰ اجتماعات، مباحثے، مذاکرے، موڈ سیشن، نمائشیں، جلوس اور فلم شو شامل تھے جن کا انتظام غیر سرکاری اداروں یا تعلیمی اداروں نے کیا تھا۔ چارٹر کی اس سال گرہ پر صدر پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا نے ایک پیغام اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل مسٹر ڈیگ ہیمرشیلڈ کے نام بھیجا جو حکومت اور باشندگان پاکستان کی طرف سے تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سال گرہ ایسے موقع پر آئی ہے جب کہ اس نازک موقع پر تخفیف اسلحہ کے ذریعہ قیام امن کی سخت ضرورت تھی۔ وزیر اعظم پاکستان نے بھی سکرٹری جنرل کے نام اپنے پیغام میں لکھا کہ اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود یہی ایک ادارہ ہے جس پر انسانی تعاون اور

بین الاقوامی امن کے ضمن میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سیکرٹری جنرل کا پیغام بھی سارے اخبارات میں شائع کیا گیا اور ریڈیو سے نشر ہوا۔ انہوں نے دنیا بھر کے لوگوں سے استدعا کی کہ چارٹر کے اغراض و مقاصد اور اصولوں کی تکمیل میں پوری طرح ساتھ دیں۔ پاکستان کی انجمن اقوام متحدہ کی یہ تقریب سب سے زیادہ شاندار تھی۔ اس موقع پر بہت سے ملکوں کے لوک گیت۔ لوک ناچ اور موسیقی کے دوسرے مظاہرے ہوئے۔ اس کی آخری محفل میں اس سال کے موضوع "مفاد مشترک کے لیے" کو بہت شان کے ساتھ ہیپی ہوم اور نیو ٹاؤن گرلز اسکول کی طالبات نے پیش کیا۔ اس تقریب میں مرکزی حکومت پاکستان کے وزیر تجارت و قانون مسٹر فضل الرحمٰن خصوصی مہمان تھے انہوں نے محفل کا افتتاح کیا اور ان کامیاب طالبات کو انعامات تقسیم کیے جنہوں نے پوسٹروں۔ گڑیوں اور کھلونوں کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ پوسٹروں۔ گڑیوں اور کھلونوں کی نمائش کا افتتاح مرکزی وزیر میاں حنیف شاہ نے کیا

اس تقریب سے ایک دن پہلے لائنز انٹرنیشنل کلب نے اقوام متحدہ کے اعزاز میں ایک ضیافت دی جس میں وائس ایڈمرل چودھری نے صدر پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔ صدر موصوف مہمان خصوصی تھے لیکن اس وقت تشریف نہیں لا سکے۔

اسی روز وائی ایم سی اے میں مرکز اطلاعات اقوام متحدہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبداللہ فریاد نے ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ اپنی تقریر میں ڈاکٹر فریاد نے کہا کہ ساری دنیا کے لوگ یوم اقوام متحدہ کچھ تو اس لیے مناتے ہیں کہ انہیں بعض ایسی باتوں کا احساس ہوتا ہے جو اقوام متحدہ کی بدولت ممکن ہوئی ہیں اور کچھ اس لیے کہ یہ دن اس امید اور اس یقین محکم کا مظہر ہے کہ مل کر کام کرنے سے سب قوموں کا بھلا ہو سکتا ہے۔

ایٹم کا دور

پتھر، کانسی اور لوہے کے قدیم زمانوں کی طرح موجودہ دور کو بجا طور پر ایٹم کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ایٹم کی تحقیق تو پرانی ہو چکی ہے لیکن اس سے زیادہ کام اس زمانہ میں لینا شروع کیا گیا ہے۔ ایٹم کی طاقت تباہ کن ہے اور حد درجہ مفید بھی۔ ایجاد اور تحقیق سائنس دان کا کام ہے۔ معقول طریقہ سے فائدہ اٹھانا عوام کا کام ہے۔ اقوام متحدہ اس کوشش میں ہے کہ ایٹم کی طاقت پُرامن مقاصد کے لیے استعمال ہو۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ پاکستانی سائنسدان بھی اس میدان عمل میں کسی سے پیچھے نہیں ۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجو کیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستا بھر مین یہ دوھی تعلیمی رسالے ھین - جنکو سرکاری
ر پرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی
ور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین
ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں
میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھین اور ان
کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ
منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی -
تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجو کیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

شمارہ ۱۱] لاہور [فروری

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

فروری ۱۹۵۸ء

جلد ―――――― ۱۰

شمارہ ―――――― ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دینِ محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

نوخیز بچوں میں جرائم کا رجحان

ایم اے مخدومی

آزادی کی آمد نے جہاں قومی تعمیر و ترقی کے بہت سے دروازے کھول دیے ہیں وہاں غیر ملکی معاشرتی اثرات کے لیے بھی راستہ صاف کر دیا ہے۔ مغربی ملکوں میں ایک کافی پریشان کن مسئلہ نوخیز بچوں کے جرائم کا ہے وہاں اس مسئلے نے والدین اور پولیس دونوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہمارے یہاں یہ مسئلہ بڑی حد تک ناپید تھا۔ مگر اب ایسے واقعات رونما ہونے لگے ہیں جو نوخیز بچوں میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً گوجرانوالہ کی ایک تازہ اطلاع ہے کہ :۔

ایک مقامی مجسٹریٹ نے دسویں جماعت کے ایک سولہ سالہ لڑکے کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ اس لڑکے نے اپنا نام "خونی" رکھ رکھا تھا۔ ایک مقامی مل میں چوری کرنے کے بعد اس نے مالک مل کو خط لکھا تھا کہ فلاں ٹیلی فون کھمبے کے نیچے ایک ہزار روپے رکھ دو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ ایک اور شخص کو اسی طرح دھمکی دے کر پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ پولیس نے جب اس لڑکے کے کمرے کی تلاشی لی تو وہاں سے چوری کے اوزاروں کے علاوہ کچھ سستی فلمی کہانیاں اور بعض سنسنی خیز ناول مثلاً :۔ "خونی حسینہ" "ہولناک قاتل" "بڑھے آدمیوں کا عشق" وغیرہ برآمد ہوئے۔

فاضل مجسٹریٹ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ یہ سستی مگر مہلک کتابیں ہی اس لڑکے کو جرم پر ابھارنے کا سبب بنی ہیں۔ ایک بھٹکے ہوئے نوخیز دماغ نے ان کتابوں کے ڈرامے کو زندگی کی سٹیج پر کھیلنے کی کوشش کی اور وہ اپنے آپ کو ان فلموں اور ناولوں کے ہیرو کی شکل میں دیکھنے لگا۔

اگرچہ یہ ایک انفرادی واقعہ ہے لیکن یہ ایک ایسے رجحان کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے اگر ابھی سے

دکا نہ گیا تو وہ خوفناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ پاکستان کے تعمیری منصوبوں میں اشاعت تعلیم کو بہت اہم جگہ دی گئی ہے۔ حکومت اور عوام دونوں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ نوخیز نسل میں کوئی بچہ اَن پڑھ نہ رہ جائے لیکن ہمیں یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ تعلیم بذات خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود پسندیدہ کردار اور فنی مہارت ہے۔ تعلیم کی حیثیت محض ایک آلے یا اوزار کی ہے۔ اگر تعلیم پسندیدہ کردار اور فنی مہارت پیدا کرنے کی بجائے مجرمانہ رجحانات کو ترقی دینے لگے تو اساتذہ اور مدرسوں کو معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور اپنے طریق کار کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک اس مسئلے کا یہ حل ہو کہ مخرب اخلاق فلموں اور سنسنی خیز ناولوں پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ یہ اس مسئلے کا ایک حل ضرور ہے۔ مگر اس سلسلے میں اساتذہ اور مدرسوں پر بھی کچھ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ ان کا کام صرف اس قدر نہ ہونا چاہیے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، اس سے بڑھ کر ان کے ذمہ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ انہیں پاکیزہ ذوق مطالعہ عطا کریں۔ تاکہ وہ اپنے اوقات فراغت کو اچھی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر سکیں۔

ہمارے مدرسوں کی ایک عام کمی یہ ہے کہ وہ درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا نہیں کرتے۔ استاد بالعموم امتحانی تقاضوں کو مرکز توجہ بنائے رکھتے ہیں اور ذاتی مطالعہ کے ذوق کی تربیت نہیں کرتے۔ ذاتی مطالعہ کے معاملے میں طلبہ کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھلی بری جو کتابیں ان کے ہاتھ لگتی ہیں وہ انہیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح غلط قسم کی ذہنی عادات اخذ کرنے لگتے ہیں۔ جب تک تعلیم محدود تھی مدرسے کی اس کوتاہی کے نتائج منظر عام پر نہ آتے تھے۔ مگر اب تعلیم کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ ان نتائج کا شدید سے شدید تر شکل میں ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔

غرض نوخیز بچوں کے جرائم کا مسئلہ اساتذہ کو دعوت فکر دے رہا ہے۔ یہ مسئلہ ان پر ایک اہم ذمہ داری عاید کرتا ہے۔ تعلیمی سہولتوں کی توسیع و ترقی کے پہلو بہ پہلو اساتذہ کی یہ ذمہ داری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ انھیں اس ذمہ داری کو سمجھنے اور اسے پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیے ❖

معلوماتی اسباق اور ان کی تدریس

فضل احمد

معلومات سے کیا مراد ہے؟

پرانے زمانوں سے مدرسوں کا یہ کام چلا آیا ہے کہ بچوں کو طرح طرح کی معلومات بہم پہنچائیں۔ تدریس کا بہت بڑا کمال یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ طلبہ کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن اس نقطۂ نگاہ کے خلاف ہر زمانے میں آوازیں بھی اٹھائی گئی ہیں۔ دنیا کے ایک بہت بڑے معلم کی طرف یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ "خالی الفاظ ہلاکت کا باعث ہیں۔ اصل جان بخش چیز ان کی روح ہے"۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ اعتراض بڑی شدت کے ساتھ دہرایا گیا ہے کہ اکثر حالتوں میں مدرسے جو علم اپنے طلبہ کو سکھاتے ہیں وہ صحیح معنوں میں علم نہیں ہوتا۔ اعتراض کرنے والوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محض معلومات کا ذخیرہ کسی آدمی کو دانائی عطا نہیں کر سکتا۔ دانائی حاصل کرنے کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ذہن میں ہر قسم کے رطب ویابس ٹھونسنے کی بجائے صرف درست قسم کی معلومات کو جگہ دی جائے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو واقعات و حقائق ذہن کے سپرد کیے جائیں ان کا باہمی ربط بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ معلومات کسی آدمی کو علم و حکمت اسی صورت میں عطا کر سکتی ہیں، جب وہ درست قسم کی ہوں اور ان کا گہرا فہم پیدا کر لیا گیا ہو۔ یہ دونوں نکات مثالوں سے واضح ہو جائیں گے۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے حافظے کا یہ حال تھا کہ ایک ایک فرد کو خاندانوں اور قبیلوں کے شجرہ ہائے نسب ازبر تھے۔ مشہور شعراء کا کلام بھی اسی طرح سینہ بسینہ محفوظ چلا آتا تھا۔ لیکن ان معلومات نے عرب قوم کو علم و حکمت کی کوئی بلندی عطا نہ کی۔ لیکن جب ان بے سروپا معلومات کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری قوم کی کایا پلٹ گئی۔ ہر شخص اپنے جاننے والوں سے کسی نہ کسی ایسے شخص کا نام لے سکے گا جس کا حافظہ ارد گرد کے اشخاص کی چھوٹی چھوٹی تفصیلوں سے اٹا پڑا رہتا ہے۔ ہر چند کہ یہ باتونی شخص اپنے "علمی تبحر" کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کا یہ بے کار علم تحقیق و تلاش کے میدان میں اسے کوئی مقام نہیں دے سکتا۔

معلومات کی چھان بین کا کام ہر مدرسہ اپنا نصاب تیار کر کے انجام دے لیتا ہے۔ سرکاری محکمہ ہائے تعلیم اور تعلیمی ادارے نصاب بنانے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں کہ نصاب مدرسہ میں صرف ایسے مضامین ہی شامل کیے جائیں جو زندگی کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔

لیکن نصاب میں موزوں مضامین کی شمولیت اس بات کی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ طلبہ ان کی وساطت سے جو معلومات اخذ کریں گے وہ ضرور حکمت اور بصیرت کا سامان ہوں گی۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے معلومات کا بوجھ اپنے ذہن پر لاد رکھا ہو۔ مگر ان کی بدولت اس کے دل میں بصیرت کی ایک کرن بھی پیدا نہ ہوئی ہو۔ قرآن حکیم نے اپنے بلیغ پیرائے میں ایسے آدمی کو ایک گدھے سے تشبیہ دی ہے جس پر کتابوں کے پشتارے لدے ہوں۔ جدید مشینی دور میں اکثر مستریوں اور مزدوروں کو مختلف انجنوں اور مشینوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق کمال درجہ مہارت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کا یہ کمال ایک بے حد مختصر حدود کے اندر اندر ہی رہتا ہے انہیں نہ ان سائنسی اصولوں کی خبر ہوتی ہے جن پر ان کی مشینوں کے پیچیدہ طریقہ کار کا انحصار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی محدود مہارت سے کام لے کر کوئی اور نئی راہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مدرسوں میں عموماً جو معلومات طلبہ کو بہم پہنچائی جاتی ہیں ان کا غالب مقصد کسی خارجی امتحان کی تیاری ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو طلبہ غیر معمولی حافظے کے مالک ہوں وہ غیر معمولی نتائج دکھاتے ہیں خواہ انھیں ان حقائق کا فہم ہو یا نہ ہو جو انھوں نے زبانی رٹ رکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم بھی کوئی حکمت یا بصیرت پیدا نہیں کر سکتا اس علم کی حیثیت ایک ذہنی بوجھ کی ہے جو امتحان کی خاطر طوعاً اور کرہاً حافظے پر لادا جاتا ہے۔ جونہی امتحان کا ہوّا ختم ہوا یہ ذہنی بوجھ بھی پہلی فرصت میں اتار پھینکا گیا اور پھر اس کا کوئی پسندیدہ اثر باقی نہ رہا۔

نئی تعلیم کی سہ گانہ بنیادیں

نئی تعلیم کی تحریک کا آغاز اس صورت حال کے خلاف شدید ردعمل سے شروع ہوا۔ اس کا مقصد ان تمام خرابیوں کو دور کرنا تھا جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اس تحریک کی بنیاد تین تصورات پر ہے۔

(۱) ان میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ تعلّم کی سادہ سے سادہ قسم بھی کسی انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ جس طرح کسی خالی بوتل میں تیل ڈال دیا جاتا ہے۔ یا کسی خالی صندوق میں

کپڑے رکھ دیے جاتے ہیں، استاد اسی طرح طالب علم کے دل میں علم ڈال سکتا ہے۔ تحصیل علم کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ طالب علم کا ذہن بوتل یا صندوق کی طرح کوئی جامد شے نہیں۔ وہ زندگی کا ایک دھڑکتا ہوا مرکز ہے اور اس میں کوئی چیز اسی وقت ڈالی جاسکتی ہے جب وہ خود اس بابت پر آمادہ ہو۔ غرض تعلم کے عمل میں طالب علم کا سرگرم اشتراک ایک ضروری شرط ہے۔ تعلم کے متعلق یہ نفسیاتی اصول اس قدر بدیہی اور ناقابل انکار ہے کہ اس نے بہت جلد طریقہ ہائے تدریس کو متاثر کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غرضیکہ ہر قسم کی تدریس کو طلبہ کی سرگرمیوں کی شکل میں پیش کیا جانے لگا۔

۲) جدید تعلیم کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ نصاب مدرسہ انسانی زندگی کی چیدہ چیدہ سرگرمیوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ اس یقین کی پیداوار ہے کہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد نئی پود کو اپنے ماحول پر قدرت عطا کرنا ہے۔ اپنے گردو پیش کی زندگی سے متاثر ہونا اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہر بچے کی ایک فطری خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا نصاب مدرسہ میں جو مضامین داخل کیے جائیں انہیں خالصتہً انسانی نقطہ نگاہ سے پڑھایا جائے۔ ان کی تدریس میں طلبہ کی دلچسپیوں کو مرکزی نقطہ قرار دیا جائے اور مدرسے کی تمام سرگرمیوں کو حقیقی اور بامقصد بنایا جائے۔ تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ مدرسے کی دنیا ایک مصنوعی دنیا ہوتی ہے، مدرسہ ناتجربہ کار اور خام طبع طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مخصوص قسم کا ماحول پیدا کرتا ہے جو مدرسے کی باہر کی دنیا سے لامحالہ مختلف ہوتا ہے۔ لیکن جدید رجحان یہ ہے کہ مدرسے کی زندگی کو اردگرد کی زندگی سے قریب تر لایا جائے۔ اس غرض کے لیے جدید مدرسے اپنے طلبہ کو مدرسے سے باہر لے جاتے ہیں اور انھیں عملی زندگی کی طرح طرح کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کراتے ہیں۔

۳) جدید تعلیم کا تیسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر قسم کے علم کا آغاز حواس کی سطح سے ہونا چاہیے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اسے منظم نظریاتی سطح کی طرف بڑھنا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ بیرونی دنیا کی طرح علم ہم حواس کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ انسانی فکر و نظر کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور دقیق سے دقیق مسائل کا بھی جب تجزیہ کیا جائے تو معلوم یہی ہوگا کہ ان کی اصل جڑ ٹھوس ادراک میں گڑی ہوئی ہے۔ ہر چند کہ نظریات کو سمجھنا اور ان سے کام لینا انسانی ذہن کی پختگی کی علامت ہے۔ لیکن

یہ پختگی وقت اور تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا بچوں کو پڑھاتے وقت آغاز ہمیشہ ٹھوس مشاہدوں اور تجربوں سے ہونا چاہیے عام نتائج اور کلیات کی طرف رفتہ رفتہ پیش قدمی ہونی چاہیے۔

تفاوت راہ

اوپر بیان کیے گئے اصولوں نے تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ پہلے پڑھانے کا عام انداز یہ ہوتا تھا کہ استاد نے کوئی کلیہ۔ اصول یا تعریف زبانی بیان کر دی۔ اسے تختہ تحریر پر لکھ دیا طلبہ سے بار بار کہلوایا۔ اسے زبانی یاد کرنے کے لیے انھیں کچھ وقت دیا۔ بعض اوقات یہ وقت کئی دنوں تک پھیلتا چلا جاتا۔ اب ان رٹی ہوئی معلومات کے سننے کی باری آتی۔ استاد صاحب ڈنڈا ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے اور باری باری ہر ایک سے آموختہ سنا جاتا۔ تدریس کا یہ "اہم ترین" مرحلہ طے ہو لیتا تو اس کے بعد ازبر کردہ کلیات یا قواعد یا گردانوں سے کام لینے یا ان کی صداقت جانچنے کا وقت آتا۔ لیکن اس کام کو نسبتاً ثانوی درجے کا سمجھا جاتا۔ ہمارے یہاں آج بھی درس نظامی میں یہ کیفیت اپنے بھرپور رنگ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ طلبہ عربی افعال کی گردانیں رٹتے رٹتے مہینے اور سال صرف کر دیتے ہیں، لیکن نہ عربی زبان کا ایک جملہ بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

جدید اندازِ کار اس کے بالکل الٹ ہے۔ جدید مدرسہ اپنے طلبہ کو مشاہدے اور تجربے کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ وہ انہیں اس بات کی پوری اجازت دیتا ہے کہ اپنے ماحول کا خوب کرید کرید کر مطالعہ کریں۔ اور اس کے تمام پہلوؤں پر خود اپنی آنکھوں سے نگاہ ڈالیں جب یہ کام ہو لے تو پھر وہ اپنے مشاہدات اور تجربات سے نتیجے اخذ کریں اور اس طرح اصول۔ کلیے۔ قاعدے اور تعریفیں وضع کر لیں۔

جدید طریق کار بالکل سائنسی ہے۔ لیکن اس سے کام لیتے وقت ایک خطرے سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ پہلے یہ خطرہ تھا کہ طلبہ کے ذہن نظریات کی الجھنوں میں ہی کھو کر رہ جائیں اور زندگی کے ٹھوس حقائق کی انہیں خبر ہی نہ ہونے پائے۔ اور یوں ان کا علم حقیقت سے یکسر بے تعلق ہو کر رہ جائے۔ یہ کوئی فرضی خطرہ نہ تھا۔ بلکہ پرانے اور افسردہ طریقہ ہائے تدریس آج بھی جہاں جہاں مروج ہیں ان کے غیر حقیقی نتائج کو ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے لیکن اگر پرانے اور فرسودہ طریقوں نے نظری تعلیم پر غیر ضروری زور دے کر اپنے آپ کو بے کار بنا لیا تھا تو جدید طریقہ ہائے تدریس کو بھی یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ ٹھوس حقائق پر غیر ضروری

زور دینے سے بھی پسندیدہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ مشاہدہ اور تجربہ بے شک علم کی اصل بنیادیں ہیں لیکن ان بنیادوں پر اٹک کر رہ جانے سے وہ ذہنی تربیت حاصل نہیں ہو سکتی جو تحصیل علم کی اصل غایت ہے۔ علم اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ ذہنی پختگی حاصل ہو۔ اگر کوئی شخص مشاہدے کی لذت میں ہی کھویا رہتا ہے اور یہ کبھی نہیں سوچتا کہ اس کے مختلف مشاہدات میں کیا ربط ہے اور یہ مشاہدات اس کے سابقہ ذہنی پس منظر کی روشنی میں کس قسم کے عام نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو مشاہدہ اس شخص کو ذہنی پختگی عطا نہیں کر سکے گا۔ ذہنی پختگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مشاہدہ کردہ واقعات و حقائق پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ انہیں مرتب اور منظم کیا جائے اور ان کے باہمی ربط کا فہم پیدا کیا جائے۔ جدید تدریسی طریقے اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مشاہدے اور تجربے کو آخری منزل سمجھنے کی بجائے اسے صرف آغاز کار خیال کیا جائے اور اس سے آگے نظری نکات کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اور بالآخر ان دریافت کردہ نظریات کی رو سے نئے حقائق کی تشریح ڈھونڈی جائے۔

جدید تعلیم کے ان تقاضوں نے استاد کے کام کو پرانے پہلے زمانوں کے مقابلے میں بہت مشکل بنا دیا ہے۔ روائتی طریق کار میں استاد کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ کتاب کا کوئی حصہ طلبا کو یاد کرنے کے لیے دیا جائے یا انہیں بعض قواعد اور کلیات رٹائے۔ نئے تقاضے استاد کے کام کی نوعیت میں انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ جدید مدرسہ بھی اپنے طلبہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کچھ بنیادی حقائق اور معلومات کو ازبر کریں۔ مثلاً انہیں پہاڑے اور حساب کے بعض دوسرے گر یاد کرنے پڑتے ہیں۔ الفاظ کے ہجا یاد کرنے پڑتے ہیں، تاریخ کے بنیادی سن اور واقعات حافظے میں محفوظ کرنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح انہیں تعریفیں بھی یاد کرنی پڑتی ہیں لیکن نئی تعلیم کا امتیازی نشان یہ ہے کہ ازبر کرنے کے اس کام کو کبھی بھی فی نفسہ مطلوب نہیں سمجھا جاتا۔ ازبر کردہ معلومات ہمیشہ بلندتر ین ذہنی کام کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ مثلاً پہاڑے اور حساب کے گر اس لیے یاد کیے جاتے ہیں کہ روزمرہ کا حساب کتاب آسانی اور صحت کے ساتھ کیا جا سکے۔ ہجا اس لیے یاد کیے جاتے ہیں کہ ضروری خطوط اور دوسرا تحریری کام درستی کے ساتھ انجام دیا جا سکے۔ تاریخ کے سن اس لیے یاد کیے جاتے ہیں کہ ماضی کی رفتار واقعات میں بڑے بڑے سنگھائے میل کو اچھی طرح سمجھ کر ان کے باہمی ربط اور ان کے

وقتی بعد کا ایک متوازن تصور پیدا کیا جا سکے۔ تعریفیں اس لیے یاد کی جاتی ہیں کہ جن حقائق کا فہم پیدا ہو چکا ہے ان کا خلاصہ مختصر ترین اور موزوں ترین الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔

غرض قدیم اور جدید تعلیم میں نقطۂ نگاہ کا بنیادی فرق ہے۔ روایتی تعلیم کو اس بات سے کچھ غرض نہ تھی کہ اسباق اور روزمرہ زندگی کے درمیان کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ جدید تعلیم میں ہر قسم کی معلومات محض اس لیے فراہم کی جاتی ہیں کہ طلبہ اپنے مشاہدات اور تجربات کا زیادہ گہرا فہم پیدا کر سکیں۔ وہ ان معلومات کی مدد سے گرد و پیش کی زندگی پر زیادہ سے زیادہ قدرت حاصل کر سکیں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے دو باتوں کی طرف خاص توجہ دینی پڑتی ہے۔

(۱) اسے طالب علموں کی دل چسپیوں اور استعدادوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنی تدریس کو ان ہی دو چیزوں کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔

(۲) اسے نصاب مدرسہ کے مضامین کو ایسے رنگ میں پیش کرنا پڑتا ہے کہ وہ زندگی سے کوئی الگ تھلگ شے نظر نہ آئیں۔ بلکہ انسانی ارتقا کی دل چسپ کہانی کے مختلف پہلو ہیں کہ نگاہ کے سامنے آئیں۔

میدان کی وسعت

یہ دیکھ لینے کے بعد کہ طلبہ کو جو علم بھی سکھایا جائے انسانی زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ اچھی طرح واضح ہو جانا چاہیے۔ فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی وسعت بے اندازہ ہے۔ اس لیے نصاب مدرسہ میں اس کے کون کون سے پہلوؤں پر نگاہ ڈالی جائے؟ لیکن یہ سوال فی الحقیقت اس قدر کٹھن نہیں جس قدر یہ بظاہر نظر آتا ہے کیوں کہ انسانی زندگی کی بنیادی سرگرمیوں کی تعداد کوئی درجن ڈیڑھ درجن سے زیادہ نہیں اور نصاب مدرسہ کو صرف ان بنیادی سرگرمیوں سے ہی سروکار رکھنا چاہیے۔ ان سرگرمیوں کی تقسیم مختلف طور پر کی گئی ہے۔ مگر تدریس کی عملی ضرورتوں کے پیش نظر ان کی زیادہ مفید تقسیم یہ ہے:-

(۱) وہ سرگرمیاں جن کی بدولت طالب علم کو براہِ راست یا ذاتی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

(۲) وہ سرگرمیاں جہاں طالب علم براہِ راست ذاتی تجربہ حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ تقریر یا تحریر کی مدد سے دوسروں کے تجربوں اور مشاہدوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کے

مطبوعہ الفاظ۔ ریڈیو نشریات۔ استاد کی تشریح و توضیح یہ تمام چیزیں لفظی یا صوتی علامتوں کی طالب علم کی آنکھوں کے سامنے ان تجربوں اور مشاہدوں کا نقشہ کھینچنا چاہتی ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ دوسروں نے کیا۔ ان لفظی اور صوتی علامتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علم پر بھی وہی ذہنی اور جذباتی کیفیت طاری ہو جائے جو اصلی تجربہ کرنے والے پر وارد ہوئی تھی۔ اس کے دل میں اسی جیسے خیالات اور اس کے سے احساسات پیدا ہو جائیں۔

معلومات کی ان دونوں اقسام کی ماہیت میں ہر شخص کو ایک بیّن فرق نظر آئے گا۔ ذاتی یا براہ راست تجربہ قوت فکر کو جس طرح جگاتا اور جذبات میں جو گرمی پیدا کرتا ہے اس کی نوعیت بالکل یگانہ ہے۔ سائنس کی تجربہ گاہ یا مدرسے سے باہر کارخانوں۔ تاریخی مقامات یا مناظر قدرت کا مشاہدہ، جو ذہنی اور جذباتی پختگی اس ذاتی تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اس کا بدل کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی۔

لیکن انسانی زندگی کی مہلت بے حد قلیل ہے۔ اس لیے کوئی شخص بھی ہر قسم کے تجربات اور مشاہدات خود نہیں کر سکتا۔ اسے لامحالہ بہت سے تجربات اور مشاہدات کا حال دوسروں کی زبانی سن کر ہی درست تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسے زندگی کے اکثر معاملات میں دوسروں کی مثال سے عبرت و ذوق سے سبق حاصل کرنے پڑتے ہیں بمصداق حدیث شریف :- انما السعید من وعظ بغیرہٖ استاد کی تدریس کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ وہ لفظی اور صوتی علامتوں کو زیادہ سے زیادہ جاندار بنائے تاکہ وہ طلبہ کے دل و دماغ وہی کیفیتیں پیدا کر سکیں جن کی ان میں تصویر کشی کی گئی ہو۔

اسی سلسلے میں استاد جدید فلمی صنعت سے سبق سیکھ سکتا ہے۔ ہر چند کہ متحرک تصویر نے حرکات و سکنات کو پردہ سیمین پر ہو بہو دکھا دینے میں کمال پیدا کر لیا ہے۔ مگر یہ حرکات و سکنات بھی بعض اوقات دلی جذبات کی پوری شدت کی آئینہ داری نہیں کر سکتیں۔ ایسی صورت میں فلم پروڈیوسر بعض دوسری کارگر تکنیکوں سے کام لیتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کا کلیجہ کسی سراسر غیر متوقع خبر کے سننے سے جس طرح دھک سے رہ جاتا ہے اسے ظاہر کرنے کے لیے کسی چیز کے یکدم زمین پر گرنے کی آواز پیدا کی جاتی ہے۔ جب کوئی آدمی بادل ناخواستہ کسی کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو موزوں قسم کی پس منظری موسیقی اس کے جذبات اکراہ کی

تصویر کشی کرتی ہے۔

معلوماتی اسباق میں استاد فلم سازوں سے بڑی مفید رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سے یہ کھٹکا نظر آئے کہ اس کے اپنے الفاظ یا کتاب کے اوراق واقعات کی پوری پوری عکاسی نہیں کرسکیں گے فوراً سمعی بصری امدادوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ استاد کو وہ ذرائع میسر نہیں آ سکتے جو فلم سازوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ استاد اپنے یا کتابی الفاظ میں جان ڈالنے کے لیے تھوڑا بہت جو کچھ بھی کر سکے اسے اس سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ جدید تعلیم بجا طور پر پہلا درجہ ذاتی تجربے اور مشاہدے کو دیتی ہے۔ لیکن جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زبانی اور کتابی الفاظ کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا رنگ دیا جائے تاکہ طالب علم ذہنی اور جذباتی طور پر ان تجربوں کو اپنے اوپر وارد کرسکیں اور ان سے مطلوبہ قسم کی ذہنی اور جذباتی تربیت حاصل کرسکیں۔

ایک اور نقطۂ نگاہ

مدرسے کی تعلیمی سرگرمیاں طلبہ کو جو معلومات فراہم کرتی ہیں بعض ماہرین تعلیم نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) وہ معلومات جو طلبہ کو بتا دی گئی ہوں۔

(۲) وہ معلومات جو طلبہ پر منکشف ہوئی ہوں۔

پہلے زمرے میں وہ تمام معلومات آئیں گی جو کتابوں رسالوں اور دوسری مطبوعات سے اخذ کی گئی ہوں۔ ریڈیو نشریات یا فلموں سے حاصل شدہ ہوں۔ غرض اس زمرے میں وہ تمام معلومات آئیں گی جو ذاتی تجربے اور مشاہدے کی پیداوار نہ ہوں۔

دوسرے زمرے میں وہ معلومات شامل ہوں گی جو تجربہ گاہ۔ سیر و سیاحت۔ کھیلوں اور دوسری عملی سرگرمیوں سے حاصل ہوں۔

ان دونوں قسم کی معلومات کی ماہیت میں لامحالہ فرق ہوگا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ پہلی قسم کی معلومات کسی ذہنی سرگرمی کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں۔ یا وہ کسی مفید ذہنی تربیت کا ذریعہ نہیں بنتیں۔ جو طالب علم کی

کسی کتاب کو سمجھ کر دل چسپی سے پڑھتا ہے۔ استاد کی بیان کردہ تشریح کو خوب سمجھ لیتا ہے اور یا کسی نشری تقریر کو پورے فہم کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے۔ وہ بھی یقیناً ذہنی تربیت حاصل کرتا ہے۔ یہ ذہنی تربیت ذاتی تجربے کے مقابلے میں کم تر درجہ کی ہوگی۔ لیکن جہاں ذاتی تجربہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو یا جہاں اس کے لیے بہت زیادہ وقت اور محنت کی ضرورت ہو وہاں کتابوں سے یا دوسروں کی زبانی معلومات اخذ کر لینا ہی بہترین طریق کار رہ جاتا ہے زندگی کی مہلت اتنی مختصر اور علوم کی وسعت اس قدر بے پایاں کہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو معلومات اچھی طرح سوچ سمجھ کر ذہن میں محفوظ کی جائیں وہ بھی یقیناً ذہنی بالیدگی پیدا کرتی ہیں وہ طالب علم کے ذہن میں خود بخود پیوست نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ وہ غور و فکر سے کام لے کر ان کی ماہیت سمجھتا ہے اس طرح اس کے ذہن میں ان خیالات کی کچھ نہ کچھ جھلک پیدا ہو جاتی ہے جو اصل تجربہ کرنے والے کے دل میں موجزن تھے۔

تعلیم کے لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ تحصیل علم کے اوپر بیان کیے گئے دونوں طریقوں سے خدمت لے بے شک بچے ہر چیز خود معلوم کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں اور استاد کو چاہیے کہ ان کی نفسیاتی پیاس کو جہاں تک ممکن ہو پورا کرے۔ لیکن استاد محسوس کرے گا کہ اسے بہت سی باتیں خود بھی بتانی چاہئیں۔

کتابوں کا مطالعہ بھی دو طریق پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ استاد کی رہنمائی اور دستگیری سے کوئی کتاب پڑھائی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طالب علم خود اپنے طور پر کوئی کتاب پڑھے۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ بات یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں سے کام لیا جائے۔ استاد کا یہ فرض ہے کہ بنیادی مہارتیں بنیادی معلومات اور باریک علمی نکتے سکھانے کے لیے درسی کتاب خود پڑھائے۔ لیکن یہ تدریس اسوقت کارگر سمجھی جائے گی۔ اگر یہ طلبہ کو ذاتی مطالعہ کی [illegible]۔ درسی کتاب کی غرض یہ احساس پیدا کرنا نہیں کہ کسی موضوع پر جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ سب کچھ درسی کتاب میں کہہ دیا گیا ہے۔ بلکہ درسی کتاب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ طلبہ کے دلوں میں نئے سوالات اور مزید تلاش و جستجو کا جذبہ پیدا کرے۔

وسائل تدریس

خواہ معلومات دوسروں سے اخذ کی جائیں یا ذاتی تجربے اور مشاہدے سے حاصل کی جائیں، استاد کو دونوں

صورتوں میں ایک اہم کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اپنا یہ فرض نبا ہنے کے لیے وہ طرح طرح کے وسائل اور ذرائع اختیار کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ تقریری سبق سے کام لیتا ہے اور داستان گوئی۔ بیان۔ تشریح اور توضیح کے سہارے ڈھونڈتا ہے۔ جدید سائنس نے استاد کی خدمت کے لیے طرح طرح کا فوضیعی مواد فراہم کر رکھا ہے وہ تصویروں فلموں۔ ماڈلوں۔ چارٹوں اور نشری تقریروں سے مدد لے سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اب ٹیلی ویژن بھی استاد کی مدد کے لیے موجود ہے۔ دوسری طرف استاد اپنے طلبہ کو طرح طرح کے عملی کاموں میں لگا سکتا ہے وہ سائنس کے کمرے میں عملی تجربے کرا سکتا ہے۔ تمثیل کاری کے مواقع پیدا کر سکتا ہے۔ طرح طرح کے علمی اور ادبی مباحث کا بندوبست کر سکتا ہے۔ طلبہ کو مطالعہ قدرت اور دوسرے تعلیمی مقاصد کے لیے باہر گھومنے پھرنے اور کئی ایک مقامات کی سیر کے لیے لے جا سکتا ہے۔ وہ انہیں ذاتی مطالعہ کی راہ پر لگا سکتا ہے۔

عام طریق کار

معلوماتی اسباق میں استاد کے سامنے کئی طرح کے موضوع آتے ہیں۔ ہر موضوع کو بخوبی پڑھانے کے لیے اس کے سامنے کئی ایک طریقہ ہائے کار موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان میں سے کوئی ایسا طریق چن لیتا ہے جو موضوع کے ساتھ مناسبت بھی رکھتا ہو اور طلبہ کے لیے بھی حسب حال ہو۔ یہ نکتہ ایک مثال سے واضح ہو جائیگا فرض کیجیے کہ استاد طلبہ کو مستطیل کا رقبہ نکالنا سکھانا چاہتا ہے۔ طلبہ یہ قاعدہ سیکھنے کے لیے حساب کی ضروری استعداد پہلے حاصل کر چکے ہیں۔

طلبہ کو یہ قاعدہ سکھانے کا روائتی طریق تو یہ تھا کہ تختہ تحریر پر یہ کلیہ درج کر دیا جاتا۔

مستطیل کا رقبہ = طول × عرض۔ طلبہ سے کہا جاتا کہ اس کلیے کو رٹ لیں۔ پھر استاد ایک آدھ مثال تختہ تحریر پر حل کر کے دکھاتا اور طلبہ سے کہتا کہ حساب کی فلاں مشق حل کرو۔ طلبہ کسی سوال پہ رک جاتے تو اس کی وضاحت زبانی یا تختہ تحریر پر کر دی جاتی۔

یہ روائتی طریقے اختیار کرنے میں مشکل یہ ہے کہ یہ طلبہ کی توجہ کو جذب نہیں کر سکتے۔ طلبہ کو کسی کلیے کے ازبر کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اسے زبانی رٹنے اور پھر اس کی مدد سے سوال حل کرانے کا کام سزا کے خوف سے ہی کرایا جا سکتا ہے۔ جو تعلم کسی خوف کی پیداوار ہو وہ تعلیمی اعتبار سے چنداں سود مند نہ ہوگا

لہذا جدید تعلیمی فکر اس روائتی طریق تدریس کا قائل نہیں کیوں کہ یہ طریق تدریس کو زندگی کے ساتھ نہیں بلکہ سزا و جزا کے خارجی محرکات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ اس سے تعلم کا عمل زندگی کی معنویت سے خا رہتا ہے۔

تعلم کو با معنی اور خوش گوار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ سیکھنے والے کے دل میں اس کی پیاس پ کی جائے۔ اوپر بیان کی گئی رقبے کی مثال میں استاد کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کے دلوں میں موضوع کے ساتھ دلچسپی پیدا کرے۔ جیسا چہ وہ طلبہ سے کہتا ہے:۔ دیکھو لڑکو مدرسے کے سا یہ مستطیل شکل کا کھیل کا میدان ہے۔ کھیلوں کے وقت اس میں بے تحاشا گرد اڑتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس میں گھاس لگا دیا جائے۔ مگر اس کام کو ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ اس پر کیا لاگ آئے گی۔ کل تمام لڑکے سوچ کر آئیں کہ یہ لاگت کس طرح معلوم کی جائے۔

اگلے دن طلبہ یہ معلوم کر آتے ہیں کہ گھاس لگوانے کا خرچ اتنے آنے فی مربع فٹ آیا کرتا ہے۔ او فوراً اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کھیل کے میدان میں کتنے مربع فٹ ہیں۔ ممکن ہے کوئی لڑکا ا سوال کا یہ حل پیش کرے کہ ایک گتے کا ٹکڑا تیار کر لینا چاہیے جو بالکل مربع ہو اور جس کا ہر ضلع ایک ہو۔ اس ٹکڑے کو کھیل کے میدان میں بار بار رکھ کر یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ میدان کتنے فٹ مربع کے ہے۔ اگر طلبہ کی طرف سے اس قسم کا مشورہ دیا جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ اسے عملی جامہ پہناتے انہیں خود بخود معلوم ہو جائے کہ یہ کام قریباً محال ہے۔ اب استاد آسانی سے انہیں سمجھا سکتا ہے کہ معلوم کرنے کی ایک آسان تر صورت یہ ہے کہ مستطیل میدان کے طول اور عرض کو فٹوں میں بانٹ کر ہر نقطہ سے اضلاع کے متوازی خط کھینچ دیے جائیں۔ اس طرح میدان مربع فٹوں میں بٹ جائے گا۔ بعد ازاں ا جماعت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرا سکتا ہے کہ طول اور عرض کی ضرب دینے سے بھی یہ رقبہ معلوم

مستطیل کا رقبہ نکالنے کا کلیہ جب اس طور پر معلوم کر لیا جائے تو اب اگلا کام اس علم سے عملی کام لینا ہے۔ استاد طلبہ سے کہے گا کہ بعض اور مستطیلوں کے رقبے نکالیں۔ ازاں بعد وہ انہیں حساب کی متعا حل کرنے کو کہہ سکتا ہے۔

اس مثال میں استاد نے جو طریق کار اختیار کیا ہے اس میں جدید طریق تدریس کے تمام امتیازی اقدام جود ہیں۔ استاد نے پہلے سبق کے لیے زمین ہموار کی یعنی اس نے موضوع کے متعلق طلبہ کے دلوں میں شوق پیدا با سبق کا یہ قدم تیاری کہلاتا ہے۔ زاں بعد استاد نے طلبہ کے سامنے اصل مسئلہ پیش کر دیا۔ یعنی یہ کہ مستطیل کا بس طرح معلوم کیا جائے۔ طلبہ نے اس مسئلے کا مطالعہ کیا اور ذہن پہ زور ڈال کر اسے حل کرنے کی کوشش کی فر استاد کی رہنمائی میں یہ حل تلاش کر لیا گیا۔ یہ سبق کا دوسرا قدم تھا۔ اس کا اصطلاحی نام استفسار ہے۔ اب س مثال کی روشنی میں ایک عام قاعدہ اخذ کر لیا گیا۔ یہ قاعدہ اس لیے معلوم کیا گیا کہ آئندہ جب کسی مستطیل کا بقہ معلوم کرنا پڑے تو طلبہ کو اس طویل ذہنی کاوش میں سے دوبارہ نہ گزرنا پڑے جس میں سے وہ اب گزرے تھے اعدے یا اصول کا اخذ کرنا سبق کا تیسرا قدم ہے۔ اور تعمیم کے نام سے موسوم ہے۔ سب سے آخر میں معلوم شدہ اعدے کو نئے مستطیلوں کے رقبے معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ سبق کا چوتھا اور آخری قدم ہے اور اطلاق کے نام سے مشہور ہے۔

اس مثال نے سبق کے جن چہارگانہ اقدام کی نشان دہی کی ہے وہ معلوماتی اسباق کے مشہور اقدام ہیں جن سبق کا مقصد طلبہ کو کسی قسم کی معلومات سکھانا ہو۔ اس سبق کو ان چہارگانہ اقدام کے قالب میں ڈھال لینا نہ صرف کام کو آسان بنا دیتا ہے۔ بلکہ اس سے تدریس میں تاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے ؏

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا اردو علم و ادب پر اثر

تاج محمد خاں لودھی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم قومی و ملکی حادثہ کی حیثیت رکھتی ہے اس نے ہندوستانی معاشرے کو ہر پہلو سے متاثر کیا۔ اسی وجہ سے برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ میں انیسویں صدی افکار و خیالات کے اعتبار سے ایک انقلاب انگیز صدی تھی۔ مذہب و سائنس۔ جدید و قدیم۔ مشرق و مغرب ہندو اور مسلمان۔ اسلام اور عیسائیت میں ایک مسلسل کشمکش نظر آتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم پیر مر رہا تھا۔ اور دوسرا عالم نو جنم لے رہا تھا۔ زندگی کی پرانی قدریں مٹ رہی تھیں اور نئی اقدار ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ اب زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ لہذا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں ملک و قوم کی زندگی کے سیاسی۔ تمدنی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں پر ہمہ گیر اثر ڈالا۔ وہاں اردو علم و ادب بھی اس کی دست برد سے نہ بچ سکے۔

سطور ذیل میں ہم یہ جائزہ لیں گے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے کس کس پہلو سے اردو علم و ادب کو متاثر کیا۔

۱۔ اردو نثر اور اسالیب بیان

قدیم اردو نثر نگاری کا انداز نہایت پر تکلف تھا۔ صنائع بدائع کا استعمال بڑی فیاضی کے ساتھ کیا جاتا تھا شاعرانہ طریقوں سے کام لے کر فقروں کو مقفیٰ بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خیالی انداز میں کسی چیز کو بیان کیا جاتا تھا۔ معانی کو الفاظ کی خوبصورتی اور شان و شوکت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریر میں حقیقت اور اصلیت گم ہو کر رہ جائے گی۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے زیر اثر اگرچہ مشکل پسندی کو کسی حد تک زندگی اور ماحول کی ضروریات کے پیش نظر ترک کر دیا گیا تھا۔ مگر حقیقت پسندی کا عنصر تا حال غائب تھا۔ میر امن دہلوی کی باغ و بہار (۱۸۰۱

حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" "طوطا کہانی" "گل مغفرت" وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" سادگی، زبان و بیان کے اعتبار سے مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب سے بہت آگے ہے۔ تاہم وہ بھی مافوق الفطرت عناصر کے ذکر سے خالی نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے لیے یک دم زمین و آسمان بدل گئے تھے۔ صدیوں پرانا نظامِ زندگی ختم ہو چکا تھا۔ خیالی باتیں کرنے سے اب کام نہ چل سکتا تھا۔ نئے بدلے ہوئے ماحول کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ عملی طور پر کچھ کام کیا جائے اس بے بسی کے عالم میں سر سید احمد خاں "مردے از غیب" کی طرح قوم کے آڑے آئے اور دردمندانِ قوم کی ایک مختصر سی جمعیت فراہم کر کے بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے اپنی اور قوم کی حالت کو "تہذیب الاخلاق" کے آخری پرچے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا۔

"ایک دن تھا کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے اٹھائے بھی نہ اٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے۔

وہ آج میر مسجد جامع کے ہیں امام
داغ شراب دھوتے تھے کل جا نماز کے

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے۔ اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر نہ تھیں۔ جب رند تھے تو زہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت کٹر تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار تم کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانے نے دل کی گھرات ایسی تھی جس میں ہمیشہ غمخواری کی پر سوتا تھا۔ زمانے نے جھٹکا دیا اور جگا دیا۔"

سر سید احمد خاں نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے علاوہ اردو علم و ادب کے میدان میں بھی نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اپنے مشہور اخبار "تہذیب الاخلاق" کے چوتھے سال کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا. ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی بمضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی. الفاظ کی درستی. بول چال کی صفائی پر کوشش کی. رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا. تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی ہے. ہاتھ اٹھایا. جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی. اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو. جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے. تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے."

مندرجہ بالا خیالات جو ان کے اپنے قلم سے نکلے ہیں صداقت پر مبنی ہیں. سرسید اپنے زمانے کے تقاضوں کی پیداوار تھے. انہوں نے خود کڑے اور ناخوش گوار حقائق کو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا. اور پوری دردمندی سے قوم کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی. اور اس کام میں انہوں نے روایتی ادبیت کو حائل ہونے کی اجازت نہ دی. کیوں کہ ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ÷ نالہ پابندِ نے نہیں ہے

"History of Urdu Literature" کے مشہور انگریز مصنف ڈاکٹر گراہم بیلی کا قول ہے کہ انیسویں صدی کے اردو ادب پر کسی ایک شخص کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا سرسید کا ہوا. غرض سرسید احمد خاں نے اور ان کی تحریک کے دوسرے علم برداروں نے اردو زبان کو پرانی ڈگر سے ہٹا کر نئے نئے اسالیبِ بیان اور ایک علمی اور ادبی زبان کی حیثیت بخشی. سرسید کا کمال ان کی اولیت اور وسعت میں ہے

۲- اردو شاعری

اردو شاعری فارسی شاعری کے بطن سے پیدا ہوئی ہے. فارسی شاعری کے تتبع میں ہمارے ہاں اکثر و بیشتر مثنویات اور غزلیں لکھی گئیں جو اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار ہیں. اردو شاعری بھی فارسی شاعری کی طرح شمع و پروانہ. گل و بلبل کی داستانوں. بادہ و ساغر. فرضی محبوب کے سراپا کی فرضی تعریفوں

گراں بار ہے۔ میر و غالب کا کلام اگرچہ وفور جذبات۔ واقعہ نگاری۔ ندرت خیال۔ بلندئ تخیل اور حسین تشبیہات و استعارات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مگر اس میں قوم کے لیے کوئی زندگی بخش پیغام نہیں ہے۔ تعمیر و اصلاح کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ جس طرح عرب میں اور دوسرے ممالک میں شعر سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ جنگ آزادی سے پہلے برصغیر ہند و پاکستان میں شعر سے کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا۔

آخری دور میں لکھنوی شاعری نہایت مبتذل ہو چکی تھی۔ ایسے ایسے اشعار کہے گئے کہ ان کو پڑھتے ہوئے طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ بطور مشتے از خروارے چند اشعار پیش ہیں۔ ناسخ لکھتا ہے:-

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوان عشق ہیں ؛ ہم کو ناسخ راجا اندر کا اکھاڑا چاہیے
معشوق بھی کوئی نظر آتا ہے تو ٹھنڈا ؛ اوقات بسر ہوتی ہے کشمیر میں میری (آتش)
میرے ہاتھ آئیں تو محرم ہوں میں ان کے حال سے ؛ مرغ سیمیں بال ہیں یا بیضۂ زر چھاتیاں
کیا کہوں اے بحر آب و تاب اس کے جسم کی ؛ پیٹ ہے کوثر۔ حباب آب کوثر چھاتیاں

خلق لکھتا ہے:-

قسمت ہے آگے وصل میسر ہو یا نہ ہو ؛ آئے تو منتوں سے وہ بارے پلنگ پہ
باہر ہوا میں جامے سے اپنے شب وصال ؛ کپڑے جو اس نے اپنے اتارے پلنگ پہ

اسی مذموم شاعری کو مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور مسدس حالی میں بری طرح کوسا ہے، کہتے ہیں:-

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر ؛ عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ؛ ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے، بعث نظر علم انشا ہمارا

جنگ آزادی میں ناکام ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے یکایک یوں محسوس کیا جیسے اچانک ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ حالی نے سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر مدو جزر اسلام المشہور

"مسدس حالی" لکھی۔ مقصد یہ تھا کہ قوم کی عظمت گذشتہ یاد دلا کر اس کی ڈھارس بندھائی جائے " غلط کاریوں پر متنبہ کیا جائے۔ مولانا حالی نے شعر کی قوت کی طرف اشارا کیا اور ترغیب دلائی کہ شعر سے قوم کی اصلاح و تعمیر کا کام لیا جائے۔ یہیں سے "ادب برائے زندگی" کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ جنگ آزادی کے تقاضوں نے حالی کو حالی بنایا۔ اور ان سے متاثر ہو کر اکبر الہ آبادی نے شعر سے کام لے کر مغربی تہذیب کے طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ اور اقبال نے قوم کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے کے لیے اسے جھنجوڑا۔ بنا پر کہا جاتا ہے کہ حالی، اکبر اور اقبال ایک ہی سلسلہ کی تین کڑیاں ہیں اور اگر حالی نہ ہوتا تو اکبر اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ انگریزی شاعری کے زیر اثر ہی اردو میں نیچرل شاعری کا بھی اضافہ ہوا۔

۳۔ اردو ادب میں تنقید کا ارتقا

تنقید خود تخلیقی ادب کی ایک شاخ ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے تنقید کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ دنیا میں بہترین باتیں معلوم کی گئی ہیں۔ جو کچھ دنیا میں بہتر سے بہتر سوچا گیا ہے تنقید کا کام اس کو معلوم کرنا ہے معلوم کرنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ہے۔ تاکہ وہ نئے اور جدید نظریات کی تخلیق میں زیادہ سے زیادہ ممد و معاون ہو سکیں۔

تنقید کے مندرجہ بالا مقصد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جنگ آزادی سے ہمارے ہاں دراصل صحیح قسم کی تنقید کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ مشاعروں میں سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعروں سے داد دی جاتی تھی۔ تنقیدی شعور مدح یا قدح تک محدود تھا۔ کوئی معیار ایسا نہ تھا جس پر شعر کو پرکھا جائے۔

مغرب کے زیر اثر اردو ادب میں تنقید کا خوش گوار اضافہ ہوا جس کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ آل احمد سرور اپنے مقالے "تنقید کیا ہے" میں لکھتے ہیں:-

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ تنقید صحیح معنوں میں حالی سے شروع ہوئی۔ حالی نے شاعری، اور اخلاق، سماج، اور غزل اور نظم کے متعلق اصولی سوال کیے۔ انہوں نے شاعری کا ایک معیار متعین کیا اور اس معیار سے ہمارے ادبی سرمایے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔"

حالی کے نزدیک شعر میں تین خصوصیات سادگی۔ اصلیت اور جوش ہونی چاہئیں ایک غزل میں شعر کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

اے شعر! دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

حالی میں یہ تمام تنقیدی شعور جنگِ آزادی کے بعد بدلے ہوئے حالات اور مغربی ادب کے بالواسطہ مطالعہ سے پیدا ہوا۔ کچھ کچھ تنقیدی شعور شبلی اور آزاد کے ہاں بھی ملتا ہے۔

۴۔ اردو ادب میں ناول اور افسانہ

جنگِ آزادی سے پہلے اردو ادب میں داستانی ادب کی بھرمار تھی۔ اس میں باغ و بہار، داستان امیر حمزہ اور مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب بہت مشہور ہیں۔ اس داستانی ادب کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مافوق الفطرت عناصر (جنوں پریوں وغیرہ) کا بیان بہت ملتا ہے دلچسپی کے عنصر کو ہر ممکن اور مصنوعی طریقے سے قائم رکھا جاتا تھا۔ مقصد دلچسپی اور دماغی تعیش تھا۔ البتہ معاشرتی اعتبار سے ان داستانوں کی اہمیت مسلم ہے۔

جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کی زندگی پر انگریزوں کا اثر پڑنے لگا۔ اس کا اثر تمدن پر بھی پڑا اور ناول نے جنم لیا۔ وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مولوی نذیر احمد دہلوی نے "مرآۃ العروس"، "بنات النعش"، "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت" وغیرہ ناول لکھے۔ اسی طرح سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنوی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ یہ ابتدائی ناول اگرچہ ناول کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ مگر پھر بھی ہم انھیں تکنیک کا موڑ کہہ سکتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات کے تحت لوگوں کا شعور بدل رہا تھا۔ ظاہری تبدیلی کے ساتھ ذہنی تبدیلی ہو رہی تھی۔ آگے چل کر مرزا ہادی حسن رسوا اور پریم چند نے ناول کے فن کو خوب چمکایا۔ افسانوی ادب میں منشی پریم چند۔ سجاد حیدر۔ بیلدارام۔ نیاز فتحپوری اور بعد کے افسانہ نگاروں نے بیش بہا اضافہ کیا۔

۵. سیرت نگاری

جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو مذہبی اور سیاسی میدان میں متعصب ہندوؤں اور عیسائیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسلام اور بزرگانِ اسلام پر طرح طرح کے رکیک حملے کیے جانے لگے۔ اپنے بزرگوں کی صحیح سیرت کو پیش کرنے کی خاطر مولانا شبلی نعمانی نے مشاہیرِ اسلام کی سیرتوں کو تاریخ کی روشنی میں تحقیق کے بعد قلم بند کیا۔ اس طرح اردو ادب میں تاریخ نگاری، سیرت نگاری اور تحقیق و تنقید کی بنیاد پڑی۔ حالی نے "یادگارِ غالب" اور سرسید احمد کی سوانح عمری "حیاتِ جاوید" لکھیں۔

۶. صحافت

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں اس جنگ کا سراسر ذمہ دار ٹھہرایا۔ اور انتقام لینے کی خاطر انھیں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی طور پر زبوں حال کرنے کی کوشش کی۔ ادھر مسلمان بھی انگریزوں کو اپنا دشمن اور غاصب سمجھتے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ مسلمانوں کی بہتری اور بہبود کی خاطر سرسید احمد نے مسلمانوں اور انگریزوں میں مغائرت کو کم کرنے اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بے حد کوشش کی۔ اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت سنوارنے کے انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء سے اپنا مشہور اخبار "تہذیب الاخلاق" نکالا جو ان کی ہمہ گیر طبیعت کا سب سے بڑا ترجمان تھا۔

اگرچہ اردو میں اخبارات جنگ آزادی سے پہلے بھی نکلتے تھے۔ مگر تہذیب الاخلاق کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس میں سرسید نے ایک عوامی زبان کو علمی و ادبی زبان کا درجہ دیا اور مقالہ نگاری اور صحافتی تحریر کا معیار قائم کیا۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی کے زمانے سے اردو میں مکتوب نگاری کا اسلوب بدلا۔ غالب اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ انگریزی کی وساطت سے دوسرے علوم و فنون اردو ادب میں آئے۔ ترکی، فرانسیسی، روسی، انگریزی ادب سے شہ پارے لے کر ان کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور اس طرح اردو ادب ہر قسم کے ادبی سرمائے سے مالا مال ہو گیا۔ یہ تمام اضافے اور یہ تمام خوشگوار تبدیلیاں جنگ آزادی کی وجہ سے اردو علم و ادب کو میسر آئیں۔ کو وسعت اور گہرائی میسر آئی۔ اردو ادب صحیح معنوں میں زندگی کی طرح ہمہ گیر اور اس کا عکاس بن گیا۔

سیاہ سرزمین میں سفید لوگ

خداداد خاں

افریقہ میں سفید اقوام کا قیام اور تسلط اب قطعی اور ناگزیر ہو چکا ہے۔ اس تاریک براعظم میں ان کے بتدریج داخلے اور مسلسل اثر و نفوذ کی تفصیلات ابھی پوری طرح دنیا کو معلوم نہیں ہوئیں۔ کیوں کہ جس طرح اس برِ عظیم کے قدرتی حالات تاریکی میں ہیں اسی طرح یورپین اقوام کے ان مظالم اور چیرہ دستیوں کے قصے بھی پردہ راز میں ہیں۔ جو غریب افریقیوں پر پچھلے ڈیڑھ سو سال سے ڈھائے جا رہے ہیں اور یہ کہ اہلِ مغرب کی لائی ہوئی تہذیب اور ان کے داخلے کو سب لوگوں نے کس طرح قبول کیا۔ یا پچھلی ڈیڑھ صدی میں غیر ملکیوں کی بے انصافیوں سے ان کے دلوں پر کیا گزری یہ کچھ وہی جانتے ہیں۔

انیسویں صدی میں افریقہ کی معدنی دولت کے حصول کے لیے بیرونی اقوام قطار در قطار کھچی چلی آرہی تھیں یا اہلِ مغرب ہر جائز و ناجائز طور پر افریقی معدنی ذخائر اور یہاں کی زرخیز زمینوں پر قابض ہونا چاہتے تھے اس خود غرضی کے تحت وہ مقامی باشندوں سے بسا اوقات انتہائی غیر منصفانہ سلوک کرتے تھے۔ یہاں انگریز یا امریکی قوموں کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ ہر باہر سے آنیوالی قوم نے افریقیوں سے بدسلوکیاں کیں اور محض اس لیے کہ وہ باقی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکے۔ اور زیادہ سے زیادہ زرخیز اور وسیع زمینوں پر قابض ہو سکے۔ اور جب مغربی قومیں کثرت سے افریقہ میں وارد ہونا شروع ہو گئیں تو انکی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہاں نوآبادیاتی نظام کو نہایت ضروری بنا دیا۔

یورو پین لوگ اہلِ افریقہ پر جب یہ احسان جتلاتے ہیں کہ انہوں نے انھیں تہذیب سکھا کر اصولِ زندگی سے روشناس کیا اور انھیں طبی، مالی اور معاشی سہولتیں بہم پہنچا کر انھیں آرام سے جینے کے گر سکھائے تو ایک حساس آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ جذبۂ انسانیت سے متاثر ہو کر ہمدردی اور خلوص کے تحت کیا گیا ہے؟ اور کیا اہلِ مغرب کی ٹولیاں کی ٹولیاں محض غریب افریقیوں کو مہذب بنانے کے لیے

افریقہ میں پہنچ رہی تھیں یا درپردہ ان کا مقصد کچھ اور بھی تھا؟

مغربی ڈاکٹروں نے افریقی باشندوں کو کئی خطرناک بیماریوں سے بچایا۔ انگریز اور امریکی ڈاکٹر پنسلین کے ٹیکے اور دوسری دواؤں کے ڈبے اور بنڈل اٹھائے افریقیوں کا علاج کرتے پھرتے تھے۔ یونائیٹڈ نیشنز کی ٹیم نے کروڑوں مویشیوں کو مرنے سے بچایا۔ اور اس براعظم سے طاعون کی وبا کا نشان مٹا دیا۔ سیکڑوں مربع میل کے رقبے کو زہریلی مکھیوں سے پاک کر دیا۔ اس مدد سے لاکھوں افریقیوں کی جانیں بچ گئیں اور اسے نوعِ انسانی کے حق میں ایک بڑی خدمت سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ افریقی لوگوں کا علاج کرنے کے دوران میں لاکھوں کی تعداد میں افریقی عورتیں بانجھ ہو گئیں۔ اور اکثر قوموں میں سلسلہ پیدائش محدود ہو گیا۔ یوروپین حکمرانوں نے افریقی اقوام کی خانہ جنگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن اسے افریقیوں کے حق میں کیوں کر مفید سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ ان کے درمیان ایک ایسی ذہنی اور معاشی جنگ کے سامان پیدا کر دیے گئے ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آتے۔ سفید حکمران یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ہزاروں اور لاکھوں افریقیوں کے لیے اسکولی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ لیکن کیا انھیں سچ مچ ایسی تعلیم دی جاتی ہے جس کے اس کے ذہن و دماغ روشن ہوں اور ان میں غور و فکر کی بیداری پیدا ہو۔ اور وہ اپنے معاملات اور مسائل کا از خود تصفیہ کر سکیں۔

کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں اہل یورپ نے افریقیوں کو اپنے طور پر کچھ اختیارات دیے ہوئے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام ہے۔ مثلاً برٹش گولڈ کوسٹ اور نائجیریا کے لوگ اب آزادی کی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ یوگنڈا میں اگرچہ کسی سفید آدمی کو زمین خریدنے کی اجازت نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہاں انگریز سیاسی طور پر خاصے پریشان ہیں۔ اور انھیں یوگنڈا کے قومی سردار کو جلاوطن کر دینا پڑا۔ ۱۹۵۵ء میں اس سردار کی واپسی پر حالات کچھ اعتدال پر آ گئے ہیں۔ ٹانگانیکا میں سیاسی اور معاشی حالات نہایت ابتر ہیں اور یہاں آئے دن خانہ جنگی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ اور چوں کہ یہ ملک عارضی طور پر یونائیٹڈ نیشنز کی نگرانی میں ہے اس لیے انگریز براہِ راست یہاں کی سیاست میں دخل انداز نہیں ہو سکتے۔ بلجین کانگو میں سیاسی حالات کا رخ واضح کرتا ہے کہ ارباب اقتدار کو لوگوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کا خیال ہے۔ کانگو میں کاروبار خاص نفع بخش ہے۔ اور ذرائع آمدنی نہایت وسیع ہیں۔ اور لوگوں کے طرزِ زندگی میں مغربی اصول کار فرما ہوتے جا رہے ہیں۔

جو علاقے صنعتی مراکز سے دور ہیں وہاں کے لوگ اپنے اپنے سردار یا بادشاہ کے ماتحت رہتے ہیں جنھیں بلجین حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ لیکن عام اقتدار بلجین حکومت کے ہاتھ میں ہی ہے۔ اور اہل کانگو کی آزادی کا کوئی امکان نہیں کیوں کہ تمام معاشی اور اقتصادی شعبوں پر بلجین چھائے ہوئے ہیں۔ ادھر کینیا میں جتنی بھی زرخیز زمینیں ہیں ان پر انگریز قابض ہیں اور کینیا کے سردار انہیں واپس لینے کے لیے برابر جدوجہد میں معروف ہیں کینیا میں ماؤ ماؤ تحریک کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف خاص نفرت پائی جاتی ہے۔ تاہم برطانوی آبادکار حالات کو قابو میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ عوام کے آزادی اور حق خود اختیاری کے جذبات سرد پڑ جائیں اسی طرح جنوبی افریقہ کے عوام کی مجاہدانہ کوششوں کو ختم کرنے کی مہم جاری ہے اور سفید لوگ انھیں ان کی اسی قدیم حالت میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ یہاں افریقیوں کو دبانے کے لیے روز بروز سفید لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بسایا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دس لاکھ افریقیوں کو غلام نہیں بنایا جا سکا۔ اور بجائے اس کے کہ انگریز یہاں کچھ اقتدار حاصل کریں ان کے اور اہل افریقہ کے درمیان کھچاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

افریقی اور سفید لوگوں میں چپقلش تو ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن باہر سے آکر بسنے والی تمام قومیں بھی یہاں آپس میں ٹھنی رہتی ہیں۔ مشرقی افریقہ میں انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ اس کے علاوہ تمام دوسری قومیں حصولِ دولت کے لیے دوسری قوموں کو نقصان اور زک دینے پر تلی رہتی ہیں اور یہ عام کشیدگی کا رجحان کسی بڑے انقلاب اور ہمہ گیر خوں ریزی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے چناں چہ کینیا میں ماؤ ماؤ تحریک اس کا واضح ثبوت ہے۔ ماؤ ماؤ تحریک سے پہلے کانگو میں ایک نہایت خوفناک گروہ نے قتل و غارت کا اودھم مچا رکھا تھا۔ اس جماعت کو اینی یوٹو کہتے ہیں۔ اینی یوٹو کو یورپین آبادکار چیتا لوگ بھی بولتے ہیں۔ اینی یوٹو کی تباہی کو بلجین حکومت کوششوں کے باوجود ابھی تک پورے طور پر روک نہیں سکی۔ یہ جماعت انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی ۱۹۳۷ء میں ضلع انوری کے صدر مقام اوومی کے جیل خانہ میں کئی اینی یوٹو قیدی بند تھے۔ اور ان سب پر قتل و خوں ریزی کے مقدمات چل رہے تھے۔ ان قیدیوں سے ایسی ایسی سفاکانہ وارداتیں منسوب کی جاتی تھیں جنھیں سن کر ہرگز یقین نہیں

آنا تھا کہ کسی انسان کے ہاتھوں اتنا ظلم بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن تحقیقات پر جتنے واقعات ان چیتا لوگوں سے وابستہ تھے وہ بالکل درست ثابت ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ایلوا کوبی کے ایک بلجین مجسٹریٹ نے قسم کھائی کہ وہ اینی یوٹو کا سراغ لگا کر ان کا نشان تک مٹا دے گا۔ لیکن تمام لوگوں نے اس کا مضحکہ اڑایا کہ وہ اس درندہ صفت اور خونخوار گروہ کی سرکوبی کو کسی طرح بھی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ مجسٹریٹ نے ایک گاؤں کا محاصرہ کیا اور اینی یوٹو کی گرفتاریاں شروع کیں اور انہیں پکڑ پکڑ کر پھانسی دینا شروع کیا۔ گاؤں میں اینی یوٹو کا بے شمار ساز و سامان مثلاً چیتوں کی کھالیں۔ بڑے اور خوفناک تیز چاقو اور چھریاں اور لوہے کے موٹے موٹے کنگھی کئی آدمیوں کو محض شبے کی بنا پر پکڑ لیا گیا۔ لیکن گرفتاریوں کے بعد مجسٹریٹ کی حیرت کی انتہا یہ تھی کہ ایک اینی یوٹو بھی اس کے کسی ایک سوال کا جواب نہ دیتا تھا۔ اور ہر ممکن کوشش کے باوجود زبان نہ کھولتا تھا۔ دہشت پسندی راز داری اور اپنی مذہبی رسوم کا احترام افریقیوں کی آبائی خصلتیں ہیں۔ بالخصوص راز داری کے معاملے میں تو وہ اتنے پابند ہیں کہ اپنی جماعت یا خاندان کے متعلق کوئی بات افشا کرنے کے بجائے وہ پھانسی پر چڑھنے کو ترجیح دیں گے۔

اینی یوٹو کی خونخواری اور بربریت کا مقصد کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ ممکن ہے کسی قبیلے کے سردار یا کسی روحانی پیشوا نے اپنی قوت اور طاقت کا خوف مسلط کرنے کے لیے اسے جاری کیا ہو۔ بلجین کانگو میں داما کا مقام اس کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ پچھلے چالیس سالوں میں اس کے ممبر نائیجیریا، انگولا، کینیا اور افریقہ کے بعض دوسرے حصوں میں برابر بڑھ رہے ہیں۔ حالاں کہ جغرافیائی طور پر ان ملکوں کے آپس میں ذرائع آمد و رفت محدود بلکہ ناممکن ہیں۔ پھر اینی یوٹو کی تنظیم تمام جگہ ایسی مضبوطی سے قائم ہوتی جا رہی ہے کہ حیرت ہوتی ہے اینی یوٹو قتل کرتے وقت نہایت تیز چاقو اور چھرے استعمال کرتے ہیں۔ اور ایسے طریقوں سے اپنا کام کرتے ہیں کہ مقتول کے زخموں کو دیکھ کر یہ شبہ نہ گذرے کہ کوئی ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قتل ان کا مشغلہ ہے ورنہ اگر ان کی سفاکی اور خون ریزی کسی مقصد کے تحت ہوتی تو ان کا شکار کوئی خاص قوم یا جماعت ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ جو کوئی بھی ان کے ہتھے چڑھ جائے یہ اس کو مار ڈالتے ہیں۔ اور اس کے لیے ان کے ہاں سفید یا سیاہ لوگوں کی کوئی تمیز نہیں۔ بلکہ وہ سفید لوگوں کی بجائے افریقیوں کا شکار زیادہ کرتے ہیں اور انہیں کچھ اس طرح

قتل کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ موت چیتے کے حملے سے واقع ہوئی ہے۔ اینی یوٹو حملے کے وقت چیتے کی کھال اوڑھ لیتے ہیں اور کلائیوں میں لوہے کے موٹے موٹے کنگن پہنتے ہیں جن میں چار نوکیلی اور نہایت ہی تیز چھریاں مڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ کنگن اور چھریاں لگانے کے بعد اگر ہاتھوں کو کھولا یا پھیلایا جائے تو وہ نکلے نہیں ہوتے۔ اور اگر مٹھیاں بند کی جائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیر کے پنجے ہیں۔ قتل کرنے کے بعد اینی یوٹو لاش کے گرد لکڑی کے نوکدار ڈنڈوں سے چیتے کے پنجوں کے سے نشان کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو شیر کے اصل پنجوں سے یہ نشان لگاتے ہیں۔ اینی یوٹو کو چیتا لوگ کہنے کی یہی وجہ ہے اور اس گروہ کے پیدا ہونے کے بعد کئی سال تک لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ قتل اور تباہی سچ مچ چیتوں کی وجہ سے ہی ہے۔ اینی یوٹو سنسان راستوں پر تنہا آدمی عام طور پر حملہ کرتے ہیں۔ اس کے گلے اور چھاتی پر نہایت بے دردی سے زخم لگا کر مردہ بنا دیتے تھے۔ اور جلدی جلدی لاش کے ارد گرد چیتے کے سے پنجوں کے نشان بنا کر فوراً بھاگ جاتے۔ کبھی کبھی گاؤں میں کسی جھونپڑی میں داخل ہو کر گھر والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اگر ان کا شکار کوئی عورت ہو تو یہ اس کی چھاتیاں کاٹ کر لے جاتے ہیں، حالانکہ کوئی چیتا ایسا نہیں کرتا، اور اس طرح ان لوگوں کا چیتے کا روپ دھارنا کچھ بے مقصد سا معلوم ہوتا ہے۔ عورتوں کی کاٹی ہوئی چھاتیاں وہ اپنے سردار کے پاس لے جاتے ہیں۔ تاکہ اپنی کارگذاری کا ثبوت دکھا سکیں۔ کبھی کبھی وہ مقتول کی دونوں آنکھیں نکال کر ان کو پانی میں ابلتے ہیں اور ابلتے ہوئے پانی میں اپنی نوکیلی چھریاں صاف کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ان کی چھریوں میں آدمیوں کی سی بینائی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حملے کے وقت اندھیرے میں ٹھیک گردن اور چھاتی پر پڑتی ہیں۔ دن کے وقت اینی یوٹو عام آدمیوں کی طرح پُرامن اور خوش خلق دکھائی دیتے ہیں اور کچھ شبہ نہیں گذرتا کہ ایسے لوگ بھی سفاک ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کو ابھی تک ختم نہیں کیا جا سکا ہے۔ ہر اینی یوٹو کو گاؤں کے سردار یا اس کے اپنے ہی باپ یا بھائی کا شکار کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ جسے وہ نہایت جوش اور ہوشیاری سے سرانجام دیتا ہے۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اینی یوٹو گروہ کے ممبران کو روحانی قوت حاصل ہے۔ اور ان کے خلاف کچھ کرنا یا سوچنا بہت بڑی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ باوجود علم ہونے کے کسی اینی یوٹو کا راز فاش نہیں کرتے۔ انھیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے فلاں فلاں لوگ

اینی لیوٹو ہیں لیکن وہ خاموش رہتے ہیں، اور جب انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ کسی اینی لیوٹو کا پتہ بتائیں تو وہ اس کا نام بتانے کی نسبت مر جانے کو ترجیح دیں گے۔

ماؤماؤ تحریک بھی دراصل اینی لیوٹو ہی کی ایک صورت ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ماؤماؤ چیتے کی کھال نہیں پہنتے اور نہ ہاتھوں میں چھریاں مڑے ہوئے کنگن استعمال کرتے ہیں۔ ان کا مقصد سفید اقوام کے داخلے کو روکنا اور انھیں افریقہ سے نکالنا ہے۔ اس کے برعکس اینی لیوٹو محض قتل برائے قتل کے اصول پر کاربند ہیں۔ اینی لیوٹو کی طرح ماؤماؤ بھی سیاہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں لیکن اس سے بھی ان کا ایک مقصد یہ ہے کہ کسی افریقی کو برطانوی باشندوں سے مدد اور تعاون کی جرأت نہ پیدا ہو۔ کینیا میں کیکویو قوم کے افراد ماؤماؤ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اور کم و بیش سارے کے کیکویو ہی اس کے ممبر ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی کیکویو انگریزوں سے تعاون کرتا ہے تو وہ اگر کسی ماؤماؤ کا باپ اور بھائی ہی کیوں نہ ہو لازماً قتل کیا جاتا ہے اور افریقیوں میں صرف تعاون کی بنا پر خوف پیدا کرنے کے لیے انھیں سفید لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ تعداد میں قتل کیا جاتا رہا۔ ۱۹۵۳ء میں ایک حملے میں تین سو سے زیادہ افریقی مارے گئے۔ ان کے گھروں کو جلایا گیا اور ان کے مویشی تباہ کیے گئے اور اس کے برعکس جو انگریز قتل ہوئے ان کی تعداد سو سے بھی کم تھی۔

ماؤماؤ میں شمولیت کا حلف اٹھانے کے بعد اس حلف کی پابندی اور احترام ہر کیکویو کا جزو ایمان ہے اور وہ مرنے سے پیشتر جماعت کا کوئی راز افشا کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اور کوئی تشدد۔ کوئی لالچ اور کسی قسم کی حکمت عملی ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ ماؤماؤ میں رہنما اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اپنے طور پر وضع کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان میں تنوع اور جدت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ ہر نئے ماؤماؤ کے جذبات کو متاثر کیا جا سکے لیکن تمام جگہ حلف کی بنیادی حیثیت ایک ہی ہے۔ اور وہ ہر راز داری اور سردار کے حکم کی اندھا دھند تعمیل کرتا ہے۔ ہر ماؤماؤ جماعت کے مخالفین کی اطلاع اپنے سردار کو دیتا رہتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق چوری اور قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ ماؤماؤ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک معاون اور دوسرے مستعد۔ اور دونوں ہی سے حلف لیا جاتا ہے لیکن مستعد ماؤماؤ کے لیے دہشت پسندی کا ایک خاص حلف بھی لیا جاتا ہے۔ یہ مستعد ماؤماؤ جگہ بہ جگہ حسب ہدایت قتل کرتے ہیں، سفید لوگوں کے فارموں کو تباہ و برباد کرتے اور ان کی فصلوں کو جلاتے اور مویشیوں کو ہلاک کرتے ہیں

اگر انھیں اپنے بھائی یا باپ کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا جائے تو وہ اس کی فوری تعمیل کرتے ہیں۔ حلف اٹھانے کے وقت نئے ممبر کو مقتولوں کی آنکھیں نکال کر ان کا پانی پلایا جاتا ہے اور کئی دوسری مکروہ حرکات بھی کی جاتی ہیں جوں جوں اس تحریک کو ترقی ہوتی گئی وحشیانہ حرکات بھی زیادہ ہوتی گئیں حتیٰ کہ بعض دفعہ انسانوں اور جانوروں کا لہو بھی پیا جانے لگا۔

ان حالات میں معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ کیکیو انتہائی حد تک ظالم اور جاہل لوگ ہیں۔ لیکن ایک انگریز ڈاکٹر جے سی کا رتھرنے جو کئی سال تک کینیا میں مقیم رہا ہے ماؤ ماؤ تحریک کا نفسیاتی جائزہ کر کے ایک سرکاری اعلان میں کہا ہے کہ کیکیو بلا کے ذہین ہیں اور ان کی ذہنی صلاحیتیں دنیا کے کسی اور ترقی یافتہ ملک کے لوگوں سے ہرگز کم نہیں۔ اور اگر انہیں مناسب اور صحیح طریق پر تعلیم دی جائے تو یہ لوگ نیک اور مفید شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس انگریز ڈاکٹر نے یہ بھی اندازہ کیا ہے کہ ماؤ ماؤ میں شمولیت پر جو حلف وفاداری لیا جاتا ہے اس کے اصولوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اختراع کرنے والے لوگ اعلیٰ درجے کے ذہین ہیں۔ کیوں کہ ان سے براہ راست انسانی جذبات متاثر ہوتے ہیں۔

انگریز کاشت کار اور آباد کار چونکہ افریقیوں پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے تھے۔ اس لیے ماؤ ماؤ نے سب سے پہلے انہیں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ لیکن انگریز چند حادثوں کے بعد چوکنے اور ہوشیار ہو گئے اور اپنے کیکیو ملازموں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وہ ہر وقت مسلح رہتے اور ماؤ ماؤ حملوں سے کسی وقت بھی غافل نہ ہوتے۔ اس سے ان کے قتل کے امکانات کم ہو گئے۔ اب ماؤ ماؤ نے ان انگریزوں کو نشانہ بنایا جو شہروں سے ذرا دور رہتے تھے اور مقامی لوگوں سے ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ اس طرح بے شمار انگریز عورتیں بچے اور بوڑھے جن کا شکار نسبتاً آسان تھا موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ماؤ ماؤ کا مقصد یہ نہ تھا کہ چیدہ چیدہ انگریزوں کو ہی مار دیا جائے۔ بلکہ ان کے پیش نظر عام انگریزوں کو تباہ کرنا تھا۔ تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ماؤ ماؤ حملوں میں کچھ بھی تنظیم اور ضبط ہوتا تو اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ وہاں اب تک انگریزوں کا نشان تک مٹ گیا ہوتا۔ لیکن ماؤ ماؤ جب بھی حملہ کرتے تو قتل کرنے کے بعد فوراً بھاگ جاتے کیوں کہ انھیں ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ انھیں رائفلوں اور دوسرے آتشیں اسلحہ سے

معبود دیا جائے گا۔ انہوں نے بعض اسلحہ خانوں پر حملے کر کے کچھ رائفلیں چھینیں۔ لیکن جب انگریزوں نے یہ منت قانون پاس کیا کہ جس ملازم سے رائفل چھینی گئی یہ اُس کی کوتاہی تصور ہوگی اور اُس سے بھاری رقم بطور تاوان لی جائے گی۔ اس قانون کے بعد ماؤ ماؤ کوئی بندوق نہ حاصل کر سکے۔

قتل و تباہی کے بے شمار دردناک واقعات ایسے ہیں جسے سن سن کر ہر آدمی کا دل رحم اور غم سے بھر جاتا ہے۔ دراصل کینیا میں ماؤ ماؤ کے زمانے میں انگریزوں پر زمین اور آسمان تنگ ہو رہے تھے۔ لیکن جس صبر اور استقلال سے انہوں نے مصائب کا مقابلہ کیا اور ڈٹے رہے۔ یہ انگریز قوم کے خروش اور خطرناک ثابت ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے بالآخر کامیابی پا ہی لی۔ ایک بیٹیہ ور انگریز شکاری کی بیوہ ڈائینے نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد کینیا میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ چند سالوں سے یہیں رہ رہی تھی۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں یہ بیچاری ایک بار اپنی ماں اور سوتیلے باپ کی ملاقات کے لیے کبریری چلی گئی۔ جہاں ماؤ ماؤ کا بڑا ڈر تھا۔ مسٹر لیکے کی عمر کوئی ستر سال کے لگ بھگ تھی اور وہ ماؤ ماؤ لوگوں سے بالکل بے خوف اور بے نیاز تھا۔ اسے اپنے کی کیو ملازمین کی وفاداری پر اتنا بھروسہ تھا کہ اسے یہ وہم بھی نہ آسکتا تھا کہ اسے بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ کیونکہ نواحی علاقے کے تمام کی کیو اسے بڑی عزت سے دیکھتے تھے۔ اس نے اپنی خوابگاہ میں بیٹری سے نشان دینے والا راکٹ ضرور لگایا ہوا تھا۔ لیکن اسے اس کے استعمال کی بالکل توقع نہ تھی۔

ڈائینے کے پہنچنے کے دوسرے روز شام کے کھانے کا وقت تھا۔ مسٹر لیکے اور اس کی بیوی ڈائینے کے ساتھ میز پر بیٹھے ہی تھے کہ تیس کے قریب کی کیو آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز چھرے اور بھالے تھے۔ انہوں نے مکان کی پچھلی طرف ایک زور کا نعرہ بلند کیا اور دیواریں پھاند کر اندر آ گئے اور آتے ہی کی کیو خانساماں کو قتل کر دیا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ ڈائینے اور اس کی ماں غسل خانے میں دوڑ گئیں جہاں سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر جانے کا راستہ تھا۔ ڈائینے ماں سے پہلے چھت پر چڑھ گئی۔ لیکن اس کی بوڑھی ماں ابھی دروازے سے ہی گذری تھی کہ ایک ماؤ ماؤ نے اسے دیکھ لیا اور سیڑھیوں پر پاؤں رکھنے سے پہلے ہی اس کو گھسیٹ کر باہر لے آیا۔ ڈائینے چونکہ نئی نئی آئی ہوئی تھی اس لیے حملہ آوروں کو کسی تیسرے آدمی کا شبہ نہ ہو سکتا تھا

اس لیے وہ بچ گئی۔ بے چاری بڑھیا کو فی الفور قتل کر کے اس کی لاش کو باہر صحن میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد حملہ آور مسٹر لیکے کو ساتھ لے کر نکل گئے۔ یہ سب کچھ چند منٹوں میں گذر گیا۔ ڈائینے چھت سے اتر کر خواب گاہ میں گئی اور قریب کے اسٹیشن پر سگنل روانہ کیے اور پھر فوراً قریب کے فارم پر مدد کے لیے دوڑ گئی۔ لیکن سب کچھ بے کار تھا کیوں کہ ماؤ ماؤ نہایت تیزی سے مسٹر لیکے کو لے کر نکل گئے تھے اور ایسے غائب ہوئے کہ باوجود تلاش کے ان کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ لیکے کے فارم پر کے پانچ ملازموں میں سے تین بھاگ گئے اور باقی کے دو سے جس قدر بھی پوچھ گچھ کی گئی ایک نے بھی معقول جواب نہ دیا۔ صبح سے پہلے ہی حفاظتی دستے کے سپاہی فارم کے اردگرد کے علاقے پر چھا گئے اور کئی میل کے رقبے میں چپہ چپہ زمین کو چھان مارا۔ اور بڑی تلاش کے بعد ایک بڑی تلاش کے بعد ایک غار میں مسٹر لیکے کے کپڑے مل سکے۔ اسی غار میں ایک ماؤ ماؤ بھی پکڑا گیا جس کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ایک ماؤ ماؤ سردار ہے۔ بعد میں سراغ چلا کہ غریب لیکے کو ماؤ ماؤ قربانی کی رسم ادا کرنے کے لیے لے گئے تھے۔ اس علاقے میں ماؤ ماؤ ایک عورت سے جو ماؤ ماؤ دیوی کہلاتی تھی سخت متاثر تھے۔ اس عورت نے انھیں بتایا تھا کہ کسی انگریز کو زندہ دفن کر لے سے ماؤ ماؤ کے لیے برکت اور خوش حالی کا نزول ہوگا۔ نتیجہ اس کی ہدایت کے مطابق بوڑھے لیکے کو کئی بکریوں کے ساتھ زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد لیکے کی مزید تلاش چھوڑ دی گئی۔

مگر اس قسم کے ہولناک مظاہروں کے باوجود بھی انگریزوں کے استقلال میں مطلقاً فرق نہ پڑا۔ اور ہر انگریز اس مصیبت کو برداشت کرنے پر بالکل تیار نظر آتا تھا۔ ان کے اس استقلال اور ثابت قدمی کی وجہ سے ماؤ ماؤ کا مقصد پورا نہ ہو سکا اور وہ انگریزوں کو ملک بدر نہ کر سکے۔ صرف کچھ سفید لوگ ایسے تھے جنھوں نے اپنے بیوی بچے دوسرے مقامات پر بھیج دیے تھے۔ ککیو قوم کے متعلق ان کا عام نظریہ یہ تھا کہ اس خونخوار قوم میں رحم اور نیکی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اگرچہ تمام ککیو ماؤ ماؤ میں شامل نہیں تھے۔ لیکن یہ معلوم کرنا آسان نہ تھا کہ کون ککیو ماؤ ماؤ ہے اور کون نہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک سارے ہی ککیو نا قابل اعتماد تھے۔ کینیا کی اکثر دوسری قومیں اگرچہ ماؤ ماؤ سے باہر تھیں۔ لیکن ان کے بھی خطرناک صورت اختیار کر جانے کا خدشہ یقینی تھا کیوں کہ بعض قومیں ککیو کی آبائی دشمن ہوتے ہوئے بھی ماؤ ماؤ بن چکی تھیں۔ مثلاً میسے قوم جسے کسی وقت ککیو نے مار مار کر بھگا دیا

کی طرف بھگا دیا تھا۔ اب ماؤ ماؤ میں شامل تھی۔ ابتدا میں جب ماؤ ماؤ تحریک ابھری تو جیسے سرداروں نے انگریزوں کو مدد کے لیے اپنے تین ہزار مسلح سپاہیوں کی پیش کش کی تھی۔ لیکن انگریزوں نے اس خطرے تحت اس پیش کش کو قبول نہ کیا کہ مبادا یہی تین ہزار سپاہی کسی وقت ان کے لیے مصیبت بن جائیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان خونریزیوں اور ہنگاموں کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ماضی کے حالات کا جائزہ لیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جب سے کینیا میں سفید آباد کار پہنچے ہیں اسی وقت سے مقامی لوگوں میں بے چینی پائی جا رہی ہے۔ انگریزوں نے اہل کینیا کی جائدادیں چھین چھین کر انھیں خانہ بدوشی پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جوں جوں ان پر معیشت تنگ ہوتی گئی وہ انگریزوں سے متنفر ہوتے گئے اور در پردہ انگریزوں کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی لوگوں نے یہاں زمینوں کی قیمتیں ادا کی تھیں۔ اور وہ اکثر غیر مزروعہ زمینوں پر قابض ہوئے تھے لیکن ایک بنیادی غلطی ایسی تھی جسے اس وقت کوئی اہمیت نہ دی گئی تھی اور یہی غلطی بعد ازاں بہت بڑی تباہی کا باعث بن گئی۔ یعنی انگریزوں نے یہ سمجھا کہ انھوں نے زمینیں قیمتاً حاصل کی ہیں۔ اس لیے انھیں ان پر مکمل حقوق حاصل ہیں۔ لیکن کِکیو یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی زمینوں پر انگریزوں کا قبضہ عارضی ہے اور کچھ مدت بعد انھیں یہ زمینیں واپس مل جائیں گی۔ ادھر انگریزوں نے بہت سے اور حصوں پر بھی قبضہ جمانا شروع کر دیا اور مقامی لوگوں سے جبراً زمینیں حاصل کرنا شروع کر دیں اور جب غریب افریقیوں نے اس کے خلاف احتجاج شروع کیا تو ان کی ہر آواز کو طاقت کے زور سے دبا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے کِکیو قوم کی معاشی ابتری کے ایسے سامان پیدا کر دیے کہ وہ از خود ہی اپنی زمینیں چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور اپنی جائدادیں بیچ بیچ کر انگریزوں کے فارموں پر بٹائی یا تنخواہ پر کام کرنے لگے۔ زمینوں پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے اگلا قدم یہ اٹھایا کہ کینیا کی تمام پیداوار پر اپنا تسلط جما لیا۔ اور جب یہ دیکھا کہ کِکیو ان کی زیادتیوں کی وجہ سے انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو انھوں نے اپنے کِکیو ملازمین کو اپنے فارموں سے نکالنا شروع کر دیا اور غریب کِکیو اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر قطعاً مجبور تھے اور انگریزوں کی چال کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ کیوں کہ وہ تو اب تک یہی سمجھتے آ رہے تھے کہ زمینوں کے اصل مالکان وہی ہیں اور انگریزوں کا قبضہ محض عارضی ہے۔ لیکن انگریزوں نے ان کو بالکل ہی بے دخل

کر دیا۔ اور جب اس کے خلاف اہل کینیا نے احتجاج کیا تو انگریزوں نے مجبور ہو کر ایک مختصر سا قطعہ زمین انھیں دینا چاہا، جو ان کے گھروں سے کافی فاصلے پر تھا اور نیروبی کی منڈی سے بھی کافی دور تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس پر انگریزوں نے ان کی تمام شکایات اور حقوق کے حصول کی ساری کوششوں کے خلاف اپنی طاقت کا استعمال کیا اور انھیں بالکل ہی کچل دینے کی تیاریاں کر دیں اور کی کیو کو زبردستی گھروں سے نکال دینے کا پروگرام طے کر لیا اور یہی وہ پس منظر ہے جو ماؤ ماؤ تحریک کا سبب ہوا۔

کی کیو اپنے حقوق کے لیے اور انگریزوں کی بے انصافیوں کے خلاف بار بار احتجاج کرتے اور متفقہ مظاہرے کرتے۔ لیکن ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جاتا۔ ۱۹۲۲ء میں نیروبی کے گورنمنٹ ہاؤس کے باہر قریبًا اٹھ ہزار کی کیو جمع ہوئے۔ وہ اپنے محبوب لیڈر ہاری تھکو کی گرفتاری کے خلاف نعرے لگا رہے تھے پولیس نے ان پر گولی چلائی جس سے سیکڑوں کی کیو زخمی اور دو سو سے زیادہ عورتیں اور مرد ہلاک ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد اہل کینیا کو یقین ہو گیا کہ برطانوی لوگ صلح صفائی اور رواداری سے ان کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں چنانچہ مشہور افریقی لیڈر ہاری تھکو کے سیکرٹری کینیاٹا کی سرکردگی میں ماؤ ماؤ کی تحریک ظہور میں آگئی۔

۱۹۳۷ء میں کی کیو قوم کے تمام لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کے مویشی اور سامان ضبط کر لیا گیا جس کے نتیجے میں انقلاب کی آگ جو آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی ایک لخت بھڑک اٹھی اور اس کے شعلے اتنے بلند اور ہمہ گیر ثابت ہوئے کہ انگریزوں کو اپنی تمام حماقتوں اور ظلم و ستم کا احساس ہونے لگا اور تباہ کن نتائج کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس وقت انہوں نے بڑی کوشش کی اور ہاتھ پاؤں مارے کہ کی کیو، لوگوں میں اپنے متعلق سہمدردی پیدا کر سکیں لیکن یہ بعد از وقت کی بات تھی۔ قتل و خون اور غارت گری کا طوفان اٹھ چکا تھا۔

ماؤ ماؤ تحریک اب ختم ہو چکی ہے۔ اس کے آغاز سے اب تک پندرہ ہزار ماؤماؤ قتل کیے گئے یا پھانسی پر چڑھائے گئے ہیں۔ دوسرے ہنگاموں میں مرنے والوں اور ہوائی جہازوں کی بمباری سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس پر مستزاد ہے۔ اس وقت تقریبًا پینسٹھ ہزار ماؤ ماؤ۔ جیلوں اور بیگاری کیمپوں میں بند ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ انھیں مستقل طور پر قید و بند کی حالت میں رکھا جا سکے۔ اور کیا عجب

کہ آزاد ہونے کے بعد یہ مجاہد منش لوگ پہلے سے کہیں زیادہ منظم ہو کر خطرناک بن جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر برطانوی حکومت نے افریقیوں کے حقوق کو تسلیم نہ کیا اور اپنی بے انصافیوں کا ازالہ کر کے ان کے امن و سکون کے فوری اور مناسب اقدام نہ کیے تو حالات ماؤ ماؤ کے دور سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوں گے۔

ادھر کینیا میں مقامی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے اور اس کے مقابلے میں سفید لوگوں کی تعداد میں ٹھہراؤ سا آگیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں کینیا کی خالص مقامی آبادی تین لاکھ تھی اور یوروپین لوگوں کی تعداد صرف اٹھتیس ہزار تھی اور موجودہ وقت میں افریقی آبادی پانچ لاکھ سے اوپر ہے اور انگریز صرف ترپن ہزار ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ایک لاکھ بیالیس ہزار ہندوستانی بھی ہیں، جن کی وجہ سے سیاسی اور سماجی مسائل روز بروز پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آبادی کا یہ تیز رفتار اضافہ قائم رہا تو آئندہ دس برس سالوں میں سیاہ لوگوں کے لیے مفلسی اور فاقہ کشی میں مبتلا ہونا یقینی ہے اور بے روزگاری عام ہو جانے سے سفید لوگوں کو پہلے سے کہیں زیادہ مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

کی کیو لوگ فطرتاً اور طبعاً صلح کُن ہیں لیکن جب تک ان کے معاشی مسائل کا دیانت دارانہ تصفیہ نہ کیا جائے گا ان سے صفائی ممکن نہیں۔ لیکن انگریزوں کی ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنی برتری اور قوت بحال رکھنا چاہتے ہیں اور ملک کے تمام انتظامی شعبوں پر خود ہی قابض رہنا چاہتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انھیں اس ملک سے بھی نکلنا پڑے گا اور شاید انھیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود کینیا میں ابھی ابھی ایک مخلوط مجلس انتظامیہ قائم ہوئی ہے جس میں چھے یورپین، ایک افریقی اور دو ایشیائی اقوام کے نمائندے ہیں لیکن ایک صحیح انتظامیہ کے لیے اس سے کہیں زیادہ مساوی نمائندگی کی ضرورت ہے۔ ورنہ افریقہ میں امن و امان کی حالت کا پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن قابلِ افسوس امر تو یہ ہے کہ اہلِ کینیا میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہونے کو ابھی کئی سال لگیں گے۔ کیوں کہ انہیں بڑی مدت سے مسلسل طور پر تعلیم سے ناآشنا رکھا گیا ہے۔

کچھ بھی ہو، انگریزوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ کینیا میں تعلیمی اور معاشی اصلاحات نافذ کریں اور ایسے مواقع پیدا کریں کہ کی کیو اپنے معاملات کو جلد سے جلد اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن یہ خطرہ

بدستورہ قائم ہے کہ انگریز کسی طرح بھی ایسا کرنے کو تیار نہیں اور وہ دن شاید ابھی دور ہے کہ افریقی لوگ بھی اپنی ملکی پیداوار اور معدنی دولت سے فائدہ اٹھانے میں سفید لوگوں کے برابر کے حصہ دار بن سکیں۔

دنیا کی اکثر اقوام میں جو کشیدگی اور چپقلش پائی جاتی ہے اگر اس کے اجتماعی تاثر سے ہٹ کر ان اقوام کے افراد کے جذبات کا اندازہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بحیثیت فرد کے ایک عام جرمن کسی انگریز یا فرانسیسی کے خلاف نہیں۔ نہ کسی عام روسی کو کسی دوسری قوم کے فرد سے پرخاش ہے۔ اسی طرح ایک عام کی کیو خواہ وہ ماؤ ماؤ میں ہی کیوں نہ شامل ہو ذاتی طور پر سفید لوگوں کے قتل عام سے ہرگز خوش نہیں۔ اسی طرح انفرادی طور پر سفید لوگوں میں بھی اکثر یہ چاہتے ہیں کہ افریقیوں کو اچھی زمینیں ملیں اور ان کے ساتھ بھی انصاف کا سلوک ہونا چاہیے۔ اگر آپ افریقہ میں رہ کر افریقیوں کے اطوار زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ انھیں مخلص اور متواضع پائیں گے۔ اور ان کے خلوص کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس ملک میں اس وقت لاکھوں کی تعداد میں غیر ملکی اقوام بس رہی ہیں۔ اور ان افریقیوں نے ہر قوم کے افراد کو خوش آمدید کہا ہے۔ اگر ان میں تلون مزاجی ہوتی اور خلق اور تواضع کا فقدان ہوتا تو سینکڑوں غیر ملکی قومیں یہاں آباد نہ ہو سکتیں اور نہ افریقیوں کو آج طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا۔ کینیا میں باوجود اتنی سیاسی بے چینی کے بھی انگریز اطمینان سے بس رہے ہیں۔ حالانکہ افریقی انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکہتے ہیں۔ اور تمام یوروپین اقوام کی نسبت کینیا میں رہنے والے انگریز زیادہ مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً بلجین کانگو میں کوئی بلجین مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کو ہرگز تیار نہیں۔ یا اکثر بلجین خواہ وہ حکمران طبقے سے ہوں پادری ہوں یا ڈاکٹر کانگو میں ایک مقررہ مدت کے لیے آتے ہیں اور واپسی کے لیے بڑے بے چین رہتے ہیں۔ وسطی افریقہ میں بھی یوروپین عارضی طور پر ٹھہرتے ہیں۔ مشرقی اور وسطی افریقہ میں یوروپین لوگوں کا اخلاقی معیار بھی نہایت پست ہے۔ ان کے اکثر مرد افریقی عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہیں جن میں سے ان کے کئی کئی بچے بھی ہوتے ہیں اور جب یہ اپنے آبائی وطن کو لوٹتے ہیں تو یہ عورتیں اور بچے یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور جو لوگ تنہا زندگی گذارتے ہیں وہ اتنی کثرت سے شراب نوشی کرتے ہیں گویا شراب پینا ان کے فرائض میں سے ہے اور انھیں یورپ سے محض اسی لیے بھیجا گیا ہے۔ یوروپین عورتوں میں مردوں کی نسبت زیادہ اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں اور گھر سے

دوری اور مردوں کی بے رخی کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔ اور گھریلو کاموں میں کوئی دل چسپی نہیں لیتیں۔
صحت اور تعلیم دو ایسے مسئلے ہیں جن کی بنا پر یورپین مبلغین افریقیوں کو عیسائیت کی جانب راغب کر سکتے ہیں۔ اس لیے یوروپین ڈاکٹر اور پادری یہاں انتہائی معروفیت میں رہتے ہیں۔ لیکن پچھلے چالیس پچاس سالوں کی مسلسل تبلیغی کوششوں کے باوجود افریقہ کے نیگرو ابھی تک اپنے آبائی مذہبی اعتقادات پر قائم ہیں اور عیسائیت کی طرف مائل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہاں پادریوں کا کام کچھ ایسا آسان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح ڈاکٹروں کو بھی خاص مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر محض اپنی فنی قابلیت اور مہارت کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہاں محض بیماری کا ازالہ ہی قابل حل مسئلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بیمار افریقیوں کے ذہن و دماغ سے وہم اور خوف کا دور کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری اہم ہے۔ جو ہر ڈاکٹر کو ہر مقام پر پیش آتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ توہم پرستی افریقیوں کی آبائی خصلت ہے۔ ایک مارگزیدہ آدمی ہمیشہ یہی خیال کرے گا کہ وہ کبھی بچ نہیں سکتا اور اس کا علاج سے شفا پانا قطعی ناممکن ہے کیوں کہ اس نے اس سے پہلے کئی آدمیوں کو سانپ کے زہر سے مرتے دیکھا ہے۔ ایسے موقعوں پر افریقی جادوگر اور منتر پھونکنے والے عامل بھی اپنے ہنر آزماتے ہیں اور انھیں ڈاکٹروں کے معاملے میں بہر حال ترجیح دی جاتی ہے جس سے ڈاکٹروں کا کام اور بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ منتر اور جھاڑ پھونک کے بغیر بھی اس کی جان بچ سکتی ہے۔ اکثر مریض محض اس لیے مر جاتے ہیں کہ ان پر موت کا خوف طاری ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی عامل یا جادوگر ان کی موت کا فتویٰ صادر کر دے تو بعض موت سے پہلے ہی اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر موت کی سی کیفیت طاری کر لیتے ہیں۔

افریقہ میں یورپین پیشہ ور شکاریوں کا گروہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا گذارہ محض شکار پر ہے۔ یہ لوگ افریقی سیاست میں مطلق دخل انداز نہیں ہوتے اور صرف اپنے شکار ہی میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اہل افریقہ ان کو عزت و احترام سے دیکھتے ہیں۔ گویا ان کے دلوں میں بستے ہیں۔ ان کے اطوار زندگی اتنے نمایاں اور دل کش ہوتے ہیں کہ دنیا کے تمام ممالک کی فلموں میں انھیں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شکاری دلیری یا جانبازی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اور ہر خطرے میں خاموش اور پر وقار رہنے کے عادی ہیں۔ ان کی رفتار اور گفتار

میں بھی امتیازی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں جب ٹرک اور موٹروں کا استعمال نہیں تھا تو ہر شکاری کو اپنے شکار کی مہم میں پچاس سے لے کر سو تک قلی لے جانے پڑتے تھے۔ قلیوں کی اتنی بڑی تعداد سے فائدہ اٹھانا واضح کرتا ہے کہ یہ شکاری کتنے خوش خلق ہیں۔ اور انھیں افریقیوں سے نباہ کرنا آتا ہے۔ وہ افریقہ کے ہر خطے کی بولی جانتے ہیں اور ہر علاقے کے لوگوں کے طرز زندگی سے واقف اور ان کی تمام اخلاقی خوبیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ شکار کی مہم میں بے شمار رائفلیں، کارتوس، خیمے، خوراک کے ذخیرے، ٹرک، دوائیاں، دریاں اور قالین وغیرہ لوازمات میں شامل ہوتے ہیں۔ اور روانگی کچھ اس ٹھاٹھ سے ہوتی ہے گویا کوئی شاہی جلوس جا رہا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ضرور ہے کہ یوروپین پیشہ ور شکاریوں کی کامیابی کا انحصار افریقی رہنماؤں پر ہوتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان کی جان بھی انھیں رہنماؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان افریقی رہنماؤں کا احترام اور تواضع انگریز شکاریوں کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ شکارگاہ میں پہنچ کر ان رہنماؤں کی ہدایت کے مطابق شکاری ضروری تیاریاں کر لیتے ہیں۔ ایک تجربہ کار اور ہوشیار افریقی رہنما سفید شکاری کا بہت ہی قیمتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ تمام سفید شکاری یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یوروپین شکاری محض انھی رہنماؤں کی بدولت شکاری کہلا سکتے ہیں۔ ان رہنماؤں کو تمام جنگلی جانوروں اور درندوں کی جبلت اور فطری خصائل کا انتہائی علم ہوتا ہے۔ وہ پہاڑوں کے پیچے پیچے سے واقف ہوتے ہیں اور دشوار اور پرخطر جگہوں پر نہایت آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں خطرناک درندوں کے جذبات کا اتنا وسیع اور ناقابل رد علم ہوتا ہے کہ گویا وہ بھی ان درندوں میں سے ہی ہیں اور انھوں نے انسانی رویہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ ایک شیر یا ہاتھی کو دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت صحیح صحیح بتا دیں گے۔ اس کے غم اور غصے کو فوراً بھانپ لیں گے اور ہر حالت میں ان کا اندازہ سو فی صد درست ہوتا ہے۔ وہ ایک زخمی شیر کے جذبات کو بھانپ کر اس کے ارادے سے شکاری کو خبردار کر دیتے ہیں۔ کہ کیا انھیں زخم خوردہ شیر کے حملے کا انتظار کرنا چاہیے یا نہیں۔

ان سفید شکاریوں اور افریقی رہنماؤں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ کیا باقی یوروپین لوگوں اور افریقیوں میں بھی تعاون کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ اور آئے دن ان کے درمیان جو کشیدگی بڑھ رہی ہے وہ آپس کے جذبۂ رفاقت سے ختم ہو سکتی ہے، یا نہیں؟ لیکن بظاہر یہ ممکن نہیں اور اس کے نتیجے میں اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سیاہ اور سفید لوگوں میں تعاون نہ پیدا ہو سکا تو نہ صرف افریقہ تمام دنیا کا امن خطرے میں پڑا رہے گا۔

جنوبی عراق کا عالمِ آب

انیس احمد

باغِ عدن

اہلِ عراق کا خیال ہے کہ باغِ عدن دریائے دجلہ اور فرات کے مقامِ اتصال پر واقع تھا۔ آج اس جگہ القرنا کا چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ یہاں اب تک ایک پرانا خاردار درخت کھڑا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ "یہ شجرۃ العلم" اور باغِ عدن کی آخری یادگار ہے اور اس کے پتے کھا لینے سے انسان نیک و بد کے درمیان تمیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ القرنا بصرہ سے زیادہ دور نہیں۔ جو سیاح بصرہ میں آتے تھے وہ خواہ مخواہ القرنا کو دیکھنے بھی چل نکلتے تھے "شجرۃ العلم" کے مجاور انہیں باغِ عدن کی اس آخری یادگار کے متعلق طرح طرح کے قصے سنا کر محوِ حیرت کرتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے یہ سال خوردہ خاردار درخت اچانک گر گیا۔ مجاوروں نے اس کی جگہ ایک اور درخت لگا دیا ہے۔ تاکہ ان کی آمدنی کا ذریعہ بند نہ ہونے پائے۔

القرنا کسی زمانے میں باغِ عدن ہو تو ہو اس وقت اس کے چاروں طرف میلوں تک پانی اور کیچڑ کی حکمرانی ہے۔ دریائے دجلہ اور فرات میں ہر سال بہار کے موسم میں طغیانی آتی ہے۔ دریاؤں کے بالائی حصوں میں یہ پانی کناروں کے اندر ہی رہتا ہے۔ مگر شط العرب میں یہ پانی کناروں کو پھاند کر چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ اس سے جنوبی عراق کی وہ مشہور دلدل پیدا ہو گئی ہے جس نے کوئی چھ ہزار مربع میل کا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ یہ دلدل خلیج فارس کے عین اوپر شط العرب کے دونوں کناروں پر عراق کی ایرانی سرحد کے قریب پھیلتی چلی گئی ہے۔

بصرہ سے بغداد کو جو پختہ سڑک دجلہ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جاتی ہے وہ اس دلدلے ویرانے میں سے ہی گزرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پانی کیچڑ اور لمبے بانسی گھاس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بانسی گھاس کی لمبائی بیس فٹ کو پہنچتی ہے۔ پانی اور کیچڑ کی اس دنیا میں بانسی گھاس کے گھنے جھنڈ

سر اٹھائے نظر آتے ہیں۔ آندھیاں ان جزیروں کو جگہ جگہ دھکیلے پھرتی ہیں اور اس طرح پانی اور کیچڑ کی اس دنیا کے خدوخال لگاتار بدلتے رہتے ہیں۔ عین اس طرح جس طرح آندھیاں قریبی صحرا میں ریت کے ٹیلوں کو جگہ جگہ اٹھائے پھرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ "باغ عدن" کے ویرانے کا چہرہ بھی مسلسل تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

اگر ریتلے ویرانوں میں آمدورفت مشکل ہے تو دلدلے ویرانے میں یہ کام اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ یہاں ریگستان کا جہاز، یعنی اونٹ کام نہیں دے سکتا۔ اس جگہ آنے جانے کے لیے کشتی کی ضرورت ہے۔ مگر دلدل اور بانسی گھاس کے متحرک جزیروں نے کشتی بانی کا کام اس قدر مشکل بنا رکھا ہے کہ کوئی ناواقف کشتی ران اس دلدلے ویرانے کا رخ نہیں کر سکتا۔ کسی اجنبی کا اس ویرانے میں داخل ہونا تو درکنار خود اہل عراق اس کے اندرونی حالات سے بہت کم واقف ہیں۔

کراچی سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بغداد یا بیروت کو جائیں تو بصرہ سے پرواز کرتے ہی نیچے بانسی گھاس اور دلدلوں کا ایک جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ ہوائی جہاز جب تک تھوڑی بلندی پر اڑ رہا ہو نیچے کہیں کہیں جھونپڑیاں اور بھینسیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے اجنبی کو حیرانی ہوتی ہے کہ اس دلدلے ویرانے میں انسان کس طرح بستے ہیں۔ اس سارے علاقے کا ہوائی منظر خاصا وحشتناک معلوم دیتا ہے۔ یہاں جو جفاکش قبیلے بستے چلے آئے ہیں ان میں معدی قبیلہ گنتی اور اہمیت کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔

جفاکش لوگ

دنیا کے بہت کم حصوں میں انسان کو زندگی گزارنے کے لیے اتنی سخت اور اس طرح لگاتار مشقت کرنی پڑتی ہے جس طرح پانی اور کیچڑ میں بسنے والے ان عراقیوں کو۔ حد یہ ہے کہ انھیں جھونپڑیاں بنانے کے لیے زمین بھی خود تیار کرنی پڑتی ہے۔ دلدلے ویرانے میں اگرچہ بعض جزیرے موجود ہیں جن پر گاؤں آباد ہیں۔ لیکن اس معاملے میں تمام گاؤں ایک سے خوش نصیب نہیں۔ بستی قائم کرنے کے لیے جب خشک جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لوگ بانسی گھاس کے گٹھے پانی اور کیچڑ میں پھینک کر انھیں اوپر سے کوٹتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایک خشک چبوترہ سا تیار ہو جاتا ہے۔ جس پر جھونپڑیاں بنالی جاتی ہیں۔ چبوترے کے اردگرد بانسی گھاس کے گٹھوں سے بند باندھ دیے جاتے ہیں۔ تاکہ موسم بہار کی طغیانی کے وقت پانی جھونپڑیوں میں نہ گھس آئے۔ لیکن یہ

بنا بعض اوقات طغیانی کا راستہ نہیں روک سکتے۔ تاہم یہ جفاکش لوگ اس صورت حال کے مقابلے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ اپنا مختصر سا سامان جھونپڑی کے اوپر رکھ دیتے ہیں اور خود بال بچوں سمیت ایک بلند چبوترے پر پناہ لیتے ہیں۔ ہر جھونپڑی کے ساتھ یہ چبوترہ موجود ہوتا ہے۔ بعض اوقات موسم بہار کی غیر معمولی طغیانی انھیں ہفتوں تک پریشان کیے رکھتی ہے۔

پانی اور کیچڑ کی اس دنیا میں پیدل چلنے کی نسبت کشتی رانی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ہر بچہ چلنا سیکھنے سے پہلے چپو چلانا سیکھ لیتا ہے۔ ہر کنبے کے پاس کم از کم دو ایک کشتیوں کا ہونا ضروری ہے کشتی کی مدد سے ہی پیٹ کے سارے دھندے پورے کیے جاتے ہیں۔ اور اسی کے طفیل آپس میں میل جول قائم رکھا جاتا ہے۔ بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کا ذریعہ بھی کشتی ہی ہے۔

ذریعہ معاش

ان دلدلی ویرانوں میں بسنے والے لوگوں کی بڑی دولت بانسی گھاس ہے۔ وہ نہ صرف اس سے اپنے مکان تعمیر کرتے اور اسے ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ یہی گھاس ان کی بھینسوں کے چارے کا کام دیتی ہے۔ اس مطلب کے لیے ہر کنبہ آس پاس کے جزیروں میں بانسی گھاس کاٹ لیتا ہے جب اس کے نرم شگوفے پھوٹ آتے ہیں تو انھیں چارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر کنبے کی دولت کا اندازہ اس کی بھینسوں سے کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہر کنبے کے پاس کوئی نصف درجن بھینسیں ہوتی ہیں۔ لیکن بعض امیر لوگوں کے پاس ان کی تعداد چند درجن کو جا پہنچتی ہے۔ بھینس کا دودھ۔ دہی۔ اور پنیر غذا کا کام دیتا ہے۔ اس کے گوبر سے اپلے بنائے جاتے ہیں جو ایندھن کا کام دیتے ہیں۔ تندرست بھینس کو کسی حالت میں ذبح نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر کوئی بھینس بیمار ہو جائے اور اس کے شفایاب ہونے کی امید نہ رہے تو اسے ذبح کر لیا جاتا ہے۔

گوشت حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کا بھروسہ بھینس کی بجائے مچھلیوں اور پرندوں پر ہے ان دلدلوں میں طرح طرح کے پرندوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے رہتے ہیں ان کا بندوق سے شکار کیا جاتا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے یہ لوگ جال استعمال نہیں کرتے بلکہ نیزوں سے مچھلی کا شکار

تے ہیں۔ جال سے مچھلی پکڑنا عرب شجاعت کے خلاف خیال کیا جاتا ہے۔ بعض قبیلے جو ماہی گیری کا کام
ہیں جال استعمال کرتے ہیں، لیکن ان قبیلوں کو فروتر درجہ دیا جاتا ہے۔

علی الصباح بھینسوں اور ان کے بچھڑوں کی آوازیں گاؤں والوں کو جگا دیتی ہیں۔ فوراً چھوٹے
یہ تمام کام میں لگ جاتے ہیں۔ بھینسیں دوہی جاتی ہیں۔ عورتیں چائے تیار کرتی ہیں۔ روٹی اور
ئے کے ناشتے کے بعد دن کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ بھینسیں پانی میں تیرتی ہوئی چراگاہ کی راہ لیتی
، لڑکے کشتیوں میں بیٹھ کر ان کی نگرانی کے لیے چل دیتے ہیں اور بڑے آدمی درانتی پکڑ گھاس
ٹنے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور باقی نیزہ پکڑ مچھلی کے شکار کو چل دیتے ہیں۔ سارا دن اسی تگ و دو میں گزر
اہے۔ جب شام کے افق کی سرخی دلدل کے پانی کو خونی رنگ میں رنگ دیتی ہے آدمی اور مویشی سب
ؤں کا رُخ کرتے ہیں۔ آدمی اور لڑکے کشتیوں کو چپو لگاتے ہوئے گھر کی طرف دوڑ آتے ہیں بھینسیں
، میں تیرتی ہوئی اپنے ٹھکانوں کا رُخ کرتی ہیں۔ شام کی سیاہی کے گہرا ہونے تک تقریباً سبھی اپنے
پنے گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ کشتیاں سبز چارے سے لدی آتی ہیں۔ کچھ میں بانسی گھاس کے گٹھے
ے ہوتے ہیں۔ اس گھاس سے نہ صرف ہر طرح کی گھریلو ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ بلکہ اسے چیر کر
ں سے عمدہ چٹائیاں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ یہ چٹائیاں دلدلے علاقے کی سب سے بڑی برآمد ہے، اس
مد سے جو آمدنی ہوتی ہے اہل دلدل اس سے بیرونی دنیا کی دوسری چیزیں خریدتے ہیں۔

پانی اور کیچڑ کی اس دنیا میں اگرچہ آمد و رفت کا واحد ذریعہ کشتیاں ہیں تاہم حمل و نقل کا یہ ذریعہ
صا تیز ہے۔ ایک چھوٹی کشتی دن بھر میں پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ ہر قسم کی تجارت
شتیوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دلدل کے کناروں پر کئی ایک تجارتی منڈیاں قائم ہیں۔ چٹائیاں اور دوسری
شیائے برآمد ان منڈیوں میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ان منڈیوں میں
ری جہاز آتے رہتے ہیں۔ ہر جہاز ہر قسم کی مصنوعات اور دوسری ضروری اشیاء دے جاتے ہیں اور
ن کے عوض اہل دلدل کی پیداوار لے جاتے ہیں۔

شدید قسم کے موسمی حالات | اہل دلدل کو کسب معاش کے لیے جو بے پناہ مشقت کرنا پڑتی ہے

اس کا درست اندازہ کرنے کے لیے وہاں کے موسمی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ خلیج فارس اور اس کے اردگرد کے علاقے اپنی تکلیف دہ گرمی کے لیے مشہور ہیں۔ دلدلے علاقوں میں یہ گرمی ایک عجیب دم گھٹنے والی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ جھلسنے والی گرمی اور رطوبت مل کر ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جیسے ابلتے ہوئے پانی میں تولیہ بھگو کر جسم کے گرد لپیٹ دیا ہو۔ اہل دلدل کو اس صبر آزما گرمی میں اپنی روزی کی دوڑ دھوپ بدستور جاری رکھنا پڑتی ہے۔

سردیوں میں شمال کی برفانی ہوائیں بلا روک ٹوک چلتی ہیں اور دلدل کے پانی کو یخ کی طرح سرد کر دیتی ہیں۔ اہل دلدل اسی سرد پانی میں کمر تک ڈوبے دن بھر گھاس کاٹتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس موسم میں تیز بارش اور طوفانی آندھیاں بھی آتی ہیں۔ غرض شدید قسم کے موسمی حالات اہل دلدل کے صبر و تحمل کا کڑا امتحان لیتے ہیں۔ صرف بہار کا مختصر سا موسم اس صبر آزما سختی میں تھوڑی دیر کے لیے خوشگوار تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ مارچ کا مہینہ آتے ہی دلدلے ویرانوں کا سینہ طرح طرح کے پھولوں سے چمک اٹھتا ہے۔ پانی اور کیچڑ کی یہ دنیا دفعتہً دلہن کی طرح سج جاتی ہے اور فطرت کا یہ نکھرا ہوا حسن اردگرد کی انسانی مشقت کو ایک گونہ خوشگوار بنا دیتا ہے۔

شدید موسمی حالات کے علاوہ اہل دلدل کو بعض اور مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ جنگلی جانوروں میں سے ان کے لیے سب سے زیادہ اذیت دہ جنگلی سور ہے۔ بعض اوقات لمبی گھاس کاٹتے کاٹتے دفعتہً آدمی کا پاؤں سور پر جا پڑتا ہے۔ اور یہ درندہ اسے شدید طور پر زخمی کر دیتا ہے۔ کئی دفعہ یہ زخم مہلک ثابت ہوتا ہے۔ جہاں کہیں جنگلی سور کا پتہ چل جائے اہل دلدل مل کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ وہ کشتیوں میں بیٹھ کر اس کے گرد حلقہ بنا لیتے ہیں اور اسے دھکیل کر پانی میں اتار دیتے ہیں۔

ایک اور خطرہ طوفان کا یک دم آ جانا ہے۔ اہل دلدل بڑی ہلکی پھلکی کشتیاں استعمال کرتے ہیں یہ کشتیاں تنگ آبی راستوں میں خوب کام دیتی ہیں۔ لیکن جب یہ چند میل چوڑے پانی میں سفر کر رہی ہوں اور یک دم طوفان کی زد میں آ جائیں تو ان کا ڈوب جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ ہر سال کچھ نہ کچھ آدمی اس طرح طوفان کی نذر ہو جاتے ہیں۔

مہماں نوازی

پانی اور کیچڑ کے یہ عرب باشندے مہماں نوازی کے معاملے میں بالکل ایسے ہی فراخ دل ہیں جس طرح باقی عرب قوم۔ ان کی بانسی جھونپڑیوں کے دروازے ہر آنے والے کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ جھونپڑی کے درمیان میں چند فٹ اونچی ایک دیوار ہوتی ہے جو اس دلان کو تقریباً دو برابر حصوں میں بانٹ دیتی ہے ان میں سے ایک حصہ دیوان خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور دوسرا زنان خانے کے طور پر۔ تاہم درمیانی دیوار اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ دیکھا نہ جا سکے۔ وجہ یہ کہ معری عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ دراصل ان لوگوں کی زندگی اس قدر پر مشقت ہے کہ پردے کے ساتھ عورت کے لیے کام کاج کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جھونپڑا کا جو حصہ عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ وہ باورچی خانے کا کام بھی دیتا ہے۔ عورتوں کا کام صرف بچوں کی دیکھ بھال کرنا اور کھانا پکانا ہی نہیں بلکہ باقی وہ ہر قسم کے کاموں میں بھی اپنے مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں

ایک امریکی سیاح جو حال ہی میں جنوبی عراق کے دلدلے ویرانے میں کچھ مہینے گذار کر آیا ہے۔ اپنے ذاتی تاثرات یوں بیان کرتا ہے :-

مجھے ایک عرب کشتی بان ایک چھوٹی سی کشتی میں بٹھا کر بانسی گھاس کے جزیروں میں سے گذرتا ہوا کیچڑ اور پانی کی اس عجیب و غریب دنیا میں لے آیا۔ میں اس دنیا کے باشندوں کے درمیان کچھ وقت گذارنا چاہتا تھا۔ تاکہ ان کے رہنے سہنے کے طریق کو قریب سے دیکھ سکوں۔ میرے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ کوئی برتن اور نہ کوئی اور سامان۔ بالکل خالی ہاتھ چلا تھا کہ اہل دلدل کی زندگی میں بھرپور طور پر شریک ہو سکوں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد دور سے کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں۔ یہ ایک گاؤں تھا۔ اس کے اردگرد بھینسیں پانی سے نتھنے باہر نکالے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پاس ہی کچھ لڑکے کھڑے ان کی رکھوالی کر رہے جوں ہی ہماری کشتی پر کنارے پر لگی ایک بوڑھا معری جس کی نگاہ ہم پر پڑ گئی تھی، دوڑتا ہوا آیا اور ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ عرب کشتی ران نے اسے میرے آنے کا مقصد بتایا۔ بوڑھے نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا میزبان بننا قبول کیا اور فوراً چائے لے آیا۔ عرب کشتی ران خدا حافظ کہہ کر اپنی کشتی میں سوار ہو کر وہ چلا۔ بوڑھے نے بڑا زور مارا کہ وہ چائے پی کر جائے مگر اس نے ایک نہ سنی۔ چائے سے تھوڑی دیر بعد

دوپہر کا کھانا آگیا۔ ایک بڑے پیالے میں ابلے ہوئے چاول پڑے تھے اور ان پر کھٹا دہی ڈالا گیا تھا۔

"رات کو میں بھی اہلِ خانہ کی طرح بانسی گھاس کے گدوں پر سویا۔ بستر معمولی مگر اجلا تھا۔ لیکن رات بھر مچھروں اور پسوؤں نے خوب دق کیا۔ حسنِ اتفاق سے پسوؤں کا کاٹنا مجھے کچھ پریشان نہیں کرتا۔ اس لیے پسو میرے آرام میں زیادہ خلل نہ ڈال سکے مگر مچھروں کی وہ بھرمار تھی کہ توبہ ہی بھلی۔

صبح سویرے جونہی بھینسیں اور ان کے بچھڑے بولنے لگے۔ سارا گاؤں اٹھ بیٹھا۔ اور چھوٹے بڑے تمام اپنے کام میں لگ گئے۔ سورج نکلتے ہی ناشتہ آگیا۔ ہر ایک نے کچھ روٹی کھا کر چائے کی چند پیالیاں پیں اور اپنے اپنے کام کی راہ لی۔ میں بھی اس کنبے کو خدا حافظ کہہ کر اگلے گاؤں کی طرف چل دیا۔"

اگرچہ ہر آدمی کی جھونپڑی مہمانوں کے لیے کھلی رہتی ہے۔ عموماً ہر گاؤں میں ایک مہمان خانہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بانسی گھاس سے تیار شدہ ایک خاصا بڑا ہال ہوتا ہے۔ اس کے ستون۔ محرابیں۔ دیواریں اور چھت ہر چیز بانسی گھاس سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کے بیرونی ستونوں کے نوکیلے سرے عمارت سے کافی اونچے چلے جاتے ہیں اور عمارت کو گرجے کی سی شکل دیتے ہیں۔ یہ مہمان خانہ "مضعف" کہلاتا ہے اور اس کا دروازہ ہمیشہ قبلہ رخ ہوتا ہے۔ ایک عام مضعف کوئی چالیس پچاس فٹ لمبا اور کوئی بیس فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ صاحبِ ثروت لوگوں کے مضعف اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ مضعف کی تعمیر میں ایسی فنی چابک دستی سے کام لیا جاتا ہے کہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بے پناہ کشادگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ فرش پر غالیچے بچھے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس جگہ گاؤں کے لوگ بھی فراغت کے اوقات میں جمع ہو جاتے ہیں۔

رسم و رواج

اس دلدل کی زندگی رنگا رنگ محنت اور مشقت کی زندگی ہے۔ مگر وہ اس زندگی کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے کشتی چلاتے ہیں۔ گھاس کاٹنے اور دوسرے کام کرتے وقت عموماً کوئی نہ کوئی گیت گاتے رہتے ہیں۔ ہر دن نئے نئے گیت ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ بعض گیت کچھ دن زبانوں پر جاری رہ کر متروک ہو جاتا ہے۔ رات کا اندھیرا چھا جانے کے بعد جب سب لوگ دن کی مشقت سے فارغ ہو کر گھروں کو آتے اور کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں تو عموماً کسی ایک گھر میں راگ کی محفل جم جاتی ہے۔ یہاں چند لوگ جمع ہو کر گانے لگتے ہیں

ساتھ طبلے کی آواز آنے لگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں اس جگہ جمع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات آ
کے لوگ بھی کشتیوں میں بیٹھ کر اس جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ راگ کے ساتھ ناچ بھی شروع ہو جاتا ۔
مجمع میں سے چھریرے بدن کے چند لڑکے راگ اور طبلے کی رُباب کے ساتھ ناچنے لگتے ہیں۔ تحسین و
نعرے بلند ہونے لگتے ہیں۔ اور راگ رنگ کی یہ محفل گھنٹوں جاری رہتی ہے ۔

اہل مجلس راگ اور ناچ کی لذت میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ انھیں ساری کلفتیں بھول
ہیں۔ مجمع میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر آنے والا تنگ سی جگہ میں گھس جاتا ہے۔ اگر جھونپڑی
اندر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہے تو بعد میں آنے والے اس کے ارد گرد کھڑے رہتے ہیں۔ جھونپ
میں بیٹھے ہوئے انبوہ کے بوجھ سے بعض اوقات اس کا گھاس سے بنا ہوا فرش دلدل میں دھنس جاتا
اور پانی لوگوں کے ٹخنوں تک چڑھ آتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا اور را
رنگ کی محفل بدستور جاری رہتی ہے ۔

گو ہر چھریرے جسم کا لڑکا اس قسم کی محفلوں میں خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔ اور بڑے بوڑھے
اس کے لیے لڑکوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ناچنے والے لڑکے کو "ناچیا" کہہ کر پکا
تو وہ بہت بُرا مانتا ہے۔ کیوں کہ ناچیے کا لفظ پیشہ ور ناچنے والے لڑکے کے لیے مخصوص ہے۔
ناچنے والے عموماً گاؤں سے گاؤں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کے گانے اور ناچنے کا ڈھنگ بھی بالکل
ہوتا ہے جو غیر پیشہ ور لڑکوں کا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اجرت لے کر ناچتے ہیں اور عام لڑکے
طور پر اس شغل کو اختیار کرتے ہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر گانے ناچنے کی محفل ساری ساری رات جاری رہتی ہے۔ شادی
کے لیے دولہا کو ایک خاص رقم سسرال کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ رقم عام طور پر تین بھینسوں کی۔ لڑکی
والدین اگر چاہیں تو اس رقم کا کچھ حصہ جہیز کی شکل میں لوٹا دیتے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ یہ سا
لڑکی کے جہیز پر صرف کر دیتے ہیں۔ شادی کے لیے دولہا خود دولہن کے گھر نہیں جاتا۔ بلکہ اس کے عز
اور دوست کشتیوں میں سوار ہو کر دولہن کے گاؤں کو جاتے ہیں اور دولہن کو لے آتے ہیں۔ دولہا

رہتا ہے اور دلہن کی آمد پر اس کا استقبال کرتا ہے۔ اس کے بعد گانے ناچنے کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔

تھلگ زندگی

اہل دلدل باقی دنیا سے تقریباً الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ خود اپنے ملک کے لوگوں سے بھی صرف اس قدر مراسم رکھتے ہیں کہ اپنی چٹائیاں قریبی منڈیوں میں بھیج کر ان کے عوض چھوٹی ضروریات زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی پانی اور کیچڑ کی دنیا سے باہر جانا پسند نہیں کرتے کہ بیرونی لوگ خلوت میں دخیل ہوں۔ بیرونی لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی اجنبی کے حسن نیت ہو جائے تو پھر اسے اپنا ہی ایک فرد خیال کیا جاتا ہے۔

عراق کے دوسرے باشندے اہل دلدل کو اپنے سے فروتر سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں عرب خیال نہیں بلکہ حقارتاً معدی کے نام سے پکارتے ہیں۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اہل دلدل کی رگوں میں خالص نہیں۔ بلکہ آشوری، بابلی، ایرانی، عربی وغیرہ ملا جلا خون موجیں مار رہا ہے۔ نسب کی اس گمنامی کے دوسرے عرب اہل دلدل کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ انگریزی دور میں اہل دلدل کی نیک نامی کو مزید بٹہ پہلی عالمی جنگ کے موقع پر انھوں نے انگریزوں اور ترکوں دونوں پر مار دھاڑ کی تھی۔

جن علاقوں کو آج کل دلدل نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ کبھی بابل اور دوسری قدیم تہذیبوں کا مرکز تھے۔ آج بھی کہیں کہیں دلدلی جزیروں کی تہ سے کوئی پرانے سکے یا بت وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن عالم آب نے صدیوں سے اس علاقے کی زندگی کو ایک عجیب و غریب صورت دے رکھی ہے۔ ان دنوں عراقی حکومت دلدلی علاقوں کو خشک کرنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ اگر یہ منصوبے ہو گئے تو اہل دلدل کا صدیوں پرانا طرز زندگی ختم ہو جائے گا۔ اہل دلدل کو آنتوں کی بیماری کی عام ہے۔ کیونکہ پینے کا پانی کے پاس سے ہی بھر لیا جاتا ہے۔ تاہم مچھروں کی بے پناہ افراط کے باوجود ملیریا برائے نام ہے وجہ یہ کہ دلدل کے مچھر ملیریائی جراثیم کے حامل نہیں۔

چاند کی سیر

شاہد اشرف

فضائے بسیط میں سفر

موجودہ صدی میں سائنس کا سب سے حیرت انگیز کرشمہ ایک جاندار کا فضائے بسیط میں سفر ہے یوں تو سائنس دان کئی سالوں سے اس امکان کو عملی شکل دینے کی کوشش میں تھے۔ مگر روس نے اپنے دوسرے مصنوعی چاند میں ایک کتے کو بطور مسافر بھیج کر اس امکان کو ایک حقیقت کی شکل دے دی ہے اب کوئی دن جاتا ہے کہ اہل زمین چاند پر پہنچنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ اس وقت ایسے راکٹ موجود ہیں جو چاند تک پہنچ سکتے ہیں اس میں جاندار مسافروں کو بھیجنے اور وہاں ان کے لیے زندگی کے لوازمات فراہم کرنے کے سوالات ابھی حل کرنا باقی ہیں۔ مگر سائنس جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ مستقبل قریب میں چاند کا سفر ممکن ہو جائے گا۔

تاہم چاند پر انسانوں کو بھیجنے سے پہلے سائنس دان وہاں مشینی آدمیوں کو بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آج انسان کی بنائی ہوئی مشینیں نہ صرف ہر قسم کی مشقت انجام دے رہی ہیں۔ بلکہ حساب کتاب کے ذہنی عمل بھی سرانجام دینے لگے ہیں۔ الیکٹرولز کی مدد سے سائنس والوں نے ان مشینوں کو ایسے "دماغ" عطا کیے ہیں جو انسانی ذہن کے بعض مشکل وظائف بھی خوبی سے انجام دینے کے قابل ہیں۔ یہ مشینی دماغ چاند پر پہنچ کر دنیا والوں کو وہاں کی کیفیت سے آگاہ کریں گے۔ ان معلومات کی روشنی میں چاند کے سفر کا بندوبست کیا جائے گا۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ اس سفر کے لیے انسان کو نہ صرف خلائی لباس پہننا ہوگا بلکہ اپنے ساتھ آکسیجن کے ڈبے بھی اٹھانے پڑیں گے۔ اس لباس اور آکسیجن کا وزن شامل کر کے ایک آدمی کا وزن کوئی تین سو پونڈ ہو جائے گا۔ پھر چاند تک پہنچ کر اسے پلاسٹک کے بنے ہوئے ایسے مکان کی ضرورت ہوگی جس کے اندر ہوا کے دباؤ کو ایک خاص درجے پر رکھا گیا ہو۔

چندا ماموں دور کے

سائنسی ترقی کے موجودہ دور سے پہلے چاند کو ایک ناممکن الحصول چیز سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اسے ایک ایسی حسین مگر دور دراز کی چیز سمجھا جاتا تھا جس تک انسان کی رسائی کسی صورت میں ممکن نہ تھی۔ جدید سائنس نے چاند کے حسن اور اس کی دوری دونوں کا بھرم کھو دیا ہے۔ نظام شمسی میں چاند زمین کا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ زمین سے اس کا اوسط فاصلہ صرف ۲۳۸۸۵۷ میل ہے۔ اس کی سطح اس قدر ٹوٹی پھوٹی۔ اونچی نیچی۔ زخم خوردہ اور غیر دلکش ہے کہ سطح زمین اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ حسین ہے۔

پرانے زمانوں میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چاند دراصل ایک شفاف آئینہ ہے جو آسمان سے زمین پر ٹھنڈے نور کی بارش کرتا ہے۔ اس کے خوش نما چہرے پر جو سیاہ داغ نظر آتے ہیں وہ دراصل زمین کے پہاڑوں کا عکس ہے جو اس کی بلورین سطح پر منعکس ہوتا ہے۔ لیکن جدید دوربین نے اس خوش فہمی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب اس قدر طاقتور دوربین موجود ہے جس کی مدد سے چاند اتنا قریب آ جاتا ہے گویا وہ زمین سے صرف دو سو میل دور ہے۔ اس قرب سے انسانی آنکھ چاند کی سطح کا جو منظر دیکھتی ہے بڑا سبق آموز ہے۔

ایک طاقتور دوربین میں سے چاند کو دیکھو تو اس کی سطح سفید چاک کی بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس منظر نے دیر تک سائنس دانوں کو الجھن میں ڈالے رکھا۔ مگر اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ چاند کی سطح خاکی یا سانولے رنگ کی ہے۔ چاک کی سی سفیدی کا تاثر باریک گرد کی اس موٹی تہ کے باعث پیدا ہوتا ہے جس نے چاند کی سطح کو لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ گرد کی یہ تہ چند انچ سے لے کر کئی فٹ تک گہری ہے۔ بعض نے اس کی گہرائی اس سے کئی گنا زیادہ بتائی ہے۔

جھلسا ہوا داغدار چہرہ

چاند کے نورانی چہرے کی تعریف میں شاعروں نے زورِ طبع ختم کر رکھا ہے اور اسے محبوب کے چہرے سے تشبیہ دی ہے۔ دوربین نے اس خوش فہمی کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔ چاند کی سطح کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ بے شمار گڑھے ہیں جنھوں نے اس کے چہرے کو چیچک کے داغوں کی طرح بدنما بنا رکھا ہے۔ چاند اپنا جو رُخ ہمیشہ زمین کی طرف موڑے رکھتا ہے اس پر کم و بیش تیس ہزار گڑھے گنے گئے ہیں

ان میں سے بعض کا قطر صرف چند ہزار گز ہے۔ مگر ایک کا قطر ڈیڑھ سو میل ہے اور گہرائی چار میل۔ ان گڑھوں کے علاوہ چاند کے اس نصف کرے میں کوئی ایک درجن پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بھیانک چوٹیاں جگہ جگہ سر اٹھائے نظر آتی ہیں۔ ایک کی چوٹی کی بلندی ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ یہ چوٹی تقریباً چھ میل اونچی ہے۔

زمین کا قطر ۷۹۲۷ میل ہے۔ اس کے مقابلے میں چاند کا قطر صرف ۲۱۶۰ میل ہے۔ زمین کے مقابلے میں اس قدر چھوٹا ہونے کے باوجود چاند کی سطح پر اس قدر جھریاں ہیں اور وہ اس قدر نمایاں ہیں کہ اس کا چہرہ زمین کے چہرے سے کہیں زیادہ بدنما ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کردینی چاہیے کہ سائنس دانوں نے چاند کے پہاڑوں اور اس کے گڑھوں کی پیمائش کس طرح کی۔ یہ کام دراصل اس قدر مشکل نہیں جس قدر بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ سطح زمین پر بھی پہاڑوں کی چوٹیوں کی بلندی ان کے سایے سے معلوم کی جاتی ہے۔ یہ چوٹیاں سب سے لمبا سایہ طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے وقت پیدا کرتی ہیں۔ اس سایے کی مدد سے ان کی لمبائی کا حساب بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ چاند کے پہاڑوں کی بلندی اور اس کے نشیبوں کی گہرائی اسی طور پر معلوم کی گئی ہے۔

چاند اہل زمین کی طرف ہمیشہ ایک ہی رُخ کیے رکھتا ہے۔ وجہ یہ کہ زمین کی طرح چاند کی بھی دو گردشیں ہیں (۱) محوری (۲) دوری۔ مگر جہاں زمین اپنی محوری گردش ۲۴ گھنٹوں میں پوری کرتی ہے اور گردش دوری ایک سال میں وہاں چاند اپنی دونوں گردشیں ایک ہی مدت یعنی ½ ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل زمین کو چاند کی دوسری طرف دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ ہاں چاند کی محوری اور دوری گردشوں کے وقت میں جو معمولی سا فرق ہے اس سے اتنا ہوتا ہے کہ کبھی اس کے کنارے سے تھوڑا سا حصہ اہل دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگیا اور کبھی دوسرے کنارے کا تھوڑا سا حصہ۔ اس طرح چاند کی کل سطح کا تقریباً ۵۹ فی صد حصہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم گمان غالب یہی ہے کہ چاند کی باقی ماندہ سطح بھی اسی قسم کی ہوگی جیسی یہ ۵۹ فی صد سطح۔ مستقبل قریب میں جب انسان اس قابل ہو جائے گا کہ جٹ طیاروں کی

مدد سے "مشینی دماغ" چاند کے عقبی حصے میں بھیج سکے تو یہ دماغ اس حصے کی سطح کے متعلق اہل دنیا کو پہلی بار یقینی معلومات اہل دنیا کو بہم پہنچائیں گے۔ اور یہ چیز تاریخ عالم میں ایک بہت بڑے سنگ میل کا درجہ حاصل کرے گی۔

چاند کی محوری اور دوری گردشوں کے ایک ساتھ ختم ہونے کا ایک اور نتیجہ اس کے موسم کی خوفناک شدت ہے۔ چاند اپنے محور کے گرد ایک گردش ½ ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں دو ہفتوں کا دن اور دو ہفتوں کی رات ہوتی ہے۔ چاند کے ہر حصے پر سورج پندرہ دن تک پوری شدت کے ساتھ چمکتا ہے اور بالائی سطح کے درجۂ حرارت کو کھولتے ہوئے پانی سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔ اس جلا دینے والی گرمی کے بعد دو ہفتے کی لمبی رات شروع ہو جاتی ہے۔ اور وہی بالائی سطح جو پہلے آگ کی طرح گرم تھی۔ اب ٹھنڈی ہو کر برف سے بھی زیادہ سرد ہو جاتی ہے۔ اس کا درجہ حرارت منفی ۲۴۳° فارن ہیٹ کو جا پہنچتا ہے۔

درجہ حرارت کے اس شدید تفاوت نے چاند کی بالائی چٹانوں کو بری طرح توڑ پھوڑ کر انھیں پیس کر رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ بالائی سطح سورج کی تپش سے جل رہی ہو یا لمبی رات کے اندھیرے میں برف سے زیادہ سرد ہو رہی ہو، درجہ حرارت کی یہ کیفیت صرف بالائی سطح کے چند انچوں تک محدود رہتی ہے۔ کیوں کہ سطح کے چند انچ موٹے چھلکے سے نیچے غیر موصل چٹانوں کی تہیں واقع ہیں جو شدید گرمی یا سردی کو آگے بڑھنے سے روک سکتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چاند سے ریڈیائی قوت کی جو لہریں لگاتار زمین پر وصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی قوت ماہ نو سے لے کر اماوس تک بالکل یکساں رہتی ہیں۔ ریڈیائی قوت کی یہ لہریں چاند کی بالائی سطح سے چند انچ نیچے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی دائمی یکسانیت اس بات کا ثبوت ہے کہ جس چٹان سے وہ آ رہی ہیں اس کا درجہ حرارت ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔

پانی کا سمندر

دوربین کی ایجاد کے بعد جب سائنس دانوں نے چاند کا مطالعہ شروع کیا تو ان کی ناقص دوربینیں

ان سیاہ دھبوں کے صحیح خدوخال ظاہر نہ کرسکیں جو چاند کے روشن چہرے پر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ان دھبوں کو سمندر قرار دے کر ان کے مختلف نام رکھ دیئے۔ سترھویں صدی کے یہ نام آج تک چلے آتے ہیں۔ لیکن موجودہ دوربین میں سے ان نام نہاد سمندروں کا مطالعہ کرو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پست، اور ہموار میدان ہیں۔ گویا چاند کی ساری سطح اس بری طرح کٹی پھٹی ہے اور اس پر جگہ جگہ اتنے گڑھے اور پہاڑوں کی اتنی قطاریں ہیں کہ اس پر زمین کی طرح ہموار میدان کا ملنا ناممکن ہے۔ تاہم اس کی سطح کا جو حصہ سیاہ دھبوں نے روک رکھا ہے وہ نسبتاً کم کٹا پھٹا ہے۔

دوربین میں سے اچھی طرح دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چاند کا یہ حصہ لاوے کے سیلاب سے ڈھکا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حصہ سیاہ نظر آتا ہے۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ حصہ بھی کسی زمانے میں باقی سطح کی طرح گڑھوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان گنت صدیاں گذریں چاند کے بطن سے لاوے کا ایک سیلاب پھوٹ پڑا جس نے اس پست حصے پر ایک موٹی تہ جما دی۔ اس طرح اس حصے کے گڑھے بھی لاوے سے پر ہو گئے۔

حال ہی تک چاند کے متعلق بعض عالموں نے یہ نظریہ بھی پیش کر رکھا تھا کہ یہ کسی زمانے میں زمین ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس زمانے میں زمین ابھی دہکتے ہوئے لاوے کا ایک گولا تھی۔ شدید حرکت کی وجہ سے اس سیال مادے کا کچھ حصہ الگ ہو کر چاند کی شکل اختیار کر گیا۔ جس جگہ سے لاوے کا یہ حصہ الگ ہوا تھا وہاں ایک گہرا گڑھا پیدا ہو گیا۔ جو آج کل بحر الکاہل کی شکل میں موجود ہے۔ یہ نظریہ بظاہر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اب تمام عالموں کا اتفاق اسی بات پر ہے کہ زمین چاند اور باقی سیارے فضا میں موجود آتشیں گیسوں کے منجمد ہونے سے وجود میں آئے ہیں۔

یہاں ہمارے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر چاند پر پانی کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پانی کی موجودگی کے لیے کرۂ ہوائی کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے سمندروں سے جو بخارات پانی بن کر اڑتے ہیں انھیں کرۂ ہوائی کا غلاف فضائے بسیط میں چلے جانے سے روکتا ہے۔ کرۂ ہوائی کی بدولت وہ بارش اور برف کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح جو پانی بخارات بن کر اڑتا ہے۔ بالآخر دوبارہ سمندروں میں

پہنچ جاتا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ چاند کے گرد کرۂ ہوائی کا کوئی غلاف موجود نہیں اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ چاند جس سیارے یا ستارے کے سامنے آتا ہے وہ یک دم نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ اگر چاند کے گرد زمین کی طرح ہوائی چادر لپٹی ہوتی تو اس سیارے یا ستارے کی روشنی کچھ دیر تک کرۂ ہوائی میں سے منعکس ہو کر ہمیں دکھائی دیتی۔

ہوا کا غلاف کیا ہوا؟

بہت اغلب ہے کہ چاند اپنے بچپن کے زمانے میں اسی طرح ایک ہوائی غلاف میں لپٹا ہوا ہو جس طرح زمین کے گرد ہوا کا غلاف آج تک باقی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی کشش ثقل اس قدر قوی ہے کہ ہوا کے لطیف ذرات کو فضائے بسیط میں اڑ جانے سے روکے رکھتی ہے۔ اگر زمین کی کشش ثقل کمزور ہوتی تو ہوا اور پانی کے ذرات کبھی کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہوتے اور دنیا ایک خشک اور مردہ سیارہ بن چکی ہوتی۔ چاند کا قطر اگرچہ زمین کے قطر کا ایک چوتھائی ہے۔ مگر اس کا حجم اس نسبت سے کافی کم ہے اس مناسبت سے اس کی کشش ثقل کم ہے۔

اگر کبھی چاند میں ہوا اور پانی موجود بھی تھے تو وہ اسی وقت تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے جب تک ان کی رفتار ڈیڑھ میل فی سیکنڈ سے کم تھی۔ چاند کی کشش ثقل ڈیڑھ میل فی سیکنڈ تک کی رفتار پر قابو پا سکتی ہے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ جونہی ہوا اور پانی کے ننھے ذرات کی رفتار ڈیڑھ میل فی سیکنڈ سے بڑھی ہو گی۔ چاند کی کشش انھیں روکے رکھنے سے عاجز آ گئی ہو گی اور وہ رفتہ رفتہ اس سے دامن چھڑا کر فضائے بسیط میں گم ہونے لگے ہوں گے۔ اس عمل کو مکمل ہونے کے لیے صرف ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی کم عرصہ درکار تھا۔

تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اب بھی چاند میں کرۂ ہوائی کے کچھ بچے کھچے اجزا باقی ہوں۔ مثلاً زینون اور کرپٹن جیسی بھاری گیسیں شاید اب تک چاند کے پنجے سے رہائی نہ پا سکی ہوں۔ مگر اس قسم کا برائے نام کرۂ ہوائی چاند کی دنیا کو کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ چاند کے بہت گہرے گڑھوں میں جہاں سورج کی شعاعیں کبھی داخل نہیں ہوئیں۔ لاکھوں سال پہلے کی برف اب تک موجود ہو

ن اس تیخ کا وجود بھی چاند کی جھلسی ہوئی دنیا کے لیے قطعاً بے کار ہے ۔

ردہ دنیا

غرض چاند ہر قسم کی زندگی سے خالی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی روئیدگی ہے اور نہ کوئی جاندار۔ نہ صرف
لہ وہاں ہوا اور پانی نا پید ہیں بلکہ درجہ حرارت بھی اس قدر خوفناک انتہاؤں کو جا پہنچتا ہے کہ کسی قسم کی زندگی
ر روئیدگی ممکن نہیں رہتی۔ ہوائی غلاف کے نہ ہونے کے باعث یہاں سورج کی وائلٹ کرنیں اور ایکس کرنیں
ی اپنا کام پوری شدت سے کرتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ چاند ایک مردہ دنیا
ہے۔ حد یہ ہے کہ یہاں کسی قسم کے کیڑے مکوڑوں کے زندہ رہنے کا امکان بھی نہیں۔ غرض چاند میں ان گنت
صدیاں پہلے شاید زندگی کی کوئی رمق ہو۔ آج اس کا نام و نشان تک باقی نہیں۔

چاند کا مشاہدہ کرنے والوں نے اس کے ان گنت گڑھوں کے رنگ کو اکثر تبدیل ہوتے دیکھا ہے
س سے پہلے یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ یہ تبدیلی شاید روئیدگی کے رنگ کی تبدیلی کے سبب ہے۔ مگر اب یہ
ابت ہو چکا ہے کہ چاند میں روئیدگی نام کو نہیں۔ گڑھوں کی رنگت میں تبدیلی محض روشنی کے زاویے
ی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ صبح اور شام کے اوقات میں روشنی کا زاویہ تیزی سے بدلتا ہے جس سے
بے چوڑے گڑھوں کے عکس میں فرق نظر آنے لگتا ہے۔

غرض جو لوگ چاند کا سفر کرنے کے ارادے باندھ رہے ہیں انھیں ایک ایسی دنیا کے لیے تیار
ہنا چاہیے جو نہ صرف ہر طرح کی زندگی سے خالی ہے بلکہ جس کا عام منظر غیر معمولی طور پر بھیانک ہے اور
س کی کٹی پھٹی سطح سنسناتے پہاڑ اور خوفناک گڑھے ایک عجیب قسم کی وحشت کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔

چاند کے پُراسرار گڑھے

چاند کا جو رخ ہمیں نظر آتا ہے اس پر کم و بیش تیس ہزار گڑھے ہیں ان میں سے بعض کا قطر
سو، ڈیڑھ سو میل کو پہنچتا ہے۔ ان گڑھوں کی دیواریں اندر اور باہر دونوں طرف سیڑھیوں کی شکل اختیار
لیے ہوئے ہیں۔ کئی گڑھے اتنے بڑے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے عین وسط میں کھڑا ہو تو اسے ان کی دیواریں
نظر نہیں آ سکتیں۔ کیوں کہ وہ چاند کی سطح کے خم میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ان گڑھوں کے متعلق پہلے یہ خیال تھا کہ وہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہیں. لیکن اب خیال پوری طرح غلط ثابت ہوچکا ہے. پہلی وجہ یہ کہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں کے منہ اتنے چوڑے نہیں ہوتے جتنے چوڑے چاند کے اکثر گڑھے ہیں. دوسری بات یہ کہ ہر جوالا مکھی کے دہانے گرد سرد شدہ لاوے کا ایک مخروطی پہاڑ بن جاتا ہے جو حجم میں دہانے سے کئی گنا بڑا ہوتا ہے. ہم کے گڑھوں کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی. ان کے گرد کوئی مخروطی پہاڑ موجود نہیں. ان کی دیواریں زیادہ سے زیادہ صرف اتنی موٹی ہیں کہ اگر انھیں گراکر گڑھے میں ڈال دیا جائے تو گڑھا پُر ہو جائے.

چاند کی سطح پر یہ گڑھے کس طرح پیدا ہوئے؟ ان گڑھوں کے متعلق ایک بات یقینی ہے وہ یہ کہ انھیں وجود میں آئے ان گنت صدیاں گذر چکی ہیں. ان کے کنارے عمل فرسودگی سے اس قدر شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں کہ بعض گڑھے انصف دائرے کی شکل اختیار کر چکے ہیں. پھر ان گڑھوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کئی دفعہ ایک گڑھا ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرا شروع ہو جاتا ہے. اکثر گڑھوں کا اندرونی حصہ دیوار کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث مٹی اور چٹانوں سے اٹا پڑا ہے.

یہ ساری باتیں ان گڑھوں کے وجود میں آنے کا صرف ایک ہی سبب ظاہر کرتی ہیں. وہ یہ کہ فضائے بسیط سے پہاڑوں اور چٹانوں کے جو ٹکڑے چاند کو نشانہ بناتے رہے اس کے چہرے پر یہ داغ ان کے پیدا کیے ہوئے ہیں. ہم زمین کی طرف آنے والے شہاب ثاقب اکثر دیکھا کرتے ہیں، یہ دراصل چٹان کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو فضائے بسیط میں گھومتے پھرتے زمین کے قریب آ نکلتے ہیں. اور زمین کی کشش ثقل انھیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے. مگر کرۂ ہوائی میں داخل ہوتے ہی ہوا کی بے پناہ رگڑ سے انھیں آگ لگ جاتی ہے اور بسا اوقات زمین پر پہنچنے سے پہلے پہلے ہی وہ تمام تر جل کر راکھ ہو جاتے ہیں. تاہم چٹان کا کوئی ٹکڑا بہت بڑا ہو تو اس کا کچھ حصہ زمین پر آن گرتا ہے. چوں کہ وہ بہت زیادہ بلندی سے بے تحاشا رفتار کے ساتھ آتا ہے اس لیے وہ جس جگہ گرے وہاں گڑھا پیدا کر دیتا ہے. فضائے بسیط میں چکر لگانے والی چٹانوں کی تعداد اب بہت گھٹ گئی ہے. مگر ابتدائے عالم میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی. زمین پر شہاب ثاقب کے گرنے سے جو گڑھے پیدا ہوئے ان میں سے اکثر عمل فرسودگی کے باعث ناپید ہو چکے ہیں. لیکن بعض

اب تک باقی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا گڑھا گلینڈا کے صوبہ کوئبک کے شمالی حصے میں واقع ہے اس کا قطر ۱۱۰۰۰ فٹ ہے۔

زمین کو ہوائی غلاف سے جو حفاظت حاصل ہے چاند اس سے محروم ہے۔ نتیجہ یہ کہ فضائے بسیط سے چٹانوں کے جو دیوہیکل ٹکڑے چاند کا رُخ کرتے رہے وہ بلا روک ٹوک اس کے سینے کو اپنا نشانہ بناتے رہے۔ انھیں جلا کر راکھ کرنے کے لیے کوئی ہوائی کرہ موجود نہ تھا۔ اس ہیبتناک بمباری نے چاند کی جو درگت بنائی اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ اس قیامت خیز سماں کا تصور اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا جا سکتا ہے۔ ایٹم بم نے ہیروشیما کے شہر کو جس طرح آن کی آن میں پیوست زمین کر دیا تھا وہ حالیہ تاریخ کا ایک وحشت ناک واقعہ ہے۔ چاند کی سطح کو ایک قیامت خیز آسمانی بموں نے جس طرح تہ و بالا کیا وہ کروڑوں ایٹم بموں کی تباہی سے کم نہ تھا۔ پہاڑوں کے پہاڑ بجلی کی تیزی کے ساتھ چاند کی سطح پر گرتے تھے اور اس کے سینے کو چیرتے ہوئے اس کے مرکزِ ثقل تک دھنس جاتے تھے۔ اس قیامت خیز بمباری سے چاند کا کرہ خود اس کے پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔ اور اس کے سینے کے ہر گھاؤ سے آتشیں لاوا پھوٹ کر چاروں طرف برسنے لگتا تھا۔ لاوے کی یہ لکیریں اب تک دکھائی دیتی ہیں۔ چاند کے عین جنوب میں جو بہت بڑا گڑھا موجود ہے اس سے پھیلنے والی لاوے کی لکیریں چاند کے ہر فوٹوگراف میں روشنی کی ایسی کرنوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو کسی منبع نور سے پھوٹ کر چاروں طرف بکھر رہی ہوں

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب فضائے بسیط میں گھومنے والی چٹانوں کی تعداد کم ہوتی گئی تو چاند آسمانی بمباری بھی گھٹتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کی سطح پر ایسے گڑھے بہت کم ہیں جن کے کنارے ٹوٹے پھوٹے نہ ہوں۔ (باقی آئندہ)

معلومات عامہ

ہمارے دیہات اور نظام پنچایت

مغربی پاکستان کی معاشی اور معاشرتی ترقی سے متعلقہ محکموں اور اداروں کی تعلیم نو کے سلسلے میں نظام پنچایت کی ن واصلاح بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہمارے معاشرہ کی بنیاد دیہات میں ہے۔ اس لیے دیہاتی آبادی کو ترقی یافتہ جمہو اور خوشحال بنائے بغیر ہم پاکستان کو ایک حقیقی جمہوریہ نہیں بنا سکتے۔ جمہوریت اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتی ج وہ نیچے سے پروان نہ چڑھے اور عام لوگوں کے انفرادی اعمال، باہمی سلوک، اور خیالات و تصورات میں حقیقی جمہوری ق جگہ نہ حاصل کر لیں۔ جمہوریت کو صرف اسمبلیوں کے انتخابات تک محدود رکھنے سے فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اس طرح سما جائے کہ ہمارا معاشرہ اور جمہو ایک ہی امر کے دو نام ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ہر گاؤں کو ایک چھوٹا سا جمہوریہ بنانا ہوگا۔ اور اگ نظام پنچایت کو درست خطوط پر رائج کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یقین رکھنا چاہیے کہ ہم اپنی قومی زندگی کی مختلف و متعدد خرابیوں اور ناہمواریوں سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

آزادی سے قبل کے دیہات ہم میں سے ہر ایک کو یہ علم ہے کہ آزادی سے قبل ہماری دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ غیر ملکی حکومت محض انتظامی نوعیت کی حکومت تھی اور اس کے دیہات سے صرف دو مفاد وابستہ تھے (۱) مالیہ وصول کرنا اور (۲) اپنی فوجوں کے لیے جوان بھرتی کرنا۔

موجودہ مغربی پاکستان ان دو گانہ مقاصد کے حصول کا مرکز تھا۔ ہم غیر ملکی خزانہ بھرنے کے علاوہ اپنے بہترین جوان بھی معمولی معاوضہ کے بدلے اسے دیتے تھے۔ ہماری دیہاتی زندگی حد درجہ خشک اور بے کیف تھ گاؤں کی سوسائٹی میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز شدت سے قائم تھا۔ اس وقت کے سرکاری افسر عوام کے خادم اور بہی خواہ ہونے کے بجائے ان کے حکمران تصور ہوتے تھے۔ چند انتظامی امور اور لاء اینڈ آرڈر کو برقرار رکھنے کے سو ان کے ذمہ نہ تو کوئی دوسرا فرض تھا اور نہ انہیں عوامی فلاح و بہبود کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ یہ افسر پہلے تو دیہ کا رخ ہی بہت کم کرتے تھے اور اگر انہیں کبھی دیہاتی دوروں کا اتفاق ہو بھی جاتا تو ان کے یہ دورے عوام کے لیے

خوف اور مصیبت کا باعث بنتے۔ زراعت، تعلیم، صحت اور امداد باہمی کے محکموں کی سرگرمیاں نہایت محدود بلکہ زیادہ تر رسمی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ لیکن آدھ علاقے میں دیہات سدھار کے کاموں کا سب سے بڑا مقصد بھی دیہاتی آبادی کو قومی تحریکوں کے اثرات سے بچانا تھا۔

بدقسمتی سے ہماری قومی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے بھی دیہات میں جمہوری اداروں اور معاشرتی اصلاح کے کاموں کی طرف بہت کم توجہ دی۔ ان کے پروگراموں میں بڑی بڑی آئینی اصلاحات، سیاسی آزادی، چند طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے مطالبات اور خوش آئند وعدوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی جماعت نے دیہات سدھار کی تحریک چلائی بھی تو اس کا مقصد معاشی ترقی اور معاشرتی اصلاح سے زیادہ سیاسی پروپاگنڈا ہوتا تھا۔ اس لیے ہمارے دیہاتیوں کے خیالات تصورات اور سرگرمیوں میں کوئی خاص جنبش نہ آئی۔

پنچایتوں کا ابتدائی دور | چناں چہ دیہاتیوں میں کافی عرصہ تک سیلف گورنمنٹ کا تصور پیدا نہ ہو سکا۔ اور جب اس کا پہلا مرحلہ شروع ہوا تو رائے دہی کا حق چند شرف یافتہ لوگوں تک محدود کر دیا گیا۔ دیہاتی عوام سے ملکی معاملات میں کسی قسم کا مشورہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس لیے وہ سرکاری نیم جمہوری اداروں سے بے پروائی اور سرد مہری برتتے تھے۔ ہمارے مختلف علاقوں میں جو دیہاتی جرگے اور پنچایتیں قائم کی گئیں وہ اپنی نمائندگی اور کارکردگی کے اعتبار سے ہمارے ان قدیمی جرگوں سے بھی گئی گزری حالت میں تھیں۔ جو صدیوں پیشتر ہمارے اسلاف کے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے معرض وجود میں آئی تھیں۔ غیر ملکی حکومت کی ان قائم کردہ پنچایتوں اور جرگوں کا زیادہ سے زیادہ مقصد خاص خاص نوعیت کے دیوانی اور فوجداری تنازعات کا فیصلہ کرنا تھا۔ ان اداروں کے نامزد ممبر اکثر ان پڑھ ہوتے تھے۔ جو عوام سے زیادہ حکومت کے خیر خواہ تھے۔ سابق صوبہ سرحد، بلوچستان اور دوسرے سرحدی علاقوں میں قانون سرحدی جرائم کے تحت جو جرگے قائم ہوئے ان کی نوعیت ان علاقوں کے قدیمی جمہوری جرگوں سے بھی مختلف تھی۔ حکومت ان جرگوں کے لیے جو ممبر نامزد کرتی وہ قتل یا بعض دوسرے جرائم کے ان ملزموں کے مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے جن پر قانونی شہادت یا ثبوت نہ ہونے کے سبب باقاعدہ عدالتوں میں مقدمے نہیں چلائے جا سکتے تھے۔

سابق پنجاب کی پنچایتیں | حکومت ہند نے جب پنچایت ایکٹ میں ترمیم کر کے اس کا دائرہ متحدہ پنجاب

تک وسیع کیا تو کچھ عرصہ کے بعد سابق صوبۂ سرحد بھی اس ایکٹ کے تحت آ گیا۔ لیکن پنچایتیں عملاً تقریباً پنجاب ہی میں قائم ہوئیں اور موجودہ مغربی پاکستان کے باقی سارے علاقے ان سے محروم رہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان پنچایتوں نے سابق صوبہ پنجاب میں کچھ ایسے کام کیے جو دیہات میں صحت مند ماحول پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ لیکن چونکہ عام شعور کے فقدان کے سبب ان کو عوامی تائید اور سرگرم تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ اس لیے یہ جامد اور غیر متحرک ادارے بن کر رہ گئے اور ان سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔

آزادی کے بعد آزادی کے بعد ہمارے عوام میں ایک عجیب قسم کا احساس پیدا ہوا۔ پاکستان اور اپنی حکومت کے قیام کے بعد ان میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی ساری مصیبتیں اور تکالیف فوراً دور ہوں۔ حکومت نے عوام کی بڑھتی ہوئی خواہش کا احساس کر کے ترقی و تعمیر کے کاموں میں قدم اٹھانے شروع کیے۔ حکومت کا پرانا نظریہ بدلنے لگا اور محض انتظامی اور لا اینڈ آرڈر کی حکومت نے ایک فلاحی حکومت کی صورت اختیار کر لی۔ تعمیر و ترقی کے مختلف کاموں کے ساتھ عوامی فلاح و بہبود اور جمہوریت کے فروغ کے ادارے بھی قائم ہونے لگے، دیہاتی امداد کے ایک وسیع اور جامع پروگرام پر عمل شروع ہوا۔ اور زراعت، امداد باہمی اور صحت و تعلیم کے محکموں کی سرگرمیوں اور دائرہ کار میں وسعت پیدا کی گئی۔

وحدتِ مغربی پاکستان پاکستان کے نئے آئین کی رو سے ملک ایک جمہوریہ قرار پایا۔ طاقت کا اصل سرچشمہ عوام گردانے گئے۔ اور ان کو انسان کے سارے بنیادی حقوق دیے گئے۔ مغربی پاکستان کی وحدت کے قیام سے حالات میں اور بہتر تبدیلی پیدا ہوئی۔ وحدت کے قیام سے انتہائی مقصد یہ تھا کہ عوام کی حالت جلد سے جلد بہتر بنانے کی راہ میں حائل شدہ دشواریوں اور رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ چناں چہ مختلف محکموں شعبوں اور اداروں کی از سر نو تنظیم، توسیع اور اصلاح کے فیصلے ہوئے۔ ان سارے فیصلوں کے پس پشت ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی کو جدید حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق ترقی دینے کا جذبہ کارفرما ہے۔

پنچایتوں کا نیا دور نظامِ پنچایت کو نہ صرف پورے مغربی پاکستان میں رائج کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بلکہ اس کے دائرہ کار اور سرگرمیوں کو بھی وسیع کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ اس وقت مغربی پاکستان میں کوئی ۰۰ ۷ ہزار پنچایتیں موجود ہیں مزید پنچایتوں کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ یہ پنچایتیں حلقۂ پٹوار کی بنیادوں پر قائم کی جا رہی ہیں۔ سابق سندھ اور

سرحد میں پنچایتوں کے قیام کے بعد مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بھی ان کو رائج کیا جائے گا۔ نظام پنچایت کو ایک حقیقی دیہی جمہوریہ بنانے کی غرض سے حکومت نے پنچایت کا ایک الگ محکمہ قائم کیا ہے۔ ڈویژنل پنچایت افسروں کے تین عہدے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سندھ اور بہاول پور کے علاقوں کے لیے گیارہ پنچایت افسروں کے نئے عہدے منظور کیے گئے ہیں۔ اس پروگرام کا انتہائی مقصد مغربی پاکستان کے ہر گاؤں میں پنچایت کر کے دیہاتی زندگی کے سارے شعبوں کو جمہوری بنانا ہے۔

دیہی جمہوریہ | گویا اب ہم پنچایت کے قدیمی تصور اور پرانے ڈھانچے میں نئی روح داخل کر کے اسے جمہوریت کا ایک ایسا بنیادی اور ابتدائی ادارہ بنانا چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر گاؤں ایک چھوٹا سا جمہوریہ ہو اور ہمارے دیہات سے جمہوری زندگی کی قدریں ابھر کر سارے ملک میں ایک نئی زندگی کی لہریں دوڑا دیں۔ لیکن پنچایتوں کو نئے حالات اور ہماری خواہشات کے مطابق ترقی دینے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ نمائندہ اور عوامی خواہشات و عزائم کی مظہر ہوں۔ عوام میں جمہوری جذبے کا فقدان پنچایتوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں قوانین پاس کرنے اور سرکاری کوششوں کو وسیع اور منظم کرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتی عوام میں جمہوری رجحانات اور شعور پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ جمہوریت کو بنیاد سے قائم کر کے وسیع اور منتشر کرنے کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ حقوق اور ذمہ داریوں سے آشنا کیا جائے۔

دیہاتی عوام کی تنظیم | یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری قومی تعمیر عام لوگوں کے تعاون کے بغیر کما حقہٗ نہیں ہو سکتی۔ عوامی کوششوں اور سرگرمیوں کو منظم اور تیز کرنے کے لیے دیہاتی عوام کو پنچایتوں کی صورت میں زیادہ سے زیادہ سہولتوں کا اہتمام ضروری ہے۔ جمہوریت کے فروغ اور تمام لوگوں کے اتحاد و تعاون کے لیے ان میں افہام و تفہیم کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ایسے اہتمام اور انتظام کی ضرورت ہے جو ان کے باہمی تنازعات کو نہ صرف رفع کرتا رہے بلکہ ان کے امکانات تک کو ختم کر دے۔ عام لوگوں میں باہمی انصاف اور عمدہ برتاؤ کی فضا پیدا کرنے کے لیے ان کی امداد اور رہنمائی کے ساتھ ان کے لیے ایسے انتظامات اور سہولتوں کی بھی ضرورت ہے جو ان میں خاطر خواہ ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی لائیں۔

استفادہ کرنے کی صلاحیت | اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد ہمارے دیہات میں سکولوں، ہسپتالوں اور

شفاخانوں کے انتظامات ہونے لگے ہیں۔ محکمہ زراعت کاشتکاروں کو کاشت کے نئے طریقے بتانے میں معروف ہے دیہات سدھار کا محکمہ دیہاتیوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کر کے ان کو فرسودہ طریق زندگی ترک کرنے کی تعلیم دے رہا ہے۔ اسی طرح امداد باہمی کا محکمہ دیہاتی زندگی کے متعدد شعبوں میں تنظیم اور عوام کو باہمی تعاون کے اصولوں کے تحت کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ حکومت ان سارے محکموں کو وسیع ہمہ گیر اور زیادہ سرگرم بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے کاموں میں ارتباط اور ہم آہنگی بھی پیدا کر رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے عوام میں ابھی تک ان محکموں سے پورا پورا استفادہ کرنے کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یہ استعداد اور صلاحیت اس صورت میں زیادہ پیدا ہو سکتی ہے جب ہر گاؤں کے لوگوں کو الگ الگ طور پر سب سے پہلے منظم اور سرگرم عمل کیا جائے۔

تعمیر و ترقی کے کام | اس وقت ہماری قومی زندگی کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے۔ اس کو مندرجہ ذیل درجوں یا زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **بڑے بڑے منصوبے**:۔ یہ منصوبے خواہ صنعت کی ترقی سے تعلق رکھتے ہوں یا زراعت آبپاشی تعلیم صحت، مواصلات اور امن انصاف سے ان کی تکمیل حکومت ہی کو کرنا ہوگی کیوں کہ ان منصوبوں کے لیے زیادہ سرمایہ، ماہرین اور دوسرے لوازم کی جو ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سر دست حکومت ہی پورا کر سکتی ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بڑے بڑے منصوبے بھی عوام کے لیے مفید تب ثابت ہو سکیں گے جب ان میں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

(۲) **درمیانی یا مقامی نوعیت کے منصوبے**:۔ حکومت مغربی پاکستان نے اس قسم کے منصوبوں کے لیے ڈویژنل اور اصلاعی ترقیاتی بورڈ قائم کیے ہیں۔ جو حکومت کی مالی امداد سے اپنے اپنے ڈویژنوں اور اضلاع کی ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

(۳) اضلاع میں دیہات کی ترقی کے بعض منصوبے ڈسٹرکٹ بورڈوں کے زیر انتظام تکمیل پاتے ہیں۔

(۴) تعمیرات اور آبپاشی کے محکمے بھی دیہات کی ترقی کے بہت سے کام کرتے ہیں۔

(۵) حکومت کے دوسرے سارے محکمے بھی دیہاتی زندگی کی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح و تعمیر میں

معروف ہے۔

پنچایتوں کے کام لیکن ہر گاؤں کی متعدد ایسی ضروریات بھی تو ہوتی ہیں جو لوگوں کی اپنی ہمت اور عزم کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ کام خود گاؤں کے لوگوں کے کرنے کے ہوتے ہیں اور ان کے لیے ہر گاؤں کے عوام کو ایک تنظیم کے تحت سرگرم عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہر گاؤں کا پیشہ زراعت ہے۔ زراعت کی ترقی کے بہت سے کام دیہاتی خود کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں تنظیم اور شعور پیدا ہو۔ وہ کھاد کی حفاظت بہتر بیج پیدا کرنے اعلیٰ نسل کے مویشی کی افزائش اپنی دستکاریوں اور مصنوعات کی تنظیم اور فروخت اور بیماریوں کی روک تھام وغیرہ کے سلسلے میں اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے کام پنچایتوں کے زیر اہتمام ہونے چاہئیں۔ لہٰذا ہماری نئی پنچایتوں کا دائرہ کار پرانی پنچایتوں سے یقیناً مختلف اور وسیع تر ہونا چاہیے۔

خواندہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہمارے دیہات میں خواندہ لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آزادی کے بعد اگرچہ دیہات میں سکولوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں کچھ عرصہ کے بعد ہماری چھوٹی نسل کا ایک خاصہ حصہ خواندہ ہو سکے گا۔ لیکن زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خواندہ بنانے کے لیے ہر گاؤں میں بالغوں کی تعلیم کی جو ضرورت ہے وہ پنچایتیں بخوبی پورا کر سکتی ہیں۔ دیہاتیوں میں خواندگی کے اضافے سے وہ زراعت صحت اور امداد باہمی کی ترقی اور فوائد کے بارے میں اردو یا دوسری علاقائی زبانوں میں معلوماتی مضامین پمفلٹ اور کتابیں پڑھ سکیں گے۔ اسی طرح دیہات میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں کھیل۔ کود سیر و تفریح اور خوشی و مسرت کے دوسرے ذرائع کے انتظامات بھی پنچایتوں کے زیر اہتمام ہو سکتے ہیں۔

اصلاح رسوم یہ درست ہے کہ اس وقت ہمارے دیہاتیوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ شادی غمی اور مختلف رسوم کی ادائیگی میں جا و بے جا اخراجات کرنے کے عادی ہیں۔ ان مسرفانہ اور فضول اخراجات کا سد باب ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے دیہاتی عوام مختلف دوسرے مذہبی یا روایتی تقاریب کے مواقع پر مختلف طریقوں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں۔ ان تمام اخراجات کو اگر اعتدال و تنظیم کے تحت لایا جائے تو ہر گاؤں ایک معقول اجتماعی فنڈ کا مالک ہو سکے گا جس سے وہ اپنے گاؤں کے بیکس اور محتاج لوگوں۔ غریب بیواؤں اور یتیم بچوں کی پرورش کے علاوہ گاؤں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے دوسرے کام کرنے کے قابل بھی ہو سکیں گے۔ اصلاح رسوم

کی تحریک کو نظام پنچایت کا ایک ضروری جزو ہونا چاہیے۔ اپنے اپنے گاؤں کے معذور اور محتاج لوگوں کی امداد و اعانت اور پرورش سے گداگری کے انسداد میں بھی کافی مدد ملے گی۔ گاؤں کے نوجوانوں اور بچوں کے لیے کھیل کود اور دوسرے تفریحی مشاغل کے بہتر انتظامات سے قوم کی صحت میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گی۔ لڑائی جھگڑے مقدمات اور تنازعات میں خاصی کمی آجائے گی۔ ان سارے کاموں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہماری حکومت اور لوگ دونوں مل کر قومی زندگی کی تعمیر میں جلد از جلد کامیاب ہو سکیں گے۔ پنچایتیں دیہات میں نئی اور ترقی یافتہ زندگی پیدا کر کے ہمارے بہت سے اہم مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہو سکیں گی۔ آبادی میں روز افزوں اضافے کا مسئلہ ساری دنیا کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا ہے۔ ہم اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آبادی پر کنٹرول اور کنبہ یا خاندان کی منصوبہ بندیوں کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بھی اس کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارے عوام لاعلم اور توہم پرست ہیں۔ اس لیے وہ آبادی اور معیشت کے تعلق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ پنچایتیں اور دیہات کی ترقی و اصلاح سے متعلقہ دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور کارکن دیہات میں صحت مند ترقی یافتہ اور عقلمندانہ فضا پیدا کر کے مسئلہ آبادی کے حل کے لیے بھی میدان تیار کر سکتے ہیں۔

غیر سرکاری کوششوں کی ضرورت لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نظام پنچایت کو واقعی معنوں میں کامیاب بنانا آسان کام نہیں اس کے لیے سرکاری کوششوں سے زیادہ غیر سرکاری مساعی کی ضرورت ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما اور کارکن اور تعلیم یافتہ اصحاب جو دیہات اور عوام سے محبت رکھتے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ وہ اس انتظام کو کامیاب بنانے کی مخلصانہ کوشش کریں۔ دیہاتی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر سمجھ دار اور تعلیم یافتہ شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کو اس نظام کی افادیت اور اہمیت سے پوری طرح آگاہ کرے۔ اس سلسلہ میں صوبے کے اخبارات خصوصاً ضلعی اخبارات پر بھی خاص فرض عاید ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے تقریباً ہر ضلع میں کم سے کم ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا ہے۔ بعض اضلاع میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان اخبارات کا دیہات میں خاصا اثر ہے۔ اگر یہ نظام پنچایت کی کامیابی کی مہم مسلسل جاری رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی کوشش کامیاب نہ ہو۔ دیہاتی زندگی میں بہتری آنے اور تعلیم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت سے خود ان اخبارات کی اشاعت بڑھے گی اور لکھے پڑھے لوگوں پر خاطر خواہ اثر پڑے گا اور وہ یہ اثرات اور لوگوں میں بھی پھیلا دیں گے۔

ایشیا میں بار برداری کے مسائل

اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید (ایکیفے) کی ریلوے سب کمیٹی کا پانچواں سا
اجلاس شروع ہوا تھا۔ اجلاس میں ریلوے کے ذریعہ بار برداری کے خاص مسائل پر غور کیا گیا۔ کیوں کہ براعظم ایشیا
کی اقتصادی ترقی میں اس ذریعۂ مواصلات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اجلاس پانچ روز تک جاری رہا۔
ان ملکوں کے نمائندوں نے جو سب کے سب ریلوے نظام کے ماہرین ہیں اجلاس میں شرکت کی۔ پاکستان
آسٹریلیا۔ برما۔ چین۔ فرانس۔ بھارت۔ جاپان۔ ملایا۔ نیدرلینڈ۔ فلپین۔ تھائی لینڈ۔ روس۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ
اور ویت نام۔ ان کے علاوہ سنگاپور اور برطانوی بورنیو کے نمائندوں نے ایکیفے کے ایسوشی ایٹ ممبروں کی
حیثیت سے شرکت کی۔ اٹلی اور وفاقی جمہوریت جرمنی نے اپنے مبصرین بھیجے تھے۔

تھائی لینڈ کے وزیر اعظم مسٹر پورٹ سارسن کا تہنیتی پیغام اراکین کو سنایا گیا۔ تھائی لینڈ کے وزیر مواصلات
مسٹر ایس۔ ڈی۔ ایو تھایا اور ایکیفے کے ایگزیکٹو سیکرٹری مسٹر سہا۔ نی ترسہان نے افتتاحی تقریریں کیں۔

مسٹر ترسہان نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اقوام متحدہ کی فنی امداد کا ادارہ اس علاقے میں ریلوے نظام کی
ترقی کے لیے کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے لاہور میں اقوام متحدہ کی طرف سے قائم شدہ ریلوے ٹریننگ
سنٹر کا بھی ذکر کیا جو فی الحال اقوام متحدہ کی فنی امداد کے ادارے کے ماتحت ہے لیکن اگلے سال سے پاکستان
اس کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوگا۔ تاہم اس کی بین الاقوامی حیثیت قائم رہے گی۔

تھائی لینڈ کے وزیر مواصلات نے بتایا کہ حمل و نقل کا نظام اقتصادی ترقی کے لیے اشد ضروری ہے۔ اور
یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایکیفے کے علاقہ میں ریلوے نظام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

آموز

[شمارہ ۱۲]

لاہور

[مارچ ۱۹۵۸

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

تعلیمی ماہنامہ

آموزش
لاہور

مارچ سنہ ۱۹۵۸ء

جلد ——— ۱۰

شمارہ ——— ۱۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں
طبع کرا کے یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ناخواندگی کا مسئلہ

ایم۔ اے مخدومی

ایک جمہوری معاشرے کی صحت مندی کے لیے پہلی شرط بیدار اور باشعور رائے عامہ ہے۔ جمہوریت کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ حاکمیت کے اصل مالک عوام ہیں۔ اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے عوام میں اس بات کی صلاحیت ہونی چاہیے کہ ملکی اور عالمی معاملات کو سمجھ سکیں اور باہمی ربط و ضبط سے اپنی آواز کو موثر بنانا اور ملکی معاملات کا رُخ متعین کرنا سیکھ جائیں۔ جدید سائنسی تہذیب کی معاشی اور سیاسی تنظیم اسقدر پیچیدہ ہے کہ جو شخص لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو وہ نہ اس تہذیب کے بنیادی حقائق کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی رفتار واقعات کا کوئی قابل ذکر فہم حاصل کر سکتا ہے۔ یہ انھی ناقابل انکار حقائق کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں نے پہلی فرصت میں اپنے ہاں سے ناخواندگی کو ختم کیا ہے۔

آزادی کی آمد کے بعد پاکستان نے بھی ناخواندگی کے مسئلہ کو خاص توجہ دی ہے۔ صوبائی حکومتیں ہر سال بہت سے نئے ابتدائی مدرسے کھولتی ہیں۔ ناخواندگی کا جلد از جلد خاتمہ کرنے کی مؤثر ترین صورت یہ ہے کہ نئی پود کے لیے مدرسوں میں جانا لازمی قرار دیدیا جائے اور بالغ آبادی کو خواندہ بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے جائیں۔ اپنی مخصوص مجبوریوں کی بنا پر ہم اس علاج کے صرف پہلے حصے پر عمل کرنے کے ہی قابل ہو سکیں ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ کم از کم عرصے میں اتنے ابتدائی مدرسے کھل جائیں کہ نئی پود کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہو جائے تاکہ مستقبل قریب میں ہمارے بیشتر شہری پڑھے لکھے بن جائیں۔

تاہم ایک پسماندہ معاشرے میں صدیوں کے جمود کو توڑنا ایک آسان کام نہیں۔ ہماری شہری آبادی عموماً تعلیم کی قدر و قیمت کو پہچاننے لگی ہے اور شہری مدرسوں میں بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر

ملک کی اسی فی صد سے زائد آبادی دیہات میں بستی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے جو اعداد و شمار اب تک جمع کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ساری کی ساری نئی پود کے مدرسوں میں پہنچنے کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ دیہاتی والدین میں سے بہتوں کو ابھی یہ احساس نہیں ہوا کہ بچپن کا بہترین مصرف مدرسے میں جانا ہے۔ وہ بچوں کو مدرسے میں بھیجنے کی بجائے انھیں اپنے ساتھ کام کاج میں لگائے رکھتے ہیں۔ جہاں مدرسہ گاؤں سے چند میل دور ہو وہاں یہ رجحان اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دیہاتی مدرسوں میں طلبہ کی تعداد شہری مدرسے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ان مدرسوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ ہمیں ان اسباب کا کھوج لگانا ہے جو اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔

لیکن ابتدائی تعلیم کا ایک اور پہلو اس سے بھی زیادہ توجہ طلب ہے۔ مشرقی پاکستان کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ چھے سے گیارہ برس کی عمر کے بچوں میں سے صرف تقریباً آدھے بچے مدرسوں میں جاتے ہیں جو بچے مدرسوں کا رخ کرتے بھی ہیں ان میں سے ساٹھ فی صد پہلی جماعت میں ہی غائب ہو جاتے ہیں اور پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ان کا تناسب کوئی بارہ فی صد رہ جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں صورتِ حال قدرے بہتر ہے مگر مختلف نہیں۔ اگر یہ صورتِ حال باقی رہی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خواندگی کے تناسب میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ ہو سکے گا۔ ملکی آبادی میں تقریباً ایک فی صد اضافہ ہو رہا ہے۔ جب تک خواندگی کے تناسب میں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ نہ ہوگا اس وقت تک یہ تناسب بلند نہ ہو سکے گا۔

ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ حقائق ہر پڑھے لکھے پاکستانی کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ناخواندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ایک اتنا بڑا اور اتنا مشکل کام ہے کہ یہ اکیلے حکومت کے کرنے کا نہیں۔ حکومت دیہاتی علاقوں میں مدرسوں کا جال بچھا سکتی ہے۔ مگر ان مدرسوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے دیہاتی عوام کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا ہونی چاہیے۔ اس کام میں عوامی ادارے حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ وہ ان اسباب کا کھوج لگانے میں مدد دے سکتے ہیں جنھوں نے اب تک ابتدائی تعلیم کو مؤثر ہونے سے روک رکھا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کی رضاکارانہ کوششوں نے بڑی اہم تعلیمی خدمات انجام دی ہیں ؂

رفاہی ریاست میں تعلیم

فضل احمد

ریاست کی ضرورت

ریاست کے وجود میں آنے کے متعلق کئی نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں ان نظریوں پہ بحث کرنا مقصود نہیں۔ تاہم ان تمام نظریوں میں ایک چیز جو مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کو وجود میں لائے بغیر انسان اپنی معاشرتی زندگی کو منظم نہیں کر سکتا۔ اس کی اجتماعی زندگی نظم و ترتیب اور ترقی و خوش حالی کی طرف اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ جب تک اس زندگی کی باگ ڈور ایک مرکزی تنظیم کے حوالے نہ کر دی جائے۔ یہ مرکزی تنظیم خواہ ایک آدمی کی رہنمائی قبول کرے خواہ ایک گنی چنی جماعت کی، اور خواہ ساری قوم کی، اس کا وجود بہرصورت ناگزیر ہے۔ اجتماعی زندگی کی یہ مرکزی تنظیم ریاست کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اگرچہ اجتماعی زندگی کے مختلف گوشوں مثلاً مذہب، تجارت، دست کاری وغیرہ کی دیکھ بھال کے لیے بھی تنظیمیں قائم کی جاتی ہیں اور یہ تنظیمیں اپنے اپنے دائرہ کار میں ہر خارجی اثر سے آزاد ہوتی ہیں۔ تاہم ان تمام تنظیموں کے لیے جس قابل اعتماد سیاسی سلامتی کی ضرورت ہے وہ ریاست ہی مہیا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کا وجود اجتماعی زندگی کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ جب تک اس کا وجود نہ ہو، اس وقت تک کوئی اور تنظیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ریاست کی اس بنیادی حیثیت کو بعض مثالی فلسفیوں نے بڑے مبالغہ آمیز رنگ میں پیش کیا ہے ہیگل ریاست کی قصیدہ خوانی میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس نے اسے زمین پر خدا کا جلوہ قرار دیا ہے کیونکہ فرد اپنے آپ کو ریاست کے وجود میں کھوئے بغیر انسانی شرف کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتا اس مبالغہ آمیزی سے قطع نظر یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ریاست انسانی معاشرے کی بنیادی خدمت انجام دیتی ہے۔ اس فرض کی انجام دہی میں ہر اچھے شہری کو ریاست کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں

خود اس کی اپنی بھلائی ہے۔

رفاہی ریاست کا تصور

اگرچہ ریاست نے ہر زمانے میں اپنی اس ذمہ داری کو تسلیم کیا ہے کہ اسے اجتماعی بہبود کی نگہداشت کرنی چاہیے۔ لیکن پچھلی صدی کے نصف اول تک ریاست کے اس تصور کا مفہوم بڑا محدود تھا۔ فرانس کے شہنشاہ لوئی چہاردہم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ فرانسیسی قوم صرف میری ذات سے عبارت ہے۔ لوئی چہاردہم دراصل اپنے زمانے کے سیاسی فلسفہ کی ترجمانی کر رہا تھا۔ انقلاب فرانس اور امریکہ کی جنگ آزادی سے پہلے عام خیال یہی تھا کہ ریاست کا اولین مقصد بادشاہ کے مفاد کو ترقی دینا ہے۔ قومی بہبود اور شاہی مفاد دراصل ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مغربی ملکوں میں شاہی مطلق العنانی کا خاتمہ ہونے لگا تو اس کی جانشینی کا شرف مالدار تاجر طبقہ کو حاصل ہوا۔ اور اس طبقے کا مفاد قومی مفاد کے ہم معنی قرار پایا۔

جب تک ریاست کا مفہوم اس طرح محدود رہا اس وقت تک اس کے فرائض کا دائرہ بھی محدود رہا۔ ریاست کی قوت قاہرہ پہلے ایک فرد کے ہاتھ میں۔ پھر ایک خاص طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس لیے اس قوت قاہرہ کی پہلی ذمہ داری یہ قرار دی گئی کہ وہ مال وجان کی حفاظت کرے۔ ریاست کی حیثیت گویا ایک پاسبان کی تھی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ صاحب حیثیت لوگوں کے املاک کی حفاظت کرے۔ اس کا یہ فرض تھا کہ امیر لوگوں کی املاک کو غریب لوگوں کی دست برد سے بچائے۔

جب تک ریاست کی حیثیت ایک پاسبان کی رہی اس وقت تک تعلیم کا تصور بھی بہت محدود تھا۔ تعلیم محض امراء اور شرفاء کے بچوں کے لیے مخصوص تھی۔ تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ اونچے طبقے کے بچوں کو شائستہ طور طریقے اور جہاں بانی کے اصول سکھائے۔ امیر طبقہ پوری دیانتداری سے یہ محسوس کرتا تھا کہ حکمرانی اس کی ذمہ داری ہے اور اسے چاہیے کہ اپنی اولاد کو اس ذمہ داری کے لیے تیار کرے۔ یہ غرض تعلیم کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھی اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ انیسویں صدی کے نصف تک انگلستان جیسے ملک میں بھی صرف گنتی کے پبلک سکول موجود تھے۔ ان مدرسوں میں داخلے کی شرط یہ تھی کہ بچہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ پبلک سکول کے اخراجات سے قطع نظر یہ شرط ہی عوام کے بچوں کو پبلک سکولوں سے دور رکھنے کے لیے کافی تھی۔ بچے کو

گھر پر لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے اتالیق کی ضرورت پڑتی تھی اور اس کا بندوبست صاحب استطاعت والدین ہی کر سکتے تھے۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب کارخانے قائم ہونے لگے اور اپنی اپنی جھونپڑیوں میں کام کرنے والے دست کاروں کو ایک چھت کے نیچے جمع ہونے کا موقع ملا تو انھیں اپنی اجتماعی قوت کا احساس ہونے لگا انھیں پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ وہ مل کر دولت مند کارخانہ دار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے جہاں زندگی کی اور سہولتوں کا مطالبہ کیا وہاں اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا مطالبہ بھی شروع کیا اس مطالبے سے متاثر ہو کر برطانوی پارلیمنٹ کو یہ قانون منظور کرنا پڑا کہ جو کارخانہ دار نابالغ بچوں کو ملازم رکھتے ہیں وہ ان کی تعلیم کا بندوبست بھی کریں۔

تاہم عوام کو تعلیم حاصل کرنے کا حق اس وقت تک نہیں ملا جب تک انھوں نے اپنی سیاسی حیثیت کو موثر نہیں بنا لیا۔ جب عوام کے ایک خاصے طبقے کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ قومی انتخابات میں رائے دیں تو آخر حکومت کو یہ ذمہ داری بھی تسلیم کرنا پڑی کہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کا حق ہے۔ اس عوامی حق کے متعلق امیر طبقے نے بھی بالعموم ہمدردی کا رویہ اختیار کیا تھا۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ پڑھا لکھا مزدور ان پڑھ مزدور کے مقابلہ میں بہتر خادم ثابت ہوگا۔

بیسویں صدی میں عوام کے سیاسی شعور اور ان کی سیاسی قوت میں ہر جگہ تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس عمل میں دو عالمی جنگوں نے بڑی مدد دی ہے۔ اب تقریباً ہر ملک میں حکومت کی قوت ظاہرہ عوام کے نام پر حرکت میں آتی ہے۔ یہ بات اب ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے کہ حکومت کا کام محض پاسبانی نہیں بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عوام کی بہبود کو ترقی دے۔ اجتماعی بہبود کے جو وظائف عوام براہِ راست خود انجام نہیں دے سکتے ان کی انجام دہی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ سیاسی قوت میں عوام کی شرکت کا براہ راست یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ریاست محض پاسبان ریاست نہیں رہی بلکہ رفاہی ریاست بن گئی ہے۔ جان و مال کی حفاظت کے علاوہ اس پر یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ وہ عوام کو یکساں تعلیمی مواقع بہم پہنچائے وہ ان کے لیے سود مند کام کاج کے مواقع پیدا کرے۔ وہ ان کی صحت و تندرستی کی نگہبانی کرے۔ غرض ریاست

اجتماعی زندگی کی فلاح و ترقی کے وہ تمام کام اپنے ہاتھ میں لے جو انفرادی کوشش سے انجام نہیں پا سکتے۔

اس مضمون میں ہماری دلچسپی رفاہی ریاست کے صرف تعلیمی پہلو سے ہے۔ رفاہی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے شہریوں میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد کے حسب حال ترقی کی بھرپور سہولتیں مہیا کرے۔ اس فرض کو قبول کرنے کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو تاکہ ہر بچہ تعلیمی اوزاروں سے لیس ہو جائے۔ لکھنا پڑھنا سیکھ کر وہ اس قابل ہو جائے کہ نوع انسان کے جمع کردہ علمی خزانوں تک رسائی حاصل کرے۔

مفت اور لازمی تعلیم

رفاہی ریاست میں ہر شہری کو اس بات کے بھرپور مواقع حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی دے۔ اس اصول کو مان لینے کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ والدین کا افلاس کسی بچے کو مدرسے میں جانے سے نہ روکے۔ صاف تر الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم مفت ہونی چاہیے تاکہ فیس کا بوجھ کسی بچے کو تعلیم سے محروم نہ کردے۔ لیکن صرف اسی قدر کافی نہیں۔ بعض والدین اس قدر نادار یا بےخبر واقع ہوتے ہیں کہ وہ بچوں کو مدرسے میں بھیجنے کی بجائے ان سے اپنے کام کاج میں مدد لینا چاہتے ہیں۔ بے شک والدین اپنے بچوں کے مفاد کے نگہبان ہوتے ہیں۔ لیکن رفاہی ریاست کا مقام والدین سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ بچوں کے مفاد کو والدین سے بہتر سمجھتی اور بہتر طور پر محفوظ کر سکتی ہے۔ چنانچہ جہاں والدین کسی وجہ سے اپنے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہیں وہاں رفاہی ریاست کا فرض ہے کہ بچوں کو والدین کی اس زیادتی سے بچائے اور والدین کو مجبور کرے کہ بچوں کو تعلیم دلائیں۔

لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ بچوں کو گھسیٹ کر مدرسوں میں جمع کر دیا جائے۔ انہیں کتابوں، کپڑوں اور دوسرے لوازمات کی ضرورت ہے، انہیں متوازن غذا کی ضرورت ہے تاکہ ان کے جسمانی اور ذہنی قوا پوری طرح نشوونما پا جائیں اور وہ مدرسے کی تعلیم سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر بچہ ایسا لباس پہنے ہے جو اسے موسم سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ نیم فاقے کی حالت میں مدرسے آتا ہے۔ یا اسے ایسی ناقص غذا مل رہی ہے جو اس کی قدرتی نشوونما کے لیے کافی نہیں تو ایسی صورتوں میں

مدرسے کی تعلیمی کوششیں خاطر خواہ فائدہ نہ دیں گی۔ دوسرے الفاظ میں اسے دوسروں کی سی تعلیمی سہولتیں میسر ہوں گی۔ وہ یکساں تعلیمی مواقع سے محروم رہے گا۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی نہ دے سکے گا۔

اپنی تعلیمی ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ پورا کرنے کے لیے رفاہی ریاست نے اب بچوں کی صحت اور ان کے موزوں تغذیہ کی ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے۔ مدرسے نہ صرف کتابیں اور کاپیاں مفت مہیا کرنے لگے ہیں بلکہ وہ سند یافتہ ڈاکٹر اور نرسیں بھی ملازم رکھنے لگے ہیں۔ بچوں کا طبی معائنہ لگاتار ہوتا رہتا ہے۔ اور انھیں ہر قسم کی طبی امداد مفت ملتی ہے۔ بچوں کے موزوں تغذیہ میں دودھ اور متوازن غذا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مدرسے اگرچہ یہ نہیں کر سکتے کہ والدین کو موزوں قسم کی خوراک بہم پہنچانے پر مجبور کریں۔ لیکن وہ آمادہ کر سکتے ہیں کہ جو کھانا اوقات مدرسہ میں کیا جاتا ہے اس کا اہتمام خود کر دیں۔ چنانچہ ترقی یافتہ ملکوں کے بیشتر مدرسے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے لگے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور روس اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ دوپہر کے متوازن کھانے کے لیے بچوں سے برائے نام قیمت وصول کی جاتی ہے، جو بچے نادار ہوں انھیں یہ کھانا بلا قیمت مہیا کیا جاتا ہے۔ مدرسے کے اس لنچ پروگرام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہر بچے کو دن میں کم از کم ایک بار متوازن غذا مل جائے (جس میں دودھ ضرور شامل ہوتا ہے)

معذوری سد راہ نہ ہونی چاہیے

رفاہی ریاست کے تصور کو قبول کر لینے سے جہاں عام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم ضروری ہو جاتی ہے۔ وہاں یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ معذور بچوں کو بوجھ نہ سمجھا جائے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام پوری ہمدردی سے کیا جائے۔ جو بچہ اندھا، بہرہ یا گونگا ہے۔ اس کی یہ محرومی ہی کیا کم ہے کہ اسے تعلیم سے بے بہرہ رکھ کر اس کی زندگی کو اور تلخ بنا دیا جائے۔ بے شک والدین کے لیے اکثر حالتوں میں یہ بات مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے معذور بچے کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں۔ مگر رفاہی ریاست کی ذمہ داری والدین سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ جس بچے کی دیکھ بھال والدین نہیں کر سکتے، اس کی تربیت کا وہ ذمہ لے۔ پہلے وقتوں میں معذور بچوں کو بے کار سمجھ کر انھیں درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سے جو ہمدردی

کی جاتی تھی وہ بھی غلط رنگ اختیار کرتی تھی۔ مثلاً انھیں جرات کے سہارے جینے کا عادی بنا دیا جاتا تھا۔ معذور بچوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک رفاہی ریاست کے تصور سے براہِ راست ٹکراتا ہے۔ معذور بچے بھی دوسرے بچوں کی طرح یگانہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان صلاحیتوں کو ابھرنے اور ترقی پانے کے پورے مواقع ملنے چاہئیں۔ اگر معذور بچے عام بچوں کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکتے تو ان کے لیے الگ تربیتی ادارے قائم ہونے چاہئیں۔ مگر اس کام کی انجام دہی والدین کی بجائے ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اب اس اصول کو مان لینے کا ایک اور منطقی نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو بچے اپنی جرائم پسندی کے باعث والدین اور استادوں کے لیے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ انھیں مدرسے سے اکھاڑ پھینکنے کی بجائے ان کی اصلاح کی جائے۔ وہ نفسیاتی اسباب معلوم کیے جائیں جو انھیں جرائم پر ابھارتے ہیں اور ان اسباب کا تدارک کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ صرف علوم اور مہارتیں سکھانے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر بچے کے ذہنی پس منظر کے متعلق بھی پوری آگاہی حاصل کرے۔ وہ ہر بچے کے گھریلو حالات سے واقفیت پیدا کرے۔ بچے اور اس کے والدین کو بھروسے میں لے اور جہاں کوئی نفسیاتی الجھن بچے کو تنگ کرنے لگے اس کا مناسب علاج کرے۔ اس کی ایک صورت تو وہ ہے جو مغرب میں مروج ہے وہ یہ کہ نفسیاتی علاج گاہیں قائم ہوں اور مدرسوں میں نفسیات کے ماہر استاد مقرر کیے جائیں جو بچوں کو بھروسے میں لے کر انھیں موزوں مشورہ دیں۔ لیکن اس کی متبادل صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ استاد اور بچے کے درمیان پاکیزہ روحانی رشتہ قائم ہو۔ اس لطیف ذاتی رشتے کی مدد سے استاد بچوں کی نفسیاتی الجھنوں کا کامیابی سے علاج کر سکتا ہے۔

تعلیمی نصاب کا تنوع

رفاہی ریاست اپنے تعلیمی فرائض اس یقین کی بنا پر قبول کرتی ہے کہ اس کا ہر شہری بعض یگانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کو ترقی دینے میں سارے معاشرے کی بھلائی مضمر ہے۔ پہلے وقتوں میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک عمر کے تمام بچے ایک سی استعداد کے مالک ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے

ایک سا نصاب تعلیم کفایت کرتا ہے۔ جدید نفسیات نے اس مفروضے کو سراپا غلط ثابت کیا ہے۔ تجرباتی شہادت نے اب یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہم عمر بچوں کے ایک غیر منتخب گروہ میں، ذہنی استعداد کے لحاظ سے تین چار سال کا فرق ہوتا ہے۔ یعنی اگر کسی جماعت میں چالیس پچاس ہم عمر طلبا بلا تخصیص داخل کر لیے گئے ہیں تو غالب امکان یہ ہے کہ ذہنی استعداد کے اعتبار سے کچھ لڑکے اوسط سطح پر ہوں۔ کچھ اس سطح سے دو تین سال پیچھے اور کچھ دو تین سال آگے۔ پھر اس پر بس نہیں۔ جو طلبہ یکساں ذہنی استعداد کے مالک ہیں ان کے میلانات میں بھی بڑا فرق ہوگا۔ ہر شخص کے میلان کا انحصار بہت کچھ اس کی ابتدائی تربیت پر ہوتا ہے۔ اور چوں کہ مختلف طلبہ مختلف قسم کے ماحول سے آتے ہیں۔ اس لیے ان کے میلانات میں فرق کا ہونا لازمی ہے۔

اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ تمام طلباء کے لیے ایک ہی نصاب تو ہو۔ بنیادی مہارتیں اخذ کر لینے کے بعد طلبہ کو یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی طبیعت کی افتاد کے مطابق مضامین کا انتخاب کر سکیں۔ جس طالب علم کو علمی ذوق ہے وہ علمی مضامین لے لے جس کا میلان دستکاری کی طرف ہے وہ ٹیکنیکل مضامین لے لے جو سائنس کا دلدادہ ہے وہ سائنسی مضامین اختیار کر لے جس کو کسی پیشے کے ساتھ لگاؤ ہے وہ اس پیشے کے لیے تیاری کر لے۔ غرض نصاب مدرسہ میں زندگی کی سی وسعت ہونی چاہیے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یہ مسئلہ ہمہ گیر مدرسہ قائم کر کے حل کیا ہے۔ ہمہ گیر مدرسے میں نصاب کو بدرجہ وسیع اور متنوع بنایا گیا ہے طالب علم خواہ وہ ذہین ہو یا غبی۔ علمی مذاق رکھتا ہو یا مکینیکل اس نصاب میں اپنے حسب حال مضامین .... اور حسب میلان تلاش کر سکتا ہے۔ برطانیہ نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا ہے کہ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد بچوں کو ان کی ذہنی استعداد اور میلانوں کے مطابق مختلف شاخوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ زیادہ ذہین بچوں کو گرامر سکولوں میں بھجوا دیا جاتا ہے۔ جہاں انھیں علمی قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ ان سے کم تر ذہانت کے بچوں کو جدید ثانوی مدرسوں میں بھیجا جاتا ہے۔ جہاں عام مضامین کے علاوہ کچھ ٹیکنیکل مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ جو بچے واضح طور پر ٹیکنیکل میلان رکھتے ہیں انھیں ٹیکنیکل سکولوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

جمہوری قسم کی تعلیمی رہنمائی

یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ مدرسہ معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ جو فلسفہ گردوپیش کی زندگی پر غالب ہوگا

س کی حکمرانی مدرسے میں نظر آئے گی۔ جب تک ریاست کا تصور ایک پاسبان کا تصور تھا اس وقت تک مدرسوں
ے نگران اور انتظامی افسر بھی پاسبانی کے فرائض انجام دینا اپنی سب سے بڑی ذمہ داری خیال کرتے تھے۔ ان کا
یال تھا کہ جس طرح مزدوروں کو کام پر لگائے رکھنے کے لیے اوورسیئر کے لیے حکمانہ لہجہ اختیار کرنا اور وقتاً
وقتاً ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح صدر معلم اور انسپکٹر مدارس کے لیے کہ استادوں کو خائف رکھے
ان کے کام پر جا و بیجا نکتہ چینی کرتا رہے، ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ قائم رکھے اور انھیں یہ احساس دلائے
رکھے کہ ان کی ترقی اور سلامتی کا انحصار انسپکٹر یا نگران کی خوشنودی مزاج پر ہے۔ لہٰذا استادوں کو چاہیے کہ جس طرح
بن پڑے یہ خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔

انسانی مراسم کا یہ نمونہ جو یہاں سے شروع ہوتا تھا نیچے طلبہ تک پہنچتا تھا۔ استاد بھی طلبہ کو خائف کیے رکھنے
میں یقین رکھتے تھے۔ رفاہی ریاست کی آمد نے اس قسم کے انسانی مراسم کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تعلیم
بالیدگی اور مسلسل بالیدگی کا نام ہے۔ بالیدگی کے لیے خوف و ہراس کا ماحول زہر ہلاہل ہے۔ لہٰذا رفاہی ریاست تعلیمی
دنیا میں جمہوری قسم کے انسانی مراسم کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ انسپکٹر، صدر معلم، اور استاد سب کو نہ صرف بلند تر اور پاکیزہ تر
راستہ دکھائیں، بلکہ ان کے دلوں میں اس راستے پر گامزن ہونے کا شوق بھی پیدا کریں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے تحکمانہ
لب و لہجہ اور خوف و ہراس پیدا کرنے والے طریقے کام نہیں دے سکتے۔ اس کے لیے ضروری شرط دوسرے کا
اعتماد اور احترام حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ دوسرے کو اپنے بلند تر علم و فضل اور پاکیزہ تر اخلاق کا
قائل کیا جائے۔ اسے یہ یقین دلایا جائے کہ جو مشورہ دیا جا رہا ہے وہ مکمل تر علم اور پُرخلوص جذبات کی پیداوار ہے۔

مغربی ملکوں میں نگرانی کے تصور میں جو انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی ہے وہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہیں، بلکہ رفاہی
ریاست کے تدریجی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ ان ملکوں میں انسپکٹر مدارس استادوں کے کام پر نکتہ چینی کرنے نہیں آتا
وہ انھیں فنی بالیدگی میں مدد دینے آتا ہے۔ وہ انھیں جدید ترین تعلیمی ترقیوں سے باخبر رکھتا ہے اور اپنے عملی نمونے
سے انھیں بلند تر فنی معیار حاصل کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔

روپے کا بہترین مصرف

رفاہی ریاست اس بات میں یقین رکھتی ہے کہ تعلیم پر جو روپیہ صرف کیا جائے وہ روپیہ ضائع نہیں

جاتا بلکہ وہ اس کا بہترین مصرف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کاروبار میں روپیہ لگانے سے بہت جلد نفع حاصل ہونے لگتا ہے لیکن کسی کام میں روپیہ لگانا اتنا نفع نہیں دیتا جتنا تعلیم میں روپیہ لگانا۔ تعلیم پر خرچ کی گئی ہر پائی سیکڑوں گنا نفع لاتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ تعلیم میں روپیہ لگا کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نفع ایک دم حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے اکثر اوقات ایک مدت العمر منتظر رہنا پڑتا ہے۔ پھر تعلیم جو فوائد پیدا کرتی ہے ان سب کو روپے پیسے کے ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔ ان میں سے بیشتر فوائد ذہنی اور روحانی قسم کے ہوتے ہیں۔ تاہم تعلیم سے جو مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ اکیلے تمام خرچ کی کافی سے زیادہ تلافی کر دیتے ہیں۔

یہ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ جدید زمانے کی رفاہی ریاستیں نئی پود کی تعلیم پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتی ہیں تعلیمی سہولتیں عام کرنے اور نئی نسل کو علوم و فنون کی تربیت دینے کے معاملے میں وہ کسی قربانی سے نہیں ہچکچاتیں۔

عصر حاضر کے تقاضے

رفاہی ریاست کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اسے اپنے ہر شہری کی بہبود کو ترقی دینے کے لیے ہر امکانی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی اپنی بھلائی اسی بات میں ہے کہ اس کا ہر فرد ترقی کی وہ تمام منزلیں طے کر لے جس کی صلاحیت اسے قدرت نے عطا کی ہے جس حد تک ریاست اس مقصد میں ناکام رہتی ہے اسی حد تک اس کا اپنا مستقبل غیر محفوظ رہتا ہے بلکہ خوش حال شہری جو بھرپور زندگیاں گزار رہے ہوں، ریاست کے استحکام اور اس کی ترقی کی بہترین ضمانت ہیں۔

رفاہی ریاست کے اس یقین کو عصر حاضر کے تقاضوں نے مزید تقویت دی ہے۔ پچھلی چند دہائیوں میں سائنس، ٹیکنالوجی نے اس قدر ترقی کی ہے جو اس نے پچھلی چند صدیوں میں نہ کی تھی۔ مثلاً علم طب نے پچھلے تیس برس میں جس قدر ترقی کی ہے وہ اس نے پچھلے تین سو سال میں بھی نہ کی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے ان ملکوں میں سے ہے جہاں عمدہ پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اکثر حالتوں میں دو شہروں کو ملانے کے لیے دو دو تین تین بلکہ اس سے زیادہ فراخ سڑکیں موجود ہیں۔ اس کے باوجود اس ملک نے سڑکوں کی تعمیر کے ایک نئے منصوبے کو ہاتھ ڈالا ہے۔ اس منصوبے کے تحت اگلے پندرہ برس میں ایک پچاس ہزار میل لمبی عمدہ شاہراہ تیار ہو گی۔ لیکن روما الکبریٰ کے شہنشاہوں نے اپنی وسیع و عریض سلطنت میں پچاس ہزار میل لمبی سڑک تعمیر کرنے پر

ہا سو سال صرف کیے تھے:

غرض سائنس اور ٹکنالوجی آج اس برق رفتاری سے آگے بڑھتے جارہے ہیں کہ انسانی ذہن اس تیز رفتاری سوَر سے چکرا جاتا ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی مشینیں بدنی مشقت کے کام تو عرصے سے کر رہی تھیں۔ اب ان سے ہا قسم کے کام بھی لیے جانے لگے ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے چاند فضائے بسیط میں چکر کاٹ رہے ہیں ے چاند میں ایک زندہ کتا بھی سفر کر چکا ہے۔ اب اگلا قدم یہ ہوگا کہ الیکٹرونز سے کام کرنے والا "مشینی دماغ" ندر پر بھیجے جائیں۔ یہ مشینی دماغ انسان کو اپنے چاند کے متعلق مشاہدات سے آگاہ کریں گے۔ اس کے بعد انسان د چاند پر پہنچ کر اس نئی دنیا میں اپنا اڈہ قائم کرے گا۔ اس طرح وہ اس قابل ہو جائے گا کہ فضائے بسیط اور مام کائنات کے دل میں جھانک کر دیکھ سکے اور فطرت کے کئی ایک چھپے ہوئے رازوں کے چہرے سے پردہ ٹھا دے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ برق رفتار ترقی زندگی میں خوفناک تیزی سے تبدیلی پیدا کر رہی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آنے والا زمانہ موجودہ زمانے سے بہت مختلف ہوگا۔ جو پود اس وقت زیر تعلیم ہے جب وہ بڑی ہو کر زندگی میں داخل ہوگی تو وہ اپنے آپ کو ایسی دنیا سے دوچار پائے گی جو موجودہ دنیا سے یکسر مختلف ہوگی۔ تعلیم کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ نئی پود کو بالغ زندگی کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرے آج مدرسوں کے سامنے کٹھن سوال یہ ہے کہ وہ نئی پود کو ان دیکھی زندگی کے لیے کس طرح تیار کرے؟ آج کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو ایک دہائیوں کے بعد انسانی زندگی کا دھارا کس نہج پہ بہ رہا ہوگا۔ آج ہر قوم کی تعلیمی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئی پود کو غیر متوقع حالات کے لیے تیار کرے۔

عصر حاضر کا یہ تقاضا اس قدر شدید ہے کہ اس سے کوئی صاحب نظر قوم آنکھیں بند نہیں کر سکتی رفاہی ریاست کے لیے یہ سوال زندگی اور موت کا سوال ہے اس کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ مستقبل کے شہریوں کو ایسے ذہنی اوصاف عطا کرے کہ وہ تیزی سے دوڑے آنے والے عجیب و غریب مستقبل کا جواں مردی سے مقابلہ کر سکیں۔ وقت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہر رفاہی ریاست نئی پود کی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ نئی پود میں سے غیر معمولی ذہانت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر الگ کرتی ہے

اور اپنے بہترین وسائل اس کی تعلیم و تربیت پر صرف کر دیتی ہے۔ غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ امیر گھرانے میں پیدا ہو یا غریب گھرانے میں۔ رفاہی ریاست اس کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کرتی ہے۔ وہ اس نکتے کو خوب سمجھتی ہے کہ خصوصی مہارت کے اس زمانے میں قومی سربلندی کا راز موزوں قسم کی رہنمائی میں ہے۔ مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے موزوں قسم کے رہنما تیار کرنے چاہئیں۔ ایسے رہنما جو نہ صرف سائنس اور ٹکنالوجی کی ہر ترقی کا ساتھ دے سکیں، بلکہ لطیف انسانی جذبات کے بھی حامل ہوں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اس زمانے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے، جب ملکی زندگی کی باگ ڈور اطمینان کے ساتھ ایک خاص طبقے کے ہاتھوں میں چھوڑی جا سکتی تھی۔ سائنسی تہذیب کے موجودہ دور میں قومی زندگی کی ہر قسم کی قیادت بہترین دماغوں کے سپرد ہونی چاہیے۔ اور بہترین دماغوں کے معاملے میں قدرت نے کسی ایک طبقے کو اپنا منظور نظر کبھی نہیں بنایا۔ چوٹی کے دماغ ہر گروہ اور ہر طبقے میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ رفاہی ریاست کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ قوم میں سے چوٹی کے دماغوں کو تلاش کرے۔ ان کی بہترین تربیت کرے اور قومی زندگی کے مختلف میدانوں کی رہنمائی ان کو سونپ دے۔ ایسا نہ کرنا اپنے مستقبل کے ساتھ کھیلنا ہے۔

یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ آج برطانیہ جیسا قدامت پسند ملک بھی اس بات پر مجبور ہے کہ ابتدائی مدرسے کے خاتمے پر ایک ایسے امتحان کا اہتمام کرے جس کی غایت بہترین دماغوں کی تلاش ہو۔ یہ امتحان جن دماغوں کو چوٹی کا درجہ دیتا ہے وہ سب کے سب بلا تخصیص ان مدرسوں میں بھیج دیے جاتے ہیں جو کبھی امراء اور شرفا کے بچوں کے لیے مخصوص تھے۔ گرائمر سکولوں کی تعلیم اب صاحب حیثیت طبقے کا اجارہ نہیں رہی۔ اس تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے اب اکیلی شرط اعلیٰ درجے کی ذہانت ہے دولت نہیں کیونکہ نادار بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

حکومت کی مالی مجبوری

اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک رفاہی ریاست کو نئی پود کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری خود قبول کرنی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ نئی پود کی صلاحیتوں کا اچھی طرح جائزہ لے اور ہر بچے کو

اس کی استعداد کے مطابق نہ صرف ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائے، بلکہ اس کی صحت اور اس کے موزوں تغذیہ کا بندوبست بھی۔ یہ خالی نظری اصول نہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زیادہ ریاستیں ان اصولوں پر عمل کر رہی ہیں امریکہ، برطانیہ اور روس میں تعلیم ثانوی درجے تک بالکل مفت اور لازمی ہے۔ ہر بچے کا یہ پیدائشی حق سمجھا گیا ہے کہ وہ ثانوی درجے تک تعلیم حاصل کرے۔ ان ملکوں میں ہر لڑکا اور لڑکی خواہ وہ امیر ہو یا غریب تندرست ہو یا معذور ذہین ہو یا غبی۔ حکومت کے خرچ پر ثانوی درجے تک تعلیم حاصل کرتا ہے۔

پیچھے یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ تعلیم پر جو روپیہ خرچ کیا جائے وہ روپے کا بہترین مصرف ہے کسی کاروبار میں روپیہ لگانے سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا تعلیم میں روپیہ لگانے سے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے جیب میں روپیہ ہونا چاہیے۔ ہر چند کہ تعلیم پر خرچ کرنا بڑا ہی نفع بخش سودا ہے۔ مگر اس سودے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ جیب خالی نہ ہو۔ اس نکتے کو زیادہ صاف کرنے کے لیے اسے ایک اور رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب تک طلبہ سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم رہتے ہیں وہ اس وقت تک ملکی دولت کی پیداوار میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ تعلیم بے شک انھیں اس قابل بنا سکتی ہے کہ بڑے ہو کر ملکی دولت میں معتدبہ اضافے کا باعث ہوں۔ لیکن جب تک وہ اس تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ لامحالہ وہ اتنا عرصہ قومی معیشت پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ قومی معیشت میں یہ سکت ہونی چاہیے کہ یہ بوجھ اٹھا لے۔ اگر اس میں یہ سکت نہیں تو وہ ساری کی ساری نئی پود کو موزوں تعلیم و تربیت نہیں دے سکتی۔ اگر وہ ایسا کر سکتی ہے تو صرف ایک مختصر عرصے کے لیے۔

غرض تعلیم کو مفت اور لازمی بنانے کے لیے قومی معیشت کو ترقی پذیر ہونا چاہیے۔ اس میں اس قدر وسعت ہونی چاہیے کہ تمام قومی ضرورتیں پوری ہو جانے کے بعد دولت کا ایک خاصہ حصہ فاضل بچ رہے۔ یہ فاضل دولت نئی پود کی تعلیم و تربیت پر صرف کی جا سکتی ہے۔ یہ فاضل دولت جس قدر زیادہ ہو گی، مفت اور لازمی تعلیم کے عرصے کو اسی قدر لمبا کیا جا سکے گا۔ اگر امریکہ نے تعلیم کو سترہ سال کی عمر تک ہر شہری کے لیے مفت اور لازمی قرار دے رکھا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امریکی معیشت فاضل پیداوار کے معاملے میں بہت خوش نصیب واقع ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کل آبادی دنیا کی آبادی کا کوئی سات فیصد ہے،

مگر یہ ملک دنیا بھر کی پچاس فی صد مصنوعات تیار کرتا ہے۔ آج سے چوتھائی صدی پیشتر کوئی پچاس فی صد امریکی ملکی غذا مہیا کرنے میں معروف تھے۔ مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے اب کوئی پچیس فی صد لوگ اس خدمت کے لیے کافی ہیں۔ صرف غذا کی بہم رسانی کے دھندے سے جو لاکھوں لوگ آزاد ہوئے ہیں انھیں کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھنا ضروری تھا۔ یہ لوگ طرح طرح کے تفریحی مشاغل میں بھی وقت صرف کر سکتے تھے۔ یا یہ وقت مزید تعلیم حاصل کرنے پر صرف کر سکتے تھے۔ امریکہ نے یہ آخری راہ پسند کی۔ چناں چہ ثانوی درجے تک تعلیم مفت اور لازمی کر دی گئی۔ امریکی ثانوی مدرسہ بارہ جماعتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے اکثر ریاستوں نے ہر لڑکے اور لڑکی کے لیے سترہ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دے رکھا ہے۔ اب تجویز یہ ہے کہ لازمی اور مفت تعلیم کے دو سال اور بڑھا دیے جائیں۔ امریکہ پیدائش دولت میں سائنس اور ٹکنالوجی سے اس قدر خدمت لے رہا ہے کہ نہ صرف یہ پیدائش تیزی سے بڑھ رہی ہے بلکہ اس کام کے لیے انسانی محنت کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔

کم و بیش یہی حالت روس اور برطانیہ کی ہے۔ یہ دونوں ملک بھی امریکہ کی طرح ترقی پذیر صنعتی ملک ہیں۔ ان کی معیشت سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ انگلستان کے ہائی سکولوں سے جس قدر طلبا فارغ ہوتے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ ملکی صنعتوں میں جذب کر لیے جاتے ہیں۔ ملکی معیشت صنعتی ترقی کے ایک ایسے درجے پر پہنچ چکی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کارندوں کے لیے بھی جدید سائنس کی مبادیات پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ ترقی پذیر صنعتی معیشت اس قابل ہے کہ نئی پود کو پندرہ سولہ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے میں معروف رکھے اور اس زمانے میں اس کی تمام ضروریات کو پورا کر سکے۔

ان ترقی پذیر صنعتی معیشتوں کے مقابلے میں پسماندہ زرعی معیشتوں کا مسئلہ ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ ان معیشتوں کو ترقی دینے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم عام ہونی چاہیے۔ ایسا کیے بغیر ان معیشتوں میں صنعتی عنصر داخل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان پسماندہ ملکوں میں تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دینے سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ملک کے پاس اس قدر فاضل پیداوار موجود ہے کہ آبادی کا ایک خاصہ حصہ پیدائش دولت میں معروف ہونے کی بجائے تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں لگا رہے؟ افسوس کہ ایک پسماندہ زرعی معیشت میں

اس سوال کا جواب عموماً نفی میں ملتا ہے۔ ایک پسماندہ زرعی معیشت اپنی ساری کوشش کے باوجود بمشکل اپنے شہریوں کا پیٹ پال سکتی ہے۔ غیر معمولی حالات میں اسے پیٹ بھرنے کے لیے بھی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ پاکستان کی معیشت بدیہی طور پر اسی قسم کی ہے۔ یہ ملک اپنی غذائی ضرورتیں خود پوری نہیں کر سکتا۔ غیر ملکی سکہ کمانے کے لیے بھی اسے زرعی پیداوار پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ غیر ملکی سکے کی کمائی دن بدن گھٹ رہی ہے۔ ملک کے پاس نہ اس قدر اناج ہے کہ تمام شہریوں کا پیٹ بھرا جا سکے اور نہ اس قدر غیر ملکی سکہ کہ دوسرے ملکوں سے اناج اور طرح طرح کی مصنوعات درآمد کی جا سکیں اس قسم کی کمزور زرعی معیشت مفت اور لازمی تعلیم کا بندوبست کرے تو کیوں کر؟ ہر چند کہ پاکستان ایک رفاہی ریاست ہے اور اسے تعلیم کی جادو اثری میں پورا یقین ہے۔ مگر یہ تریاق نقد قیمت کا مطالبہ کرتا ہے اور جب تک جیب میں نقد دام نہ ہوں اس وقت تک اس تریاق سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

قابل عمل حل

پس ماندہ زرعی معیشت تعلیم اور اس کے امکانات پر جو پابندیاں عاید کر دیتی ہے وہ ناقابل انکار ہیں۔ تاہم اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے جیسے ملکوں کو نئی پود کی موزوں تعلیم سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دینا چاہیے۔ کوئی معیشت خواہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اسے بچوں کی دیکھ بھال کا بوجھ اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کیوں کہ چھوٹے بچے پیدائش دولت میں کچھ حصہ نہیں لے سکتے۔ کوئی دس بارہ سال کی عمر تک معاشی زندگی میں ان کا حصہ اس قدر برائے نام ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کو ایک کمزور زرعی معیشت بھی مفت اور لازمی قرار دے سکتی ہے۔ تاہم اس کے لیے بھی بڑے خرچ کی ضرورت ہو گی کیوں کہ یہاں سوال صرف بچوں کو آبائی کام کاج سے ہٹائے رکھنے کا ہی نہیں بلکہ ان کے لیے استاد، مدرسے اور کتابیں فراہم کرنے کا بھی ہے۔ بایں ہمہ یہ مالی بوجھ ایسا نہیں جسے ملکی روایات کے حسب حال اٹھایا نہ جا سکے۔ مثلاً مدرسے کی عمارت کا کام گاؤں کی مسجد یا چوپال سے لیا جا سکتا ہے۔ تدریسی فرائض کا بڑا بوجھ مقامی امام مسجد کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے جو اعداد و شمار دستیاب ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی پاکستان میں ابھی کوئی

آدھے بچوں کو ابتدائی تعلیم کی سہولتیں میسر ہیں۔ ان میں سے بھی صرف کوئی ایک چوتھائی ابتدائی مدرسے کی آخری منزل کو ختم کرتے ہیں۔ یہ صورت حال بے حد غیر تسلی بخش ہے۔ نوشت وخواند کی استعداد وہ کم از کم تعلیمی قابلیت ہے جو کسی جمہوری ملک کے ہر شہری میں موجود ہونی چاہیے۔ نئی پود کے ہر فرد کو خواندگی عطا کیے بغیر پاکستان نہ صحیح معنوں میں نہ جمہوری ملک بن سکتا ہے اور نہ ایک اسلامی ملک۔ اب تک ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی بنانے کے لیے مغربی طور طریقوں سے کام لیا گیا ہے مگر نتائج تسلی بخش نہیں نکلے۔ یہ صورت حال اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ قومی روایات اور مخصوص ملکی حالات کے پیش نظر جدت کے ساتھ نئی راہیں نکالی جائیں جو کم از کم لاگت کے ساتھ تھوڑے سے عرصے میں ناخواندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔

تاہم خواندگی تعلیم کی طرف پہلا قدم ہے۔ نوشت وخواند کو محض ان چابیوں کا درجہ حاصل ہے جن کے ساتھ علم وحکمت کے خزانے کھولے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد محض ناگزیر تعلیمی اوزاروں کی فراہمی ہے۔ ان اوزاروں سے کام لینا ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری ہے۔ یہ کام ثانوی مدرسے کا ہے کہ ابتدائی مدرسے نے جو بنیادی مہارتیں عطا کی ہیں ان سے کام لے کر جدید علوم اور سائنسوں کا تعارف کرائے اور یہ معلوم کرے کہ کسی طالب علم میں کونسی خصوصی استعداد موجود ہے۔ اس کے بعد یونیورسٹی یا کالج کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ طالب علم کے خصوصی میلان کی بھرپور آبیاری کرے۔ اور اسے سائنس، تکنالوجی یا علوم کے کسی ایک میدان میں خصوصی مہارت عطا کرے۔ تاکہ وہ قومی زندگی کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکے اور فنی مہارت کے موجودہ دور میں ایک اہم کردار ادا کر سکے۔

جو ترقی پذیر صنعتی معیشتیں اس قابل ہیں کہ اپنے تمام بچوں کو ثانوی درجے تک تعلیم دے۔ لیکن پاکستان جیسے ملک میں جہاں کمزور زرعی معیشت ابھی تمام بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کا بندوبست بھی نہیں کر سکی، یہ مسئلہ بہت ٹیڑھا بن جاتا ہے۔ جہاں جمہوری زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے تمام شہریوں کا پڑھے لکھے ہونا ضروری ہے۔ وہاں جدید سائنسی تہذیب اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ قومی زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی قابل ترین ہاتھوں میں ہو۔ نئی پود میں سے قابل جوہر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جائیں اور انھیں بہترین

تربیت دے کر ملک کی فنی رہنمائی ان کو سونپی جائے۔ جدید زندگی کا سارا تانا بانا سائنس اور ٹکنالوجی سے عبارت ہے۔ اس کارخانے کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ہر شعبے میں خصوصی ماہرین کی ضرورت ہے یہ خصوصی ماہرین ملک کے بہترین دماغ ہی ہو سکتے ہیں۔ جن ملکوں میں ثانوی تعلیم ہر ایک کے لیے مفت اور لازمی ہو وہاں بہترین دماغوں کی تلاش نسبتاً سہل ہے لیکن جس ملک میں ابتدائی تعلیم بھی سب کو میسر نہ آ رہی ہو وہاں یہ کام دشوار ہو جاتا ہے۔

خصوصی فنی مہارت کی قومی ضرورتیں پوری کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ میدان اچھے کھاتے پیتے طبقے کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس طبقے کے بچوں کو توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ ان کے لیے خاص قسم کے تعلیمی ادارے کھولے جائیں جن پر جی کھول کر روپیہ صرف کیا جائے۔ اس طرح قومی قیادت کے متعلق یہ طریق کار بالکل حال ہی تک کارآمد تھا۔ انگریز قوم نے اپنی ترقی کی تمام منزلیں اسی اصول کی بدولت طے کی تھیں لیکن ایٹمی قوت اور تسخیر خلا کے موجودہ دور میں یہ آزمایا ہوا طریقہ قطعاً ناکارہ ہو چکا ہے۔ خود انگلستان کو یہ طریقہ چھوڑ کر زیادہ جمہوری طریق کار اختیار کرنا پڑا ہے۔ جدید برق رفتار دنیا میں بہترین دماغوں سے خدمت لیے بغیر چارہ نہیں اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ قوم کے بہترین دماغ اس کے کسی مخصوص طبقے میں ہی پیدا ہوں گے۔ ہر قسم کی شہادت یہی بتاتی ہے کہ قابل جوہروں کے معاملے میں قدرت کی فیاضی عام ہے یہ جوہر کھلے ہاتھ کے ساتھ اونچے نیچے طبقوں میں یکساں تقسیم کیے جاتے ہیں۔

جدید سائنسی دور میں رفاہی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ قابل ترین جوہروں کو ہر طبقے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان کی بہترین تربیت کرے۔ امریکہ، روس اور برطانیہ کی رفاہی ریاستیں اسی مقصد کے لیے ثانوی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دے چکی ہیں لیکن جو رفاہی ریاست یہ بھاری مالی بوجھ نہ اٹھا سکے اسے کیا کرنا چاہیے۔!

جو رفاہی ریاست ایک کمزور اور غیر استوار زرعی معیشت کی مالک ہو وہ اپنے قابل ترین جوہروں کی تلاش کس طرح کرے؟ یہ بات طے شدہ ہے کہ اسی تلاش کے بغیر ریاست کا اپنا مستقبل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تاہم یہ کام کافی کٹھن ہے کیوں کہ ثانوی درجے سے پہلے خصوصی میلان اور غیر معمولی ذہانت کا درست اندازہ

کرنا آسان نہیں۔ تاہم اس کام کو انجام دینے کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم ہر بچے کو ملے۔ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ شہری ہو یا دیہاتی۔ اسے چھ دس سے گیارہ برس تک ابتدائی مدرسے میں پڑھنا چاہیے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ابتدائی درجے کے خاتمے پر ایک امتحان لیا جائے جس کا مقصد غیر معمولی ذہانت کو تلاش کرنا ہو۔ ہر چند کہ یہ امتحان فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکے گا۔ تاہم اس کے بغیر چارہ نہیں۔ جو طلبہ اس امتحان میں کامیاب ہوں ان میں سے نادار طلبہ کو حکومت کے خرچ پر ثانوی تعلیم ملنی چاہیے۔ تاہم ثانوی درجے پر بھی دو ایک امتحانوں کے ذریعہ ان کے استحقاق کی از سر نو جانچ ہونی چاہیے ثانوی مدرسے کے خاتمے پر میٹرک کا امتحان پہلے سے موجود ہے۔ جو طلبہ اس امتحان میں غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیں انھیں حکومت کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم ملنی چاہیے۔ غرض اس قسم کے انتخاب اور سرکاری کفالت کا ایک نظام قائم کر کے ایک کمزور زرعی معیشت بھی اپنی فنی ضرورتیں اچھی طرح پوری کر سکتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد لامحالہ مفت اور جبری ابتدائی تعلیم پر ہو گی۔ نئی پود کو پورے طور پر پڑھنا لکھنا سکھا کر اور اس میں سے بہترین دماغوں کی مزید تعلیم کا سارا بوجھ خود برداشت کر کے ایک پسماندہ زرعی ملک بھی جدید رفاہی ریاست کی تعلیمی ذمہ داریاں انجام دے سکتا ہے۔

ربِّ زدنی علماً

رفاہی ریاست اس بات میں یقین رکھتی ہے کہ تعلیم ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ مدرسہ۔ کالج اور یونیورسٹی جو علم یا فنی مہارت عطا کرتے ہیں۔ اس کا درجہ ایک ایسی بنیاد کا ہونا چاہیے جس پر ایک روز افزوں علمی اور فنی عمارت تعمیر کی جائے۔ آج علوم و فنون جس ہوش ربا تیزی سے ترقی کر رہے ہیں انھوں نے یہ چیز ناگزیر بنا دی ہے۔ تاہم اسلام کا نظریہ تعلیم پہلے دن سے یہی رہا ہے۔ اسلام علم کی منزل مزید علم قرار دیتا ہے۔ جو علم کسی ایک منزل پر آ کر رک جاتا ہے اسلام اسے علم و حکمت کا نام نہیں دیتا۔

ریاست کے ہر شہری کے لیے علم و فن میں لگاتار ترقی اس قدر ضروری بن چکی ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ ریاستیں بھی اس کی طرف پوری توجہ دینے لگی ہیں۔ ان ملکوں میں گو تعلیمی سہولتیں بے اندازہ ہیں۔ تاہم فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب لوگ زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں علمی اور فنی بالیدگی کے مزید مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں

سرکاری ملازمت ہو یا کسی کارخانے یا کاروباری ادارے کی نوکری ہر جگہ مزید ترقی علمی اور فنی بالیدگی کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ مزید تعلیمی اور فنی بالیدگی حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹیوں اور صنعتی اداروں کی طرف سے شبینہ مدارس اور خاص نصابوں کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اپنی سابقہ علمی قابلیت یا فنی مہارت کو آخری منزل خیال کرکے علمی اور فنی طور پر مردہ نہیں بن جاتا۔ اس کی علمی اور فنی بالیدگی لگاتار جاری رہتی ہے۔

ایک پسماندہ زرعی معیشت کو اس قسم کی علمی اور فنی بالیدگی کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ جہاں معیشت یہ سکت نہ ہو کہ وہ آبادی کے ایک بڑے حصے کو پیدائش دولت سے الگ رکھ کر اسے علمی اور فنی تربیت دے، وہاں اسے چاہیے کہ اپنے شہریوں کو بالغ زندگی کی ذمہ داریاں انجام دینے کے زمانے میں مزید علمی اور فنی تربیت بھی دے۔ عملاً اس کی صورت یوں ہونی چاہیے کہ سرکاری نوکری ہو یا کسی کارخانے یا دوکان کی ملازمت ترقی کا انحصار بالادست لوگوں کی خوشامد یا مدت ملازمت کی بجائے علمی اور فنی بالیدگی پر ہو۔ ترقی اور پیش قدمی کو بالیدگی کے علاوہ دوسری باتوں کے ساتھ وابستہ کر دینا گویا علمی اور فنی بالیدگی کے بے پناہ مواقع کو اکارت گنوانا ہے۔ پاکستان ان بیش قیمت مواقع سے جو فائدہ اٹھا سکتا تھا، اس کا اندازہ بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔ اس نئی مملکت کے قیام پر افراد کی ترقی کے بے اندازہ امکانات پیدا ہو گئے تھے لیکن یہ ترقیاں مدت ملازمت یا دوسرے غیر متعلق اسباب کے ساتھ وابستہ رکھی گئیں۔ اگر انہیں علمی اور فنی بالیدگی پر موقوف رکھا جاتا تو قومی زندگی کئی گنا بہتر بن جاتی۔ ترقی کو علمی اور فنی بالیدگی کے علاوہ دوسری چیزوں کے ساتھ وابستہ کر دینے سے نہ صرف قوم اس فائدے سے محروم رہی بلکہ اس طرح بعض ناپسندیدہ اقدار کو پھیلنے کا موقع بھی مل گیا۔ رفاہی ریاست میں ہر قسم کی ترقی بالیدگی اور صرف بالیدگی کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیے۔

سوالات

محمد عبدالعزیز

تعلیم و تعلم میں سوالات کی افادیت کے متعلق ہمارے ملک میں اساتذہ نے اب تک بہت کم غور و خوض کیا ہے۔ اور اگر اس سلسلے میں کچھ کوششیں ہوئی بھی ہیں تو اسی قدر کہ آپس میں بیٹھ کر دو چار باتیں کر لی گئیں اور جہاں سے بات چلی تھی وہیں رہ گئی۔ یہ انماض اچھا نہیں۔ بچے کی صحیح تربیت کے لیے اس کی نظری اور عملی توضیح کی بڑی ضرورت ہے۔ اور محض اس لیے کہ سوال بچے کی ذہنی زندگی میں جو ارتعاش پیدا کرتا ہے اس کے نتائج دور رس ہوتے ہیں۔ کسی سوال کا ذہن میں آنا دراصل تجسس کی ابتدا ہوتی ہے۔ بچپن میں وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اس کے آداب و اطوار اور زندگی کی جملہ پیچیدگیوں کو سیکھ لیتا ہے۔ لیکن کیسے اور کیوں۔ اس کے سیکھنے کی صرف ایک وجہ ہے۔ انسان کی فطرت میں تلاش و جستجو کی ایک لابدی خواہش ہوتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے اس کے ذہن میں کیوں اور کیسے کی آواز گونجتی رہتی ہے جو اسے ہر وقت آمادۂ جستجو رکھتی ہے۔ چڑیوں کے چہچہے اسے دعوت ترنم دیتے ہیں اور وہ گنگنانے لگتا ہے۔ دوسروں کو لکھتے پڑھتے دیکھ کر اسے بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی ایسا کر سکے۔ لیکن ان ابتدائی مراحل سے نکل کر جب وہ خود زندگی کی پہنائیوں کا جائزہ لیتا ہے تو اگرچہ طریق جستجو میں ایک پختگی آجاتی ہے۔ لیکن جو چیز اسے زندہ رکھتی ہے وہ یہی پہلی خلش ہے۔

استعجاب، حیرت، آرزو، اور رشک بچے کے لیے علم و عرفان کا وسیلہ بن جاتے ہیں، وہ ہر نئی چیز کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا ہے اور اس کے مافیہ و ماعلیہ کے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ تلاش و جستجو کی یہ خلش خواہ حیرت و استعجاب کی شکل میں ہو یا آرزو اور رشک کی صورت میں۔ سوال پوچھنے کی اساس بن جاتی ہے۔ موجودہ طریق تدریس میں تعلیم کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک آمادگی کار اور دوم ہدایت۔ سوال بجائے خود ایک ایسا مہیج ہے جو نہ صرف یہ کہ بچے کو آمادۂ کار کرتا ہے۔ بلکہ مدرس کے پاس اس کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے، جسے

وہ جب اور جس وقت چاہے معرض میں لاسکتا ہے۔

بظاہر سوال پوچھنا آسان ہے اور بالخصوص روایتی طریق تدریس میں۔ بچے جو سبق پڑھتے ہیں اسے یاد بھی کر لیتے ہیں۔ یا انھیں تختی یاد کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے دن مدرس ان کا آموختہ سن لیتا ہے۔ یہ آموختہ کبھی عبارت پڑھنے پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی دو چار سوالوں پر۔ لیکن جدید طریق تدریس میں اس کی نوعیت بدل چکی ہے اور سوال پوچھنے کی تکنیک زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اب تدریس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ بچے چند رسمی سی باتیں ازبر کر لیں اور مدرس کو سنا دیں۔ اب تدریس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ جو کچھ بچوں کو پڑھایا گیا ہے آیا ان میں اس کے تجزیے کی اہلیت پیدا ہو سکی ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ وہ اس پر تنقید کر کے اسے ایک تعمیری کلیے کی شکل دے سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر بچوں کی یہ ذہنی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں تو وہ اس سے زیادہ ذہنی کاوش کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ اور اس کی یہ ابتدائی مشقیں آگے چل کر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

دوسری دشواری کا تعلق مدرس سے ہے۔ ایک سبق کے دوران میں سوالات کی نوعیت بڑی سرعت سے بدلتی رہتی ہے۔ مدرس کے ایک سوال کا جواب ایک بچہ کچھ دیتا ہے اور دوسرا کچھ۔ اس کے علاوہ اس بچے کے جواب سے متاثر ہو کر دوسرا بچہ کوئی اور سوال پوچھ لیتا ہے۔ اور اس طرح موضوع بحث کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ اب اس وقت یہ مدرس کا کام ہے کہ وہ بچوں کے سوال کا جواب کس طرح دیتا ہے۔ اور یہ کہ بچوں کے ذہنوں کو ایک خاص موضوع کے تابع رکھ کر اس موضوع پر عنوان سے بحث کرتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک معمولی مدرس اپنے اس فرض سے بطریق احسن عہدہ برا ہو جائے۔ بظاہر اس کے امکانات کم ہیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مدرس کا ذہن اتنا متنوع ہو کر وہ بچے کی اس بے تابی کا اندازہ لگالے جس نے اسے سوال پوچھنے پر اکسایا۔ اور اگر وہ اس کی صحیح نفسیاتی تحلیل کر کے اسے ایک موزوں جواب دے سکا تو بچوں کی رفتار ترقی یقیناً بڑھ جائے گی۔ اور اگر ان غیر متوقع سوالوں کے جواب سے خود مدرس قاصر رہا تو کلاس میں اس سے جو ناگوار فضا پیدا ہو جائے گی، اس کے نتائج دونوں کے لیے خراب ہو سکتے ہیں۔

تیسری دشواری بچوں کے اختلاف مزاج اور ذہنی پستی و بلندی ہے۔ انفرادی اختلاف ناگزیر ہیں اب اگر مدرس بچوں کی نفسیاتی تحلیل کے بعد ان میں سے ایک ایک کی ضروریات کو پورا کر سکا تو تدریس اور سوال دونوں کا

مقصد حل ہو گیا۔ اور اگر وہ اس میں ناکام رہا تو اس کی تیز بینی نہ ان کے ذاتی اضطراب کو دیکھ سکے گی اور نہ اس انتشار کا تجزیہ کر سکے گی جو ان کی تباہی کا موجب ہو سکتا ہے۔ مدرس کا فرض یہ ہے کہ جماعت کو عزم و حوصلے کے ساتھ آگے بڑھائے، اس کے پیش نظر فوری مفاد اور آخری منزل دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

کامیاب استفسار کے لوازم

اس وقت دنیا میکانکی اعتبار سے اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ہم سوالات کی تکنیک بھی متعین کر سکتے ہیں لیکن چونکہ نہ تو انسان ایک مشین ہے اور نہ اسے ایک بے جان مشین کی طرح برتا جا سکتا ہے۔ اس لیے تکنیک کی تعیین اور اس کے باوصف کہ مدرس کو اس پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ مدرس کی اپنی شخصیت میں کچھ ایسے عوامل کا ایک جا ہونا ضروری ہے جو اسے بچوں کے سیکھنے کا اہل بنا سکیں۔

اچھے استفسار کے لیے مدارس میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ ای۔ ایس۔ سی۔ پارکر نے ان کی تعداد تین بتائی ہے اور بوسنگ نے اس میں ایک کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا لازمی وصف مدارس کا فکری تنوع ہے۔ دوسرا وصف اضافی اقدار کا استدراک اور تیسرا وضع سوالات کی مہارت اور چوتھا اور آخری خود اعتمادی ہے۔

فکری تنوع

فکری تنوع سے مراد مضمون پر قدرت اور استدلال کی عادت ہے۔ مضمون پر قادر ہونا مدرس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک مستری کو اپنے میکانکی اوزاروں سے۔ اگر خود مدرس ہی ناآشنائے راہ ہو تو وہ بچوں کی رہبری کیونکر کر سکتا ہے۔ اگر مدرس کی قدرت مشکوک ہو تو وہ سوال کی پیچیدگیوں میں الجھ کر ایک ذہنی انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے ایک مضمون میں اتنی دسترس ہو کہ وہ اس کے مافیہ کو صحیح طور پر سمجھ سکے تو بچوں کے سوالات کا جواب وہ اس عمدگی سے دے سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ بچوں کے مضطرب ذہنوں کو طمانیت حاصل ہو جائے بلکہ خود اسے اس کام میں ایک گونہ لذت محسوس ہوگی۔ لیکن صرف مضمون کا جاننا ہی کافی نہیں، اس کا تجزیہ کرنا اور اس سے کچھ کلیات مرتب کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، اور اس مہارت کی تحصیل کے لیے مدرس کو سوجوگ کرنے پڑتے ہیں۔ پڑھنا، لکھنا، غور و فکر کرنا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرنا یہ سب جوئے شیر لانے کے

مترادف ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگر مدرس میں یہ صلاحیت مفقود ہے تو نہ اس کی تدریس موثر ہوگی اور نہ اس کے استفسارات میں اتنی جان ہوگی کہ وہ بچوں کے ذوق معلومات کو بیدار کر سکے۔ اور اگر فکری لحاظ سے وہ اپنے خیالات مدلل انداز میں نہیں پیش کر سکتا تو اس کی گفتگو میں نہ ربط پیدا ہو سکتا ہے اور نہ بچوں کے فکر بے پرواکے یکجا کرنے کی اہلیت۔

اضافی اقدار کا استدراک

سبق پڑھاتے وقت مختلف قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سوال مدرس کے ہوتے ہیں اور کچھ بچے پوچھتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو سوال کلاس میں پوچھے جائیں ان میں سے ہر سوال درست ہو۔ ممکن ہے اس کا موضوع زیر بحث سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ یا اگر ہو تو محض خفیف سا۔ اس کے برعکس بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جو موضوع کی جان بن جاتے ہیں۔ ان سے نہ صرف یہ کہ مضمون کے بعض اہم پہلو روشن ہو جاتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان سے تلاش مزید کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور یہ دعوت فکر مدرس اور طلبہ دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مدرس کا کام یہ ہے کہ موزوں اور غیر موزوں کی تمیز کے بعد وہ بعض سوالات اور ان کے جوابات سے صرف نظر کرے اور جو ضروری ہیں ان کی طرف کچھ اس طرح متوجہ ہو جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ اس سے بچوں میں ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ اور مدرس کو اظہار خیال کا اور بچوں کی رہنمائی کا اچھا موقع مل جائے گا۔ اچھائی۔ برائی کا یہ امتیاز اور ضروری اور غیر ضروری کی یہ حد بندی مدرس کی اپنی ذہنی صلاحیت اور عرفان اقدار پر منحصر ہے اور جب تک وہ ان اضافی اقدار کے پہچاننے کی اہلیت نہیں پیدا کر لیتا بچوں کے ذوق حصول کو نہیں چمکا سکتا۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ بچوں کے جواب ہمیشہ صحیح نہیں ہوتے۔ یا یہ کہ اگر صحیح ہیں تو وہ واضح اور مدلل نہیں۔ ان میں اکا دکا بعض خامیاں نظر آ جاتی ہیں۔ ان خامیوں سے بچوں کی ذہنی ترقی رک سکتی ہے اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ سوال اور جواب دونوں کی تعین ہو جائے اور بچوں میں جن خامیوں کے پیدا ہونیکا احتمال ہے۔ اس کا پہلے ہی سے تدارک کر لیا جائے یا کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس سے ان کی تخلیقی قوتیں مجروح

نہ ہونے پائیں۔ لیکن تفہیم کی یہ قوت اس وقت بیدار ہوتی ہے جب پڑھانے والا مستعد ہو اور سوال یا جواب کی ماہیت کو جانتا ہو۔

وضع سوالات

یہ ایک اہم اور نازک موضوع ہے۔ سوالات کی نوعیت کیا ہو۔ الفاظ کس قسم کے ہوں۔ انداز بیان کیسا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مدرس کو اپنے مضمون پر خاص قدرت ہو۔ اس کا ذہن بھی متنوع ہو۔ فکر بھی عمیق ہو۔ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ ضروری اور غیر ضروری کیا ہے۔ بچوں کی افتاد طبع سے بھی واقف ہو اور کلاس کا ماحول بھی اس کے پیش نظر ہو۔ بچوں کے اضطراب والدین کی ملی جلی کیفیت کا بھی عرفان ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ صحیح قسم کے سوالات وضع نہ کر سکے۔ کسی بات کو عمدگی سے کہہ دینا اور بات ہے۔ لیکن اسے اس عمدگی سے کہنا کہ سامع یا قاری متاثر ہو جائیں ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ پر قدرت حاصل کر لینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بونگ نے چار بنیادی قسم کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱) بعض مدرس ذخیرۂ الفاظ کی ایک ایسی سطح سے گفتگو کرتے ہیں جو بچوں کی تفہیم سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس سے یہی نہیں ہوتا کہ تعلیم کی رفتار سست ہو جاتی ہے بلکہ چونکہ سوال ان کے تجربات سے ماورا اور ان کی فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں اور جو گفتگو ہوتی ہے وہ سطحی اور اکثر دور از کار۔

(۲) دوسری دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال بالکل مجرد ہو اور اس خیال کی تفہیم سے بچے قاصر رہیں۔ بالعموم بعض ناتجربہ کار مدرس سوال میں بعض ایسے اصطلاحی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جن کے مفہوم سے وہ خود تو آشنا ہوتے ہیں لیکن بچوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے اصطلاحی قسم کا ذخیرۂ الفاظ استعمال کر کے بچوں کو ایک ذہنی گورکھ دھندے میں پھنسا دینا دانش مندی نہیں۔

(۳) سوال پوچھتے وقت بعض مبتدی ایک موضوع کی بعض درمیانی کڑی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ انھیں اس پر قدرت حاصل نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اسے سہل سمجھ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت یہ مبتدی اساتذہ بھول جاتے ہیں کہ کلاس میں ہر قسم کے لڑکے ہیں۔ ان میں سے بعض ذہین اور

ہونہار ہیں، بعض متوسط اور بعض پست۔ اب ظاہر ہے کہ تینوں گروہوں کا انداز فکر جدا ہوگا۔ جو بات ایک ذہین بچہ محض اشاروں کنایوں میں سمجھ جائے گا۔ وہی لحاظ سے پست بچے کے سمجھانے کے لیے اس مواد کو کسی اور رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔

سوالات کی تدریجی رفتار مناسب اور مفید ہوتی ہے۔ اس کا احساس سائنس یا ریاضی کی تدریس میں اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اگر ریاضی کے سبق میں کوئی درمیانی کڑی چھوٹ گئی ہے تو اس کے بغیر اگلا سلسلہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ بعض بہت ذہین مدرس اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب زیادہ کرتے ہیں۔

(۴) چوتھی دشواری بھی اتنی ہی اہم ہے۔ سوال پوچھ لینا تو آسان ہے لیکن ایسے الفاظ استعمال کرنا جن سے مفہوم واضح ہو جائے قدرے مشکل تجربہ کار مدرس کو الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑتی لیکن ایسے مدرسوں کے لیے جو تعلیمی اداروں کی فضا سے تازہ تازہ مدرسوں میں آتے ہیں یہی کام شروع شروع میں بار خاطر بن جاتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وقت اور تجربہ انھیں مانجھ دیتا ہے اور وہ بھی بکمال شگفتگی بچوں سے سوال پوچھنے کے اہل بن جاتے ہیں۔ مفہوم کی ادائیگی کے لیے صحیح الفاظ کا انتخاب اگرچہ مشکل ہوتا ہے لیکن ہماری تدریسی ضروریات کے لیے بڑا ضروری ہے۔

خود اعتمادی

خود اعتمادی چوتھی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر مدرس اپنی تدریس میں رچاؤ نہیں پیدا کر سکتا۔ مضمون پر قدرت کے باوجود خود اعتمادی یقینی نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض اساتذہ جن کا تعلیمی ریکارڈ نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ انھیں مضمون پر بھی عبور ہوتا ہے، زبان میں سلاست و روانی بھی ہوتی ہے اور وہ چھوٹی محفلوں میں ایک موضوع پر عمدگی سے بحث بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں کسی رسمی ماحول میں بولنے کے لیے کہہ دیا جائے تو انھیں قدرے دشواری ہوتی ہے۔ دوستوں کی نجی محفل میں گفتگو کرنا کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن ایک مجمع کے سامنے خواہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں ہی کا اجتماع کیوں نہ ہو ایک استدلالی گفتگو کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن دشواریوں کے باوجود یہ محض ایک وقتی بات ہو سکتی ہے کہ بعض لوگ سٹیج پر آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ایک بے اعتمادی کا یہ پہلو محض عارضی ہے کہ اس پر قدرت حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

خوداعتمادی ہی سے فکری تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اگر مدرس کو خود اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے تو اس کی ذہنی پریشانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ روشن خیال ہونا۔ بالغ نظر ہونا۔ سریع الفکر ہونا، بڑی عمدہ باتیں ہیں لیکن بے اعتمادی کی صورت میں ان خوبیوں کا پرورش پانا ایک امر محال ہے۔

سوالات کا مقصد اور ان کا کام

اس مختصر سی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بچوں کی تدریس کے سلسلے میں سوالات خاصے اہم ہوتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد اور ان کے کام کی حدود متعین نہیں ہوتیں۔ اس کا لحاظ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ پڑھاتے وقت ان میں بے کرانی سی آ جاتی ہے۔ سوال میں سوال پیدا ہوتا ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔ مدرس کا کام اسی بے کرانی میں کنارہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ بچوں کو ان کی مقررہ منزل پر کس طرح پہنچایا جائے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک طویل موضوع ہے جس پر مختلف اساتذہ مختلف انداز سے بحث کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود چند اصول متعین کیے جا سکتے ہیں جن سے ان کے کام کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔

جائزہ معلومات

سبق پڑھانے کے بعد مدرس کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بچے کی معلومات کا امتحان لے، آیا جو کچھ اس نے پڑھایا ہے بچے نے اسے سمجھا ہے یا اس کی معلومات سطحی اور کچھ الجھی الجھی سی ہیں۔ اس امتحان کا سب سے بہترین طریقہ سوالات ہی ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے۔ ان کا جائزہ لیا جائے اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ بچوں نے ان معلومات کو کس حد تک اپنے ذہن کا جزو بنا لیا ہے اور یہ کہ سبق کے مختلف اجزا سے طلبہ کی واقفیت کیسی ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بچہ سبق رٹ کر سنا دے۔ حرف بہ حرف۔ لفظ بہ لفظ جملہ بہ جملہ۔ لیکن جائزہ معلومات کا یہ طریقہ درست نہیں۔ روایتی طریق تدریس میں جو بالعموم ہمارے مدارس میں رائج ہے سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ بچے کی معلومات کا جائزہ اس طرح لیا جاتا ہے کہ اگر وہ رٹی رٹائی چیزوں کو روانی اور سلامت روی سے سنا سکتا ہے۔ اگر وہ ایک ہی سانس میں پانی پت کی پہلی لڑائی کے اسباب۔ واقعات اور نتائج بیان کر ڈالے تو وہ ایک کامیاب طالب علم، اور اگر یہاں وہاں کچھ سہارا دینا پڑے تو گویا اس کے یاد کرنے میں کچھ نقص رہ گیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک امریکی استانی مس ر. سٹیونس نے اس سلسلے میں کچھ مواد جمع کیا۔ تاریخ کے سوال میں سے

طلبہ کے ایک گروہ نے جو جواب دیے ان میں سے ۹۲ دیے ہوئے جواب تھے۔ باقی بارہ جواب اس حصہ کے تھے جن میں بچوں نے اپنی عقل سے بھی کام لیا تھا۔ اسی طرح دوسرے گروہ کے ۹۰ میں سے ۷۵ جواب رٹے ہوئے تھے۔

جائزے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب مدرس کو یہ معلوم ہو جائے کہ طلبہ کی معلومات کا معیار خاصہ اچھا ہے تو اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ طلبہ کی تفہیم کا معیار کیا ہے۔ آیا جو معلومات اس وقت ان کا ذہنی سرمایہ بن چکی ہیں انھیں وہ اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ وہ اپنی ان معلومات کو استعمال کرنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ایک طالب علم رٹ لیتا ہے اسے وہ من وعن سنا تو سکتا ہے لیکن اسے اس کے ماحول و علیہ سے واقفیت نہیں ہوتی اور اگر سوال ذرا کسی اور انداز سے پوچھ لیا جائے تو وہ اس کا جواب بطریق احسن دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر طلبہ اپنی معلومات کا تنقیدی جائزہ لینے کے اہل ہیں تو انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کا صحیح مصرف کیا ہے۔

روایتی انداز میں کسی چیز کا یاد کر لینا اس امر کی ضمانت نہیں کہ طلبہ اسے سمجھتے بھی ہیں۔ اس کے لیے سوالات اس قسم کے ہوں جن سے صرف معلومات ہی اخذ کرنا مقصود نہ ہو بلکہ اس سے ان کی ذہنی بالیدگی کی پیمائش بھی مقصود ہو۔ ایک متعلم مدرس نے علاؤالدین کا نظم سلطنت پڑھایا شروع سے آخر تک سوالات کی بوچھاڑ رہی۔ علاؤالدین نے امرا کو کس طرح دبایا۔ بازار میں چیزوں کا نرخ کیسے متعین کیا۔ غرض اس نے اس کی انتظامی کل کے متعلق بہت سے سوال پوچھے جو تمام تر بیانیہ تھے۔ ان میں کہیں تنقیدی چاشنی نہ تھی۔ اس نے چیزوں کا نرخ کیوں مقرر کیا۔ اس کے پیچھے تجارت کے کنٹرول کا جو اصول کارفرما تھا، اگر اس کا دور حاضر کی تجارت اور کنٹرول سے موازنہ کیا جاتا، تو یہی نہیں کہ بچے علاؤالدین کی تجارتی حکمت عملی سے واقف ہو جاتے۔ انھیں یہ بھی احساس ہو جاتا کہ تجارت کے موجودہ طریقے انھیں پرانے طریقوں سے مستعار ہیں اور دنیا میں یہ تسلسل ناگزیر ہے۔ پرانی بنیادوں ہی پر نئی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

طلبہ کے تجربوں کا سبق سے تعلق

جدید تعلیم میں نظری اور عملی اعتبار سے بچوں کی شخصیت کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیم بچوں کے لیے

بچے تعلیم کے لیے نہیں۔ اس لیے اسے ان کی عملی ضروریات کے مطابق ڈھالنا ان کی صحیح خدمت ہے۔ اور اگر اہلِ مدرسہ بچوں کی تعلیم و تربیت اس عنوان سے کر سکیں کہ ان میں فکری جہد و عمل کی عادت پیدا ہو جائے تو گویا انھوں نے معاشرے کی سب سے بڑی خدمت انجام دی۔ بچوں کے تجربات اور معلومات کو اساس بنا کر اگر انھیں کوئی بات بتائی جائے تو وہ آسانی سے ان کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ بعض طلبہ کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ بعض سیر و سیاحت کے شوقین ہوتے ہیں۔ اور پھر انھیں بعض ایسے تجربے ہوتے ہیں جو سبق کی تدریس اور طلبہ کی تفہیم پر ایک لابدی اثر ڈال سکتے ہیں۔ ایک دانش مند مدرس طلبہ کی ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر انھیں کام کی باتیں بتاتا ہے۔ مثلاً اگر مدرس کو پوٹھوار کی سطحِ مرتفع پر سبق پڑھانا ہے تو وہ بچوں سے پوچھ سکتا ہے کہ تم میں سے راولپنڈی کون کون گیا ہے۔ جہلم کے اطراف میں کس قسم کا علاقہ دیکھا۔ اور اس طرح ان کی معلومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ انھیں رفتہ رفتہ پوٹھوار کی سطحِ مرتفع کے متعلق وافر معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔

ذوق انگیزی

یہ ایک امرِ مسلمہ ہے کہ جب تک طلبہ میں ذوقِ جستجو اور سبق میں ایک علمی دل چسپی پیدا نہ ہو، سبق روکھا پھیکا رہتا ہے اور طلبہ اس سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ ان کے لیے اتنا مفید نہیں ہوتا۔ ذوقِ جستجو سے یہ مفہوم مراد ہے کہ طلبہ میں کسی چیز کے جاننے کا یا کسی مسئلے کے حل کرنے کا اب شدید جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ ہمہ تن کاربند ہو کر اس کے حصول میں لگ جائیں۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا بیج ہے جس کی مدد سے بہت کچھ پڑھایا اور سکھایا جا سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ہر مسئلے کی تہ میں ایک سوال ہوتا ہے۔ اگر اس سوال کا صحیح اور تسلی بخش جواب مل جائے تو گویا مسئلہ حل ہو گیا۔ طلبہ کے مسائل بھی اسی طرح حل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک اچھا مدرس حصولِ معلومات کی لگن پیدا کر کے طلبہ کو آمادۂ کار بنا لیتا ہے۔ جب کام میں انھیں یک گونہ نسبت پیدا ہو جائے تو چند موزوں سوال پوچھ کر یہی نہیں کہ ان کے ذوق کو تسکین دی جائے بلکہ ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اگر سوالات کی ترتیب اچھی ہے اور انھیں اس انداز میں پیش کیا گیا ہے جو طلبہ کے لیے مہمیز کا کام دے تو کوئی وجہ نہیں کہ سست اور غیر متوجہ طالب علم بھی اس میں اپنے شوق و انہماک کا اظہار کریں۔ اس طرح ان سوالوں کی حیثیت ہنگامی نہ ہوگی

بلکہ زفتہ رفتہ طلبہ کو ایک مستقل علمی اور ادبی جستجو کا خوگر بنادیں گے۔ ثانوی مدارس میں طلبہ اپنی زندگی کی اس منزل پر پہونچتے ہیں۔ جہاں وہ تھمنا نہیں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ایک اچھا مدرس ان کی اس خلش کو اور تیز کر کے زندگی کو شوخی وطراری عطا کر سکتا ہے اور یہ شوخی وطراری زندگی کی وسعتوں میں اسوقت کام آسکتی ہے۔ جب بچپن اور جوانی اس کش کش واضطراب میں گذرے۔

مشق کے مواقع

طلبہ کے ذوق جستجو کو برانگیختہ کرنا ہی تعلیم کی آخری منزل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ طلبہ کسی ہنگامی جذبے کے تحت کچھ سیکھ لیں۔ لیکن وہ ہنگامی عالم نہ رہا تو سیکھی ہوئی باتیں بھول جایا کرتی ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ انھیں مشق کے مسلسل مواقع بہم پہونچائے جائیں۔ مشق سے باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ مثلاً تاریخ کا ایک سبق اگر کئی بار پڑھا جائے تو اس تکرار سے معلومات کے جو نقوش ذہن میں مرتسم ہوں گے وہ جلد بھلائے نہیں جاسکیں گے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ پڑھ کر اسے چھوڑ دیا جائے تو بھول جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے صاحب بصیرت مدرس یہ بھی کر سکتا ہے کہ ایک موضوع پر وقتاً فوقتاً اس قسم کے سوالات پوچھ لیا کرے جس سے سبق کا اعادہ ہوجائے تو بھول جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور بھولی بسری باتیں ایک بار پھر طالب علم کے ذہن میں محفوظ ہوجائیں۔ اس کے علاوہ بعض چیزوں میں مہارت پیدا کرنے کے لیے فوری جواب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی سوال پوچھا جائے اور ذہن میں اس کا جواب مرتب ہوجائے۔ یہ فوری جواب تدریسی زبان کے سلسلے میں زیادہ ضروری ہے۔ ایک زبان اور بالخصوص غیر زبان اس وقت تک تیزی سے نہیں بولی جاسکتی جب تک ہر لفظ اور ہر ترکیب زبان پر رواں نہ ہو یا مثلاً پہاڑوں کی اتنی مشق ہو کہ تیر و تفنگ منہ سے نکلے اور طلبہ کی زبان پر ۱۹ کا ہندسہ ہو۔ اس مشق اور تکرار سے ایسی ذہنی تبلیغ ہوتی ہے کہ طالب علم اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

فکر انگیز

کہا جاتا ہے کہ اس دور میں ثانوی تعلیم کا مقصد طلبہ کی زندگی کے مسائل کا حل سکھانا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے مسائل کے حل کے لیے کیف وکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ

کیوں ہوا۔ اس کے کیا اسباب ہیں اور اس کا کیا حل ہے۔ جب ایک مسئلہ دعوت فکر و عمل دیتا ہے تو سوالات آپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں اور انہیں کی امداد سے لاینحل مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو ہر مسئلے کی تہ میں سوال اور ہر سوال کی تہ میں مسئلہ ہوتا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے طلبہ کو متاثر کرے۔ ہمیشہ ایسا اس لیے کلاس میں جو سوال پوچھے جائیں وہ فکر انگیز ہوں جن سے طلبہ میں سوچ بچار کی عادت پیدا ہو۔

جائزۂ اقدار

زندگی میں ہم جو کام کرتے ہیں اور جس قسم کا کام کرتے ہیں اس کی بری یا بھلی کوئی حیثیت ہوتی ہے اور ہم اس کے اچھے یا برے ہونے کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ یہ جائزہ دراصل فکر صحیح کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ ایک کام کے تجزیے اور اس کی قدر و قیمت کرنے کی اہلیت فکر کی پختگی کی بڑی علامت ہے۔ ورنہ نہ تو کسی کلیے کی تشکیل ممکن اور نہ اس کلیے کو زندگی کے مختلف مراحل میں آزمانے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک اچھا مدرس طلبہ میں تنقیح و تنقید کی ایسی اسپرٹ پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے جمع کردہ مواد اور اپنے تجربات کا تجزیہ کر کے صحیح نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ ان کی عادت بن جائے تو زندگی کی اس پہنا ور فضا میں انھیں شکست پرواز کا گلہ نہ ہوگا۔

مواد کی ترتیب و تشریح

تنقید اگرچہ کسی کام کی اچھائی یا برائی کے ناپنے کا ایک گراں قدر پیمانہ ہے لیکن یہ اس کی آخری حد نہیں ہے۔ تنقید کے بعد اول یا کلیے کی ترتیب کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر طلبہ میں یہ شعور پیدا کر دیا جائے کہ رد و کد کے بعد کسی مسئلے کی حد تک پہنچ جائیں تو اس طرح مدرس انتشار میں نظم، وحدت فکر اور وحدت کار پیدا کر سکتا ہے۔ بعض طلبہ کو مضمون پر خاصی قدرت ہوتی ہے۔ لیکن ان میں مواد کی ترتیب و تنظیم کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ اس خامی کی وجہ سے ان میں جو فکری انتشار پیدا ہوتا ہے وہ انھیں بے راہ بنا دیتا ہے اور پھر وہ کسی چیز کو خوش سلیقگی سے پیش کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ چنانچہ تنقید کا مقصد ایک ایسے کلیے کی تخلیق ہے جو زندگی میں کام آسکے۔ اس طرح سوال و جواب کے جو اصول مرتب کیے جائیں ان کا زندگی سے براہ راست تعلق ہو۔

انفرادی اور اجتماعی توجہ | جب کلاس میں مدرس سوال پوچھتا ہے تو اس کے پیش نظر ساری جماعت

من حیث الجماعت ہوتی ہے۔ اس میں اچھے برُے، ذہین اور غبی ہر قسم کے طالب علم ہوتے ہیں اب اگر مدرس یہ چاہے کہ معیاری قسم کے سوال پوچھ کر ان کی اہلیت کا جائزہ لے لے تو یہ ایک نا روا اقدام ہوگا۔ نارو ا اس لیے کہ سارے طالب علم اس کی توجہات کے یکساں طور پر حقدار ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سب معیاری سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ ایسی صورت میں مدرس کا کام قدرے مشکل ہو جاتا ہے اگر اچھوں کو دیکھتا ہے تو برُے اور برُے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر بروں کی طرف توجہ کرتا ہے تو اچھوں کی تخلیقی قوتیں تشنۂ نمائش ہو جاتی ہیں۔ ان خرابیوں کے باوجود مدرس کا فرض ہے کہ وہ اس امر کا جائزہ لے کہ اسے کس کی جانب کتنی توجہ دینی ہے اور کس سے کس قسم کے سوال پوچھنے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے، کہ کلاس میں ایک جمود و تعطل سا پیدا ہو جاتا ہے اس تعطل کو توڑنے کے لیے کچھ ایسے سوالات پوچھنے ضروری ہیں جو محرک دلچسپی ہوں۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی کوئی نفسیاتی یا فکری افادیت ہے یا نہیں۔

تحسین کار اور ذوق مطالعہ

سوالات کی مدد سے مدرس، طلبہ میں تحسین کار کو جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ سماجی نفسیات کے ماہر سوالات کو انسانی خصائل کی تبدیلی کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔ انسان کی کچھ پسند اور نہ پسند ہوتی ہیں۔ اچھے سوالات ان کے جذبۂ تحسین کو بیدار کرتے ہیں اور وہ اپنی توجہات ایک مفید اور موزوں کام پر مرکوز کر لیتے ہیں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بعد میں ایسے خواص پیدا کیے جائیں کہ وہ ہر چیز کی جذباتی احساساتی اور ذہنی تحسین کے اہل بن جائیں۔

اسی طرح سوالات طلبہ میں ذوق مطالعہ کا موجب بن جاتے ہیں۔ ان کی ترتیب میں یہ اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ طلبہ میں پڑھنے کا شوق بیدار ہو جائے۔ اور اگر یہ سوالات طلبہ کو مطالعہ کا خوگر نہ بنا سکے تو تدریس کی یہ ساری کاوش بے دقیع ہوگی۔ جنگل میں مور ناچا کسی نے نہ دیکھا کسی نے نہ دیکھا ۔ (باقی آئندہ)

روسی نظامِ تعلیم

انور علی

انقلاب کے وقت

پہلی عالمی جنگ کے اواخر میں جب روسی محنت کشوں نے زار کا خاتمہ کر کے ملکی اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو دوسرے مسائل کے علاوہ ان کے سامنے ایک مشکل سوال نظامِ تعلیم کی تجدید کا تھا۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ پرانے نظامِ تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیے بغیر ملک میں نیا معاشرتی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روس کے وسیع و عریض علاقوں میں بسنے والی بھاری اکثریت اَن پڑھ تھی۔ خواندگی کا تناسب چالیس فی صد سے بھی کم تھا۔ جو لوگ معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ بھی صدیوں سے جابر اور مطلق العنان حکومت کے آہنی پنجے تلے پسے چلے آتے تھے۔ اس آہنی گرفت نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر رکھا تھا۔ وہ نہ خود سوچ بچار کی اہلیت رکھتے تھے اور نہ ذمہ داری کے کسی کام پر بھروسے کے ساتھ ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اس ذہنی بےبسی کی رہی سہی کسر کو مذہبی توہم پرستی نے پورا کر رکھا تھا۔ عوام اپنی خستہ حالی اور بےبسی کو خدا کا منشا قرار دے کر تن بہ تقدیر اپنی قسمت پر شاکر تھے۔ ملک کی بیشتر آبادی اس قسم کے افلاس زدہ اور توہم پرست کسانوں پر مشتمل تھی۔ یہ آبادی لاکھوں مربع میل کے رقبے میں بکھری پڑی تھی۔

یہ تھی ملک کی معاشرتی حالت جب ۱۹۱۷ء کے کامیاب انقلاب کے بعد روس کی قسمت کی باگ ڈور کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں آئی۔ یہ لوگ بے قرار انقلابی روح کے حامل تھے۔ وہ پرانے نظام کو ملیامیٹ کر کے اس کی جگہ ایک نیا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ پرانے نظام کے گنبد کو گرا چکے تھے لیکن اس کا بانی ڈھانچہ ابھی جوں کا توں باقی تھا۔ انقلاب نے ملکی زندگی میں خاصی ہل چل اور افراتفری بھی پیدا کر رکھی تھی۔ لینن اور اس کے انقلابی ساتھیوں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ پرانے نظام کی جگہ نیا نظام کس طرح قائم کیا جائے۔ اس سوال کے جواب کے متعلق ان کے دلوں میں کوئی شک و شبہ نہ تھا نیا معاشرتی نظام تعلیم کی وساطت سے

بھی قائم کیا جا سکتا تھا۔ اپنی خوابوں کی دنیا تعمیر کرنے کے لیے انھیں تعلیم کو مؤثر طور پر اپنے قابو میں لانا تھا نظامِ تعلیم کو مکمل طور پر حکومت کے ہاتھ میں دیے بغیر نئے معاشرے کی تعمیر ناممکن تھی۔ لینن، اور اس کے انقلابی ساتھیوں نے تاریخ کا یہ سبق پلے باندھا اور نئے معاشرتی نظام کی تعمیر میں لگ گئے۔

آہنی پردہ

روس کے متعلق دنیا کو بجا طور پر شکایت ہے کہ اس کے حکمرانوں نے اس ملک کے گرد ایک ایسا آہنی پردہ لٹکا رکھا ہے جس میں سے باہر کا کوئی آدمی جھانک نہیں سکتا۔ اس آہنی پردے کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے، دنیا کو اس کا بیشتر حال سرکاری رپورٹوں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھار جو لوگ اس آہنی پردے کو پھلانگ کر آزاد دنیا میں بھاگ آتے ہیں، ان کی زبانی روسی زندگی پر بعض اوقات بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ دنیا کو اس ذریعہ سے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں ان کے پیشِ نظر سرکاری رپورٹوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔

تاہم اس عجیب و غریب صورتِ حال کی معقول وجہ موجود ہے۔ مدرسہ بے شک تعلیم کا ایک بے حد اہم ذریعہ ہے لیکن مدرسے کے علاوہ بعض اور غیر رسمی ادارے بھی عوام کی تعلیم میں لگے رہتے ہیں۔ اخبارات ریڈیو۔ اشتہارات۔ مذہبی ادارے، یہ تمام تعلیم کے غیر رسمی ذرائع ہیں۔ یہ رائے کو غیر محسوس طور پر مگر لگاتار متاثر کرتے ہیں۔ جو حکومت تعلیم کے ذریعے ایک نئے معاشرتی نظام کی تعمیر کا بیڑا اٹھا چکی ہو وہ ان غیر رسمی تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ان اداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدرسے جو کام انجام دے رہے ہیں اس کی تاثیر ساتھ ہی ساتھ زائل ہوتی رہے اور اس طرح تعمیرِ نو کا کام بہت طول کھینچے۔ وقت اور محنت کی بچت کے لیے ضروری تھا کہ مدرسے اور غیر رسمی تعلیمی ادارے سب کے سب مل کر ایک ہی سمت میں زور لگائیں تاکہ منزلِ مقصود پر تھوڑے سے تھوڑے وقت میں پہنچا جا سکے چنانچہ روسی حکومت نے یہی کیا۔ اس نے نہ صرف مدرسوں کی تعلیم پورے طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بلکہ اخبارات ریڈیو۔ پبلک تقریریں اور اظہار کے دوسرے ذرائع بھی مکمل طور پر حکومت کی نگرانی میں آ گئے۔ روسی تعلیم کا مقصد اشتراکی معاشرے کی تعمیر تھا۔ جو عوامل اس مقصد سے ٹکراتے تھے ان سب کا راستہ

بند کر دیا گیا۔ نہ صرف مدارس کی تعلیم پورے طور پر حکومت کے ہاتھ میں آگئی بلکہ ان تمام ذرائع اظہار اور ذرائع نشر و اشاعت پر بھی مکمل نگرانی قائم کر دی گئی جو لوگوں کے خیالات کو متاثر کر سکتے ہیں۔ گرجے کا وعظ پبلک تقریر، اخبارات و رسائل، ریڈیو نشریات، افسانہ نویسی، شعرگوئی غرضیکہ ہر وہ ذریعہ اظہار جو لوگوں کے خیالات پر اثر انداز ہو سکتا تھا مکمل سرکاری نگرانی میں آگیا۔

حکومت کے اس ہمہ گیر فکری محاصرے کا یہ اثر ضرور ہوا کہ روسی نظام تعلیم صرف پچیس سال کے مختصر عرصے میں اس قابل ہو گیا کہ انقلابیوں کی خوابیوں کی دنیا کو عملی شکل دیدے۔ اگر نظام تعلیم کی تجدید کے ساتھ باقی ملکوں کی طرح روس میں بھی مکمل فکری آزادی باقی رہتی۔ اگر اخبارات و رسائل، ریڈیو، ناول نویس، شاعر اور مقررین کو یہ آزادی ملی رہتی کہ جو جی میں آئے کہیں اور جس طرح چاہے حکومت پر نکتہ چینی کریں تو نیا معاشرتی نظام اس تیزی سے تعمیر نہ ہو سکتا۔ انقلابی روس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے فکری آزادی کو قربان کرنا ضروری سمجھا۔ یہ قیمت ادا کیے بغیر نئے نظام کا اس قدر جڑ پکڑنا ممکن نہ تھا۔

یہاں ذہن میں شاید یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک فائدہ مند سودا ثابت ہوا ہے یا خسارے کا سودا؟ فکری آزادی یقینی طور پر انسان کی ایک قیمتی متاع ہے۔ اسے قربان کر کے قومی سربلندی کے لیے راستہ ہموار کرنا کہاں تک درست تھا؟ اس سوال کا جواب تاریخ دے چکی ہے اور یہ جواب روس کے حق میں ہے۔ روس نے ۱۹۱۷ء میں اپنے بوسیدہ نظامِ حیات کو جڑ سے اکھاڑ کر نئی زندگی کی تعمیر شروع کی تھی۔ نہ صرف یہ کہ تعمیر کا کام بے حد لمبا چوڑا اور پیچیدہ تھا۔ بلکہ معماروں کو حد درجہ صبر آزما ملکی حالات کے علاوہ ناموافق بلکہ واضح طور پر معاندانہ غیر ملکی حالات کا سامنا تھا۔ تعمیر کے کام کو شروع ہوئے ابھی پچیس سال پورے نہ ہونے پائے تھے کہ دنیا کی مہیب ترین فوجی آمریت یعنی نازی جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ نے روس کے نوخیز معاشی نظام کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ بالآخر یہ نیا معاشی نظام اس کٹھن آزمائش میں کامیاب نکلا۔ روس نے تعمیر نو کے لیے فکری آزادی کی جو بھاری قیمت ادا کی تھی وہ ٹھکانے لگی۔ اگر یہ قیمت ادا کر کے قومی تعمیر کی رفتار تیز نہ کر دی گئی ہوتی تو یہ بات غیر اغلب ہے کہ روس دوسری عالمی جنگ کے مشکل امتحان میں سے بخیریت گذر سکتا۔

بین الاقوامی اشتراکیت کے ترانے کی جگہ روس نے جو نیا قومی ترانہ اختیار کیا ہے اس میں سرزمین روس کو آزاد لوگوں کی جمہوریت کہا گیا ہے۔ مگر آزادی کی ایک لازمی شرط آزادی فکر ہے۔ جب تک کوئی فرد یا قوم اس قابل نہ ہو کہ بنیادی طریقہ ہائے کار اور متضاد نظریوں پر آزادی سے تنقید کر کے ان میں سے جس کو چاہے اپنے لیے پسند کرے۔ اس وقت تک اسے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ روسی رہنماؤں کو اس حقیقت کا احساس ہے۔ تاریخی احتساب کے سامنے میں وہ رفتہ رفتہ اپنی روش کو بدلتے نظر آتے ہیں۔ اب ادب نگاروں اور شاعروں پر وہ پہلی سی پابندی نہیں۔ تاہم انہیں ابھی اس بات کی اجازت نہیں ملی کہ حکومت کی حکمت عملی یا اشتراکی فلسفہ زندگی پر نکتہ چینی کریں۔

استادوں پر احتساب

انقلاب کے بعد نئے معاشرتی نظام کی تعمیر کے لیے تربیت یافتہ سائنس دانوں اور ماہر کاریگروں کی ہر جگہ ضرورت تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ نوجوانوں کو بھاری تعداد میں فنی تعلیم دی جائے۔ مگر تعلیم دینے والے استاد پرانے دور کی پیداوار تھے۔ انھیں اشتراکی فلسفۂ زندگی میں کوئی اعتقاد نہ تھا۔ بلکہ اکثر صورتوں میں ان کی ہمدردیاں پرانے نظام کے ساتھ تھیں۔ حکومت روس کو صرف فنی ماہروں اور سائنس دانوں کی ضرورت نہ تھی۔ اسے یہ بھی ضرورت تھی کہ یہ ماہر اور سائنس دان اشتراکی نظریہ حیات کے پیکر ہوں۔ پرانے استادوں سے اس قسم کی تربیت کی امید نہ تھی۔ بلکہ ان سے یہ خطرہ تھا کہ وہ درس و تدریس کے ضمن میں ایسی باتیں کہہ جائیں گے جو اشتراکی کردار کے منافی ہوں۔

اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے استادوں پر احتساب قائم کیا گیا۔ ملک بھر میں نوجوانوں کی تنظیمیں قائم کی گئیں اور یہ احتساب ان کے سپرد کر دیا گیا۔ تعلیمی اداروں کا نظم و نسق استادوں سے چھین کر ان معلم رہنماؤں کو سونپ دیا گیا۔ نظم و نسق اور ہر قسم کے انتظامی معاملات میں ان نوجوانوں کو دخل حاصل تھا۔ ان کے احتساب نے پرانے استادوں کے لیے یہ ناممکن بنا دیا کہ وہ اشتراکی فلسفۂ زندگی کے خلاف ایک لفظ تک بھی منہ سے نکال سکیں۔

نوجوان طلبہ کو اس طرح انتظامی معاملات میں شریک کرنے سے استادوں پر احتساب تو قائم

لیکن خود طلبہ کی تعلیمی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ وہ اپنا سارا وقت انتظامی معاملات کے ہنگاموں کی نذر کرنے لگے اور پڑھائی سے بالکل غافل ہو گئے۔ اس سے تعلیمی معیار دن بدن گرنے لگا۔ تاہم روسی رہنماؤں کا ہاتھ لگاتار معاملات کی نبض پر تھا۔ انھوں نے محض ایک ہنگامی ضرورت پوری کرنے کے لیے طلبہ کو انتظامی ذمہ داری سونپی تھی۔ تعلیمی اداروں میں رفتہ رفتہ نوجوان استاد آنے لگے تھے۔ ایسے استاد جن کی وفاداری ہر قسم کے شک سے بالا تھی۔ آخر ۱۹۲۸ء میں سب روسی رہنماؤں نے دیکھا کہ نوجوان استادوں کی تعداد خاصی ہو گئی ہے تو معلم رہنماؤں کو انتظامی امور سے الگ کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ مدرسوں کا نظم و نسق پورے طور پر دوبارہ استادوں کو سونپ دیا گیا اور طلبہ سے کہا گیا کہ اب وہ صرف اپنی پڑھائی سے سروکار رکھیں۔

تعلیمی معیاروں کو بلند کرنے کے لیے درسی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اب تک مرکز توجہ صرف طلبہ کی تعداد تھی۔ ہر قسم کے تعلیمی اداروں میں زیادہ سے زیادہ طلبہ کو فارغ التحصیل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ کمیت کے ساتھ تعلیم کی کیفیت کو بھی توجہ ملے۔ اب مدرسوں میں آسان اور غیر معیاری کتابچے یا خلاصے مروج چلے آ رہے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ان کو ختم کر کے ان کی جگہ معیاری درسی کتابیں رائج کی گئیں۔ روسی مدرسوں کا مقصد اب صرف یہ نہ رہا کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو تعلیم دیکر فارغ کریں۔ ان کا دوسرا مقصد یہ بھی قرار پایا کہ تعلیمی معیاروں کو بلند سے بلندتر کرتے جائیں۔ تاکہ قومی زندگی کے ہر میدان کو قابل ترین فنی رہنما میسر آ جائیں۔ نوجوان طلبہ کی لگام جو پوری ایک دہائی سے ڈھیلی چلی آ رہی تھی ایک دم کس دی گئی۔ ان سے مطالبہ ہونے لگا کہ مدرسے کے ضبط کو قبول کریں اور پوری محنت سے کام کریں۔

امتحانات کا خاتمہ اور دوبارہ اجرا

انقلاب کے بعد روسی زندگی میں فنی ماہروں کی جو بے پناہ کمی تھی اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے پورا کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ موجودہ تعلیمی اداروں کے دروازے چوپٹ کھول دیے جائیں اور نئے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ چناں چہ مدرسوں نے ہر طرح کے امتحان ختم کر دیے نہ کوئی داخلے کا امتحان باقی رہا۔ نہ سالانہ ترقی کا اور نہ ہی نصاب مدرسہ کے خاتمہ پر۔ بچوں، نوجوانوں، اور

بڈھوں سب کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ مدرسوں کا رخ کریں اور پڑھنا لکھنا سیکھیں۔ ادھر مدرسوں نے اپنی کوشش بڑھانے کے لیے ہر طرح کی آزمائش اور امتحانوں کا خاتمہ کر دیا۔

فنی تربیت کے لیے حکومت کے مختلف محکموں، اجتماعی فارموں اور کارخانوں کے ساتھ خاص قسم کے مدرسے ملحق کر دیے گئے۔ یہاں نئے ملازموں کو فنی اور صنعتی تعلیم دی جانے لگی۔ کارخانوں کے ساتھ جو مدرسے قائم کیے گئے وہ خاص طور پر اہم تھے۔ کیوں کہ وہ جدید صنعتی تکنیک کی تربیت دیتے تھے۔ انہیں ربفاک کا نام دیا گیا۔ تاہم شروع شروع میں کئی سال تک ان تربیت گاہوں کے معیار بہت پست رہے جدید صنعت کی بنیاد سائنس پر ہے۔ ان تکنیکوں میں مہارت پیدا کرنے کے لیے سائنس کے بنیادی حقائق کا صحیح فہم ضروری ہے۔ مگر جو لوگ ربفاکوں یا دوسری فنی تربیت گاہوں کا رُخ کرتے تھے وہ عموماً ان پڑھ ہوتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ صدیوں کی استبدادی گرفت نے ان کے قلب و دماغ کو مفلوج کر رکھا تھا عام تعلیم کی طرح فنی اور صنعتی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بھی دقت درکار تھا۔ چناں چہ عام مدرسوں کی طرح ٹیکنیکل اور صنعتی تربیت گاہوں میں بھی اول اول کوئی امتحان نہ رکھا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ امتحانات اور آزمائشیں داخل ہونے لگیں۔ ۱۹۲۸ء تک ملک میں خواندگی کا تناسب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ فنی اور صنعتی درس گاہوں میں داخلے کی شرائط کڑی کر دی جائیں۔ ساتھ ہی دوران تعلیم اور خاتمہ تعلیم پر امتحان ہونے لگے۔ اس طرح عام تعلیمی معیاروں کے ساتھ ساتھ فنی اور صنعتی تعلیم کے معیار بھی بلند ہونے لگے۔

مخلوط تعلیم کا رواج اور اس کا خاتمہ

انقلاب کے وقت ملک میں خواندگی کا تناسب چالیس فی صد سے کم تھا۔ سو اشخاص میں سے بمشکل ساٹھ ایسے تھے جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ بیس کروڑ کی آبادی میں سے ساٹھ فی صد لوگوں کو خواندہ بنانا ایک بے حد کٹھن کام تھا۔ اس راستے کی سب سے بڑی دشواری کافی تعداد میں مدرسے اور استاد مہیا کرنا تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے تعلیم کو مخلوط رکھا گیا۔ ابتدائی مدرسے سے لے کر کالج کے درجے تک لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ نصاب تعلیم میں ایسے مضامین ضرور رکھے گئے جو خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کے ساتھ

مناسبت رکھتے ہوں۔ تاکہ لڑکیاں یہ مضامین لے لیا کریں۔ مخلوط تعلیم کا یہ تجربہ ۱۹۴۳ء تک جاری رہا۔

۱۹۴۳ء میں مخلوط تعلیم صرف ابتدائی مدرسے تک محدود کر دی گئی۔ ثانوی تعلیم کے لیے لڑکے اور لڑکیوں کے مدرسے الگ الگ ہو گئے۔ اپنے اس فیصلے کے جواز میں روسی رہنماؤں نے کہا کہ مخلوط تعلیم کے تجربے نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ لڑکیاں ہر وہ کام کر سکتی ہیں جو لڑکے کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اب اس تجربے کو آئندہ جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم مخلوط تعلیم ختم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ثانوی مدرسوں میں لڑکوں کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دی جا رہی تھی۔

مزدور کی حکمرانی

لینن اور اس کے ساتھیوں نے مزدوروں اور محنت کشوں کو صدیوں کی ذلت سے نجات دلانے کے لیے زار کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ انقلاب کے بعد ان کا نصب العین یہ تھا کہ حکمرانی کی باگ ڈور مزدوروں اور محنت کشوں کو سونپ دی جائے۔ اب تک ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم صرف حیثیت طبقے کے لیے مخصوص رہی تھی۔ اعلیٰ ٹیکنیکل اور فنی تربیت گاہوں میں اسی طبقے کے بچے تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہی لوگ حکومت کے تمام کلیدی عہدوں پر چھا جاتے تھے۔ اس طرح ملکی اقتدار ان گنے چنے لوگوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ انقلابی اس صورت حال کا خاتمہ کر کے مزدوروں اور محنت کشوں کو ملکی اقتدار میں برابر کا شریک بنانا چاہتے تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ اعلیٰ فنی اور ٹیکنیکل تعلیم کے دروازے سب کے لیے یکساں طور پر کھل جائیں۔ تاکہ ہر طبقے کے قابل اور ذہین بچے قومی رہنماؤں کے اس مقام تک پہنچ جائیں۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔

عام تعلیم کے علاوہ فنی اور صنعتی تعلیم کے دروازے جس طرح ہر شخص کے لیے کھولے گئے اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات نے فوراً نتائج پیدا کرنے شروع کیے۔ انقلاب کے پانچ چھ سال بعد یعنی ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ ٹیکنیکل اور فنی اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ میں سے دس فی صد ایسے تھے جو مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں بھی اس قسم کے تعلیمی اداروں میں مزدور طبقہ کے طلبہ کا تناسب تقریباً اسی قدر ہے۔ مگر دس سال کے مختصر عرصے میں روسی تصویر بدل گئی۔ ۱۹۳۳ء میں روس کے اعلیٰ ٹیکنیکل اور فنی اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ میں ستر فیصد

ایسے تھے جو مزدور اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ملکی اقتدار کی باگ ڈور تقریباً پورے طور پر مزدور کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔

روسی تعلیم کا یہ کارنامہ حالیہ تاریخ کے نوادرات میں سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نظام تعلیم نے ناخواندگی کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ انقلاب کے بعد ملک میں خواندگی کا تناسب چالیس فی صد سے کم تھا۔ اب یہ تناسب نوے فی صد سے اوپر ہے۔ خواندگی کو عام کرنے کا کام جس قدر دشوار تھا اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ روس میں کوئی ایک سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ روسی حکومت ان میں سے کوئی نوے زبانوں میں درسی کتابیں شائع کرتی ہے۔ تاکہ ہر علاقے کے لوگوں کو مقامی زبان میں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ جن علاقوں کی زبان روسی نہیں وہاں یہ زبان ایک غیر ملکی زبان کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔

روسی نظام تعلیم

جس نظام تعلیم نے یہ حیرت انگیز نتائج پیدا کیے ہیں اس کی ساخت نیچے بیان کی جاتی ہے:۔

(۱) کنڈرگارٹن یا دوسرے تعلیمی ادارے جو بچوں کو ابتدائی مدرسے سے پہلے تعلیم دیتے ہیں ان مدرسوں میں بچے تین سال سے لے کر سات سال کی عمر تک رہتے ہیں۔ ان مدرسوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے کر ماؤں کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ آزادی سے اپنے کام کاج میں لگی رہیں۔ شہروں میں کوئی بچھتر فی صد بچے کنڈرگارٹن مدرسوں میں جاتے ہیں۔

(۲) ابتدائی مدرسے:۔ اس مدرسے کا نصاب چار سالہ ہے۔ یہ بچوں کو آٹھ سال سے بارہ سال کی عمر تک تعلیم دیتا ہے۔ ابتدائی تعلیم ۱۹۳۰ء میں لازمی قرار دی گئی تھی۔ ابتدائی تعلیم نہ صرف مفت ہے بلکہ بہت سے طلبہ کو حکومت کی طرف سے وظیفے ملتے ہیں۔ ان وظیفوں کی غرض یہ ہے کہ قابل مگر غریب طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ ان کے خداداد جوہر والدین کے افلاس کے باعث دب کر نہ رہ جائیں۔

ابتدائی مدرسے کے نصاب میں ذیل کے مضامین شامل ہیں:۔

(۱) مقامی زبان (۲) حساب (۳) مطالعہ قدرت (۴) تاریخ (۵) جغرافیہ (۶) خطاطی (۷) دستکاری (۸) گانا

(۲) چھٹا شک۔ ہفتے میں کل ۴۰ پیریڈ پڑھائی ہوتی ہے۔ ہر پیریڈ پینتالیس منٹ کا ہوتا ہے۔ تاہم تعلیمی سال کی لمبائی دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ چھٹیاں نسبتاً کم ہوتی ہیں۔ تعلیمی سال کی لمبائی تقریباً ۲۳۰ دن کو پہنچتی ہے۔

(۳) ثانوی مدرسہ:۔ اس مدرسے کا نصاب چھ سال ہے۔ یہ طلبہ کو بارہ سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم دیتا ہے۔ ابتدائی مدرسے کے نصاب کو جاری رکھنے کے علاوہ ثانوی نصاب میں ذیل کے مضامین کا اضافہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) ریاضی بعہ ٹرگنومیٹری (۲) نرکس (۳) کیمسٹری (۴) جیالوجی (۵) فزیالوجی (۶) معاشرتی علوم (۷) غیر ملکی زبانیں (۸) فوجی علوم۔

امریکہ اور برطانیہ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے روس نے بھی اب ثانوی تعلیم مفت اور لازمی کر دی ہے ابتدائی مدرسے کی طرح ثانوی مدرسے میں بھی سرکاری وظیفے کثرت سے دیے جاتے ہیں۔ ثانوی نصاب میں سائنس پہ جو زور دیا جاتا ہے اس میں روس اب دنیا کے تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ پیچھے یہ ذکر آ چکا ہے کہ انقلاب کے بعد پہلی دہائی میں روسی تعلیم کے معیار بے حد پست تھے۔ جدید سائنسی علم کے معاملے میں معیاروں کی پستی خاص طور پر نمایاں تھی۔ پچھلے تیس برس میں تعلیمی معیار کو لگاتار بلند کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سائنس اور انجینئرنگ کے میدانوں میں آج روس تمام ملکوں سے آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

(۴) ثانوی مدرسے سے فارغ ہو کر جو شخص معلم بننا چاہے اسے دو سال تک تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ استادوں کے لیے اس سے بلند تعلیم کے ادارے بھی موجود ہیں۔ جو طلبہ ثانوی تعلیم کے بعد کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیں ان کے لیے ٹیکنیکل سکول موجود ہیں۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یونیورسٹیاں موجود ہیں۔

(۵) تعلیم کی اس شاہراہ کے علاوہ اور کئی مخصوص قسم کے تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ مثلاً معذور بچوں کو تعلیم دینے والے ادارے۔ ملازمت کرنے والے نوجوانوں کے لیے شبینہ مدرسے قائم ہیں۔ جہاں وہ فارغ اوقات میں مزید ٹیکنیکل اور فنی تربیت حاصل کر کے اپنے پیشے میں ترقی حاصل کر لیتے ہیں۔ بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھلانے کے لیے بھی تعلیمی مرکز قائم ہیں۔

لیکن جہاں سائنسی اور ٹیکنیکل میدانوں میں ہر شخص اپنی استعداد۔ قابلیت اور محنت سے بلندی کے تمام مدارج طے کر سکتے ہیں وہاں کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں میں شامل ہونے کے لیے خاص کڑی آزمائشوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ روسی نظام تعلیم کی بنیادیں اشتراکی فلسفے پر رکھی گئی تھی۔ مدرسوں اور کالجوں کے ذمے پہلے دن سے یہ خدمت لگائی گئی تھی کہ وہ رہنماؤں اور کارکنوں کو اشتراکی قدریں عطا کریں۔ ان کے ذمے سہ گانہ فرائض عاید کیے گئے تھے ؛

(۱) فنی اور پیشہ ورانہ مہارتوں کی تربیت دینا۔

(۲) اشتراکیت کی سیاسی اور معاشرتی قدروں کو ذہنوں میں راسخ کرنا۔

(۳) مذہبی توہم پرستی کے خلاف مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔

اشتراکی فلسفہ زندگی کو نظام تعلیم کا مرکزی نقطہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ روسی نوجوان اشتراکیت کو زندگی کا بہترین حل سمجھنے لگے ہیں۔ انھیں بیرونی دنیا کے متعلق جو کچھ بتایا جاتا ہے خالص اشتراکی نقطہ نگاہ سے بتایا جاتا ہے۔ بیرونی دنیا کے متعلق کسی آزاد اور بے لاگ ذریعے سے معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے روسی نظام تعلیم اپنے ہر شہری کی نگاہ کو گہرا اشتراکی رنگ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس نظام میں سے گذرنے والا شخص خواہ سائنس دان ہو یا انجینیر اور یا کسی خاص فن کا ماہر وہ ہر بات سے پہلے ایک کمیونسٹ ہوگا۔

ان ساری احتیاطوں کے باوجود کمیونسٹ پارٹی میں بھرتی کے لیے بڑی چھان بین سے کام لیا جاتا ہے کمیونسٹ پارٹی ملک کی حکمران جماعت ہے۔ سیاسی زندگی کی ساری باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس جماعت میں بھرتی ہونے والے لوگوں کو خاص طور پر تربیت دینے کے لیے علیحدہ ادارے قائم ہیں۔ جو نوجوان ثانوی تعلیم کے زمانے میں قائدانہ صلاحیت کا نمایاں ثبوت دیں انھیں ان اداروں میں بھیجا جاتا ہے۔ کمیونسٹ رہنماؤں کی تربیت کے لیے انٹرمیڈیٹ اور اعلیٰ ادارے قائم ہیں۔

طریق آزمائش و سہو

اپنے نظام تعلیم کو موجودہ تشکیل دینے اور اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کے لیے روسی رہنماؤں نے لگاتار آزمائش و سہو کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں کے وضع کردہ طریقے آزما کر دیکھے ہیں

اور جہاں کہیں ان کے نتائج کو تسلی بخش نہیں پایا ان طریقوں کو فوراً خیر باد کہہ دیا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا:۔

"جن طریقوں کے عملی نتائج آزما کر دیکھ لیے گئے ہوں ان کو وسیع پیمانے پر رائج کرنا کسی طرح پسندیدہ نہیں۔ نام نہاد منصوبی طریقے کا بھی یہی حال ہے۔ مدرسوں نے کوشش یہ کی کہ اپنا سارا کام منصوبی طریقے پر مرتب کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسے تقریباً تباہ ہو گئے"

ایک سال بعد اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا۔ اکثر مدرسوں کی نصابی سرگرمیاں بالکل ناکافی ہیں ان کے پڑھانے کے طریقے غیر صحت مند ہیں۔ ان کا ضبط ڈھیلا ہے بعض حالتوں میں نظم و ضبط نام کو نہیں یہ تباہی ڈالٹن پلان کی اجتماعی صورت نے مچا رکھی ہے۔ اس طریقے کو اپنانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ذاتی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے۔ استاد کا کام برائے نام رہ گیا ہے۔ طلبہ کا انفرادی محاسبہ اٹھ گیا ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ از سر نو جماعتی پڑھائی شروع کر دی جائے۔ طلبہ کے ایک خاص گروہ کو باقاعدہ اسباق پڑھائے جانے چاہئیں دوران سال طلبہ کے امتحان ہونے چاہئیں۔ اور سال کے خاتمہ پر سارے نصاب میں سے امتحان ہونا چاہیے"

۱۹۳۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک اور حکم نامہ جاری کیا جس کی رو سے مدرسوں میں معیاری درسی کتابوں کا استعمال لازمی ہو گیا۔ نوجوان طلبہ کی سرگرمیوں پر ۱۹۲۶ء میں پابندی لگ چکی تھی ۱۹۳۵ء کے حکم نامے کی رو سے انھیں مدرسے کے کام میں دخل دینے سے کلی طور پر روک دیا گیا۔ زمانہ قدیم اور ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کو نصاب مدرسہ سے نکال دیا گیا تھا، اسے دوبارہ داخل نصاب کیا گیا۔ تاریخ کی درسی کتابیں واقعات کی سن وار ترتیب کے لحاظ سے تیار کی گئیں۔ استادوں کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ تاریخ پڑھاتے وقت واقعات کی سن وار ترتیب کا پورا لحاظ رکھیں۔ اس سے پہلے استاد محض تاریخی واقعات کے معاشرتی خلاصے بیان کر دینے پر اکتفا کرتے تھے۔

۱۹۳۵ء کے حکم نامے کی رو سے بچوں کی نفسیات کے نام نہاد ماہرین کا اقتدار بھی ختم ہو گیا ان لوگوں نے استادوں کے اختیارات کو ختم کر رکھا تھا۔ نام نہاد نفسیاتی نظریوں کی بنا پر وہ بچوں کی گروہ بندی کرتے اور ان کے لیے تدریسی مضامین کا فیصلہ کرتے۔ یہ فیصلہ بسا اوقات استاد کی رائے کے خلاف ہوتا۔

ء عرصہ تک یہ کھیل اسی طرح چلتا رہا لیکن اس کے نتائج رجعت پسندانہ ثابت ہونے لگے۔ کیمونسٹ پارٹی
مرکزی کونسل نے اس صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ دیا کہ بچوں کی نفسیات کے نام نہاد ماہروں نے
اسوچے سمجھے ان غیر ملکی رجعت پسندانہ نظریوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا جن کا ماحصل یہ تھا کہ بچے
لی ذہانت کا انحصار کلی طور پر وراثت پر ہے اور ماحول اس بارے میں چنداں اہم نہیں۔ انہوں نے اشتراکی
تعلیم کے عنصر کو بالکل نظرانداز کردیا۔ حالاں کہ اس عنصر کی تاثیر دن بدن بڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے طلبہ کی ذہانت
اور استعداد کو ناپنے کے لیے مشینی قسم کی آزمائشوں سے کام لیا اور اس طرح غیر سائنسی اخذ کرکے ان نتائج کو تعلیم
تربیت کی بنا بنایا۔ ان حالات میں ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ نام نہاد بچوں کی نفسیات کو مدرسوں سے خارج کر دیا جائے
اور تعلیمی معاملات میں صرف علم التعلیم اور ماہرین تعلیم کی رہ نمائی قبول کی جائے۔"

خاتمۂ کلام

روسی نظام تعلیم جس کا ایک عام خاکہ اوپر دیا گیا ہے انقلاب کے فوراً بعد وجود میں نہیں آیا۔
اس کی بنیاد انقلابی دور میں رکھی گئی ہے۔ جب زندگی کا سارا ڈھانچہ بری طرح تہ و بالا ہو رہا تھا۔ تاہم
انقلابی رہ نماؤں کے دل ایک بے پناہ جذبے سے ابل رہے تھے۔ اس جذبے نے رفتہ رفتہ عملی شکل
اختیار کرنا شروع کی۔ انقلابی جوش کی تیزی میں کئی ایک غلط قدم بھی اٹھائے گئے۔ تعمیری کام کی رفتار تیز کرنے
کے لیے نہ صرف آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے کا گلا مکمل طور پر گھونٹ دیا گیا۔ بلکہ بعض غیر ملکی طریقہ ہائے
تدریس اور نفسیاتی نظریوں کو وسیع پیمانے پر رائج کر دیا گیا۔ ترقی پسندوں کی دھن میں نوجوان طلبہ کو انتظامی
امور میں بے جا دخل اندازی کی اجازت دی گئی۔ نصاب تعلیم کو مضحکہ خیز حد تک ہلکا کر دیا گیا۔ درسی کتابوں کا
تقریباً خاتمہ ہو گیا امتحانات سرے سے اڑ گئے۔ مدرسوں میں نظم و ضبط ختم ہو گیا اور تعلیمی معیار حد درجہ گر گئے
یہ سب کچھ ہوا۔ مگر روسی رہ نماؤں نے محاسبۂ نفس سے کام لے کر ان تمام نقائص کی رفتہ رفتہ اصلاح
کی۔ انھوں نے ایک سابق اول کی جرات سے کام لے کر آزمائش و سہو کا راستہ اختیار کیا۔ مگر اپنے کسی اقدام کے
نتائج کو نظر انداز نہیں کیا۔ ہر طریق کار اور ہر تعلیمی تجربے کے نتائج کو اچھی طرح تولا گیا اور جہاں یہ
نتائج تسلی بخش ثابت ہوئے سابقہ فیصلے کی غلطی فوراً مان لی گئی اور اس کی تلافی کر دی گئی۔ اس صورت کا

نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے روسی نظامِ تعلیم کا رجحان دوبارہ انہی طریقہ ہائے کار کی طرف ہو گیا جنہیں فرسودہ اور "علمی" کہہ کر ٹھکرا دیا گیا تھا۔

اس تجرباتی طریقِ کار نے روس کو اس کا موجودہ نظامِ تعلیم دیا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کی کامیابی کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس نے صرف ایک چوتھائی صدی میں روسی قوم کو علم و سائنس کی اس بلندی پر پہنچا دیا جس پر دوسری قومیں صدیوں کی جدوجہد کے بعد پہنچ سکی ہیں۔

چاند کی سیر

مسلسل نمبر ۱۲

شاہ اشرف

انسان کو چاند سے کیا ملے گا؟

چاند کا جو نقشہ اب تک کھینچا جا چکا ہے وہ چنداں دل کش نہیں. پھر انسان اس پر پہنچنے کے درپے کیوں ہے؛ اسے اس ساری کاوش سے کیا ملے گا!

یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان چاند پر پہنچنے کے قابل ہو گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنا تحقیقی مرکز قائم کر سکے گا. ممکن ہے کہ چاند میں بیش قیمت معدنیات بھی ہوں. مگر انھیں نکالنا اور زمین تک پہنچانا عملی امکان کی حد سے باہر ہے. مگر انسان چاند سے اور خدمات لے سکتا ہے. اس وقت کسی ٹیلی ویژن اسٹیشن سے جو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں وہ کوئی ڈیڑھ سو میل کے نصف قطر سے آگے نہیں جا سکتے. چاند پر ٹیلی وژن کا سٹیشن قائم کرنے سے یہ پروگرام ساری دنیا میں نشر کیے جا سکیں گے. یہی حال دوسری نشریات کا ہے. اس کے علاوہ چاند پہ بیٹھ کر زمین کے موسمی حالات کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکیں گی ان کی مدد سے موسم کے متعلق بہتر پیش گوئی ہو سکے گی. صرف یہی نہیں بلکہ چاند فضائے بسیط میں سفر کرنے کے لیے ایک اہم اڈے کا کام دے گا. اس اڈے کی بدولت انسان کو فضائے بسیط کے متعلق ایسی قیمتی معلومات ہاتھ لگ سکتی ہیں جن کی قیمت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں. غرض چاند پر قدم جما لینے سے انسان کو بے شمار فوائد کی توقع ہے.

چاند پر تحقیقی مرکز قائم ہو جانے سے سائنس دان اس قابل ہو جائیں گے کہ نظام کائنات کے رازوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں. اس وقت ستاروں اور سیاروں کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس کی بنیاد روشنی اور ریڈیائی قوت کی ان لہروں پر ہے جو ان سے نکل کر ہم تک پہنچتی ہے. مگر یہ لہریں کرۂ ہوائی میں چھن کر آتی ہیں. چاند میں کرۂ ہوائی کا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوگا. اور سائنس دان کائنات پر زیادہ گہری نگاہ ڈال سکیں گے. چاند کا تحقیقی مرکز سورج کی روشنی اور اس کی ماہیت کے متعلق نئے حقائق پر روشنی ڈال سکتا ہے.

خود چاند کی سطح کے مشاہدے سے نظام شمسی اور نظام کائنات کی ماہیت پر کارآمد روشنی پڑ سکتی ہے۔ چاند پر اڈہ قائم ہو جانے کے بعد مشینی دماغوں کو مریخ اور دوسرے قریبی سیاروں پر بھیجا جا سکتا ہے۔ اور یوں ان سیاروں کی دنیا کے متعلق زیادہ یقینی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ غرض چاند فضائے بسیط میں سفر کرنے والوں کے لیے ایک جنکشن اسٹیشن کا کام دے سکتا ہے۔

چاند کی دنیا کا منظر

فرض کیجیے آپ طیارے میں بیٹھ کر چاند میں اترنے والے ہیں۔ نیچے جھانکتے ہوئے آپ کی نگاہ کس قسم کی دنیا پر پڑے گی۔ یقیناً آپ کا پہلا تاثر حد درجہ کی وحشت کا ہو گا۔ پہاڑ لنڈورے اور بھیانک نظر آئیں گے۔ میدان کٹے پھٹے اور بنجر دکھائی دیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کالے سایے پیدا کر رہی ہوں گی۔ جب جہاز چاند کی سطح پر اتر آئے گا تو آپ کو اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیزیں نظر آئیں گی۔ اگرچہ سورج بے پناہ تیزی سے چمک رہا ہے۔ مگر آپ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اسے بالکل سیاہ پاتے ہیں۔ زمین کے نیلے آسمان کی جگہ آپ کو سر پر ہر طرف گھپ اندھیرے کی سیاہ چادر تنی دکھائی دیتی ہے۔ اس سیاہ چادر میں جگہ جگہ روشن اور مدھم ستاروں کے موتی ٹکے ہیں۔ دن کے پورے اجالے میں ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ وجہ یہ کہ چاند کے گرد کرۂ ہوائی موجود نہیں۔ ہمیں آسمان اس لیے نیلگوں نظر آتا ہے کہ سورج سے روشنی کی جو لہریں آتی ہیں ان میں نیلی روشنی کی لہریں باقی لہروں کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہیں کرۂ ہوائی کے اوپر کے طبقے میں گیس کے لطیف ذرات اور خاکی ذرات ان کی لہروں کو بکھیر دیتے ہیں۔ اس طرح زمین پر نیلے رنگ کی ایک چھتری تن جاتی ہے۔ چاند پر کرۂ ہوائی ناپید ہے۔ اس لیے یہ نیلے رنگ کی چھتری بھی مفقود ہے۔ اور آسمان بالکل سیاہ دکھائی دیتا ہے۔ زمین پر ہمیں دن کے وقت ستارے بھی اسی وجہ سے نظر نہیں آتے کہ سورج کی روشنی ہوائی ذروں میں بکھر کر آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک ناقابل عبور پردہ لٹکا دیتی ہے۔ چاند پر اس چیز کا بھی وجود نہیں۔ اس لیے سورج نکلنے کے بعد بھی ستارے بالکل اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح رات کے وقت۔ چاند پر سورج بھی ایک نرالا منظر پیش کرتا ہے

اس کے گرد آتشیں گیسوں نے جو ہالہ باندھ رکھا ہے وہ زمین سے نظر نہیں آتا۔ مگر چاند سے سورج کا یہ آتشیں تاج صاف دکھائی دیتا ہے۔

چاند کی دنیا سے جب آپ آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو سب سے عجیب چیز وہ بے تحاشہ بڑا چاند ہے جو زمین کے چاند سے سولہ گنا بڑا ہے اور جس کی چمک زمینی چاند سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ عظیم الشان چاند ہماری زمین ہے جسے چھوڑ کر آپ چاند پر پہنچے ہیں۔ اس چاند کی چمک اس لیے زیادہ ہے کہ زمین کو عموماً بادل لپیٹ میں لیے رکھتے ہیں اور چاند کی جھلسی ہوئی چٹانوں کے مقابلے میں بادل سورج کی روشنی کو بہت بہتر طور پر منعکس کرتے ہیں۔ لیکن اس چاند کی رنگت سفید کی بجائے نیلی ہوگی اور اس کے کناروں کا رنگ گہرا نیلا ہوگا۔ زمین اس لیے نیلی نظر آئے گی کہ اس کے گرد کرۂ ہوائی نے نیلے رنگ کی چادر لپیٹ رکھی ہے۔

زمین کے براعظموں کی حدیں دکھائی نہیں دیں گی۔ کیوں کہ کرۂ ہوائی اور بادلوں نے اس کے چاروں طرف پردہ تان رکھا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور سرسبز میدان سبزی مائل رنگ کے دھبے نظر آئیں۔ اس صورت میں صحرا اور بنجر علاقے زرد رنگ کے دھبے نظر آئیں گے اور سمندر گہرے نیلے رنگ کے دھبے بن جائیں گے۔

جس طرح ہم زمین پر چاند کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں وہ کبھی ماہ نو ہوتا ہے اور کبھی بدر۔ بالکل اسی طرح چاند سے زمین کی مختلف شکلیں نظر آئیں گی۔ لیکن زمین کی یہ اشکال چاند کی اشکال کے بالکل الٹ ہوں گی۔ یعنی ماہ نو کے دن زمین بدر کی شکل میں نظر آئے گی۔ جس طرح چاند ہماری اندھیری راتوں کو روشن کرتا ہے، بالکل اسی طرح زمین چاند کی دو ہفتے لمبی رات کو روشنی عطا کرتی دکھائی دے گی لیکن یہ روشنی چاند کے مقابلے میں تیز تر ہوگی۔ کیوں کہ زمین چاند سے کئی گنا بڑی ہے۔

زمین سے جب آپ چلے تھے تو مخصوص قسم کے حفاظتی لباس اور آکسیجن کے ڈبوں نے آپ کا وزن ۳۰۰ پونڈ یعنی کوئی ساڑھے تین من بنا رکھا تھا۔ آپ اس قدر بھاری بھرکم ہو گئے تھے کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کرۂ ہوائی کو پچھاڑ لینے کے بعد آپ اپنے آپ کو ایک تنکے کی طرح ہلکا محسوس کرنے لگے تھے اب آپ چاند پر قدم رکھتے ہیں تو اس کی کشش ثقل دوبارہ بوجھ پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بوجھ زمین کے

[redacted]

مقابلے میں صرف چھٹا حصہ ہے آپ کا وزن ۲۰۰ پونڈ کی بجائے صرف پچاس پونڈ رہ گیا ہے۔
وزن کے چھ گنا کم ہو جانے سے آپ زمین کی نسبت کئی گنا اونچی چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ اگر آپ زمین پر چھ فٹ اونچی چھلانگ لگا سکتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ اپنے جسم کے مرکز ثقل کو تین فٹ کی بلندی تک لے جا سکتے تھے۔ چاند پر پہنچ کر آپ ۳ + ۶ × ۳ یعنی ۲۱ فٹ اونچی چھلانگ لگا سکیں گے ۲۱ فٹ بلندی سے نیچے گرنے پر آپ کو صرف اسی قدر جھٹکا محسوس ہو گا جس قدر زمین پر چھ فٹ بلندی سے گرنے پر محسوس ہوتا تھا۔

چاند پر آپ کو ناقابل یقین حد تک شدید موسم کا سامنا کرنا ہو گا۔ دو ہفتے لمبے دن میں گرمی اتنی تیز ہو گی کہ پانی آگ پر رکھے بغیر خود بخود ابلنے لگے۔ اس کے بعد دو ہفتے لمبی رات شروع ہو جائے گی۔ اب خنکی اس حد تک بڑھ جائے گی کہ الکحل بھی منجمد ہو جائے۔

اس وحشت ناک اور صبر آزما دنیا میں آپ کتنے تک قیام کرنا پسند کریں گے ؟ بے شک اس دنیا کے بہت سے مناظر بہت عجیب و غریب ہوں گے۔ مگر اس کے مقابلے میں چاند کی دنیا کی ناقابل برداشت سختیاں ہیں۔ ان مشکلات کے جواب سائنس تلاش کر رہی ہے۔ اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب سائنس اس تلاش میں کامیاب ہو جائے گی۔

چاند تک سفر کرنا ممکن ہو جانے کے بعد صرف وہی لوگ وہاں جانا پسند کریں گے جو سائنسی تحقیق کے لیے زندگی وقف کر چکے ہوں۔ ۱۸۶۵ء میں جیولز ورن نے اپنے دو ناولوں "زمین سے چاند تک سفر" اور "چاند کے گرد سفر" شائع کر کے افسانہ نویسی کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اس وقت سے عام لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ اگر سائنس اس طرح قدم آگے بڑھاتی رہی تو کسی دن یہ ممکن ہو جائیگا کہ لوگ تفریحاً چاند کی سیر کو جایا کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ شاید چاند بھی امریکہ کی طرح ایک نئی دنیا ثابت ہو جو یورپ کی گوری قوموں کو اپنے حوصلے نکالنے کا نیا میدان پیش کرے۔ سائنس نے چاند کے متعلق جو حقائق معلوم کیے ہیں انہوں نے اس قسم کی امیدوں پر اوس ڈال دی ہے۔ چاند میں سلطنت قائم کرنے یا نوآبادیاں قائم کرنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔

اندلس کی زیرِ زمین بستیاں

ادریس احمد

عربوں کی یادگاریں

ہسپانیہ اور پرتگال کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو عربوں کے زیرِ نگیں نہ رہا ہو۔ اس لیے اس جزیرہ نما میں عربوں کی یادگاریں آج تک جگہ جگہ بکھری نظر آتی ہیں۔ عربوں کی حکمرانی کا کل زمانہ کوئی آٹھ سو سال ہے مگر آخری زمانے میں ان کے پاس ہسپانیہ کا صرف جنوبی حصہ یعنی اندلس کا صوبہ رہ گیا تھا جس میں غرناطہ کا خوبصورت شہر واقع تھا۔ عیسائیت کی متحدہ قوت نے ملک کے وسیع و عریض شمالی اور مغربی حصے مسلمانوں سے خالی کرا لیے تھے اور عربوں کی تمام عظمت سمٹ سمٹا کر اندلس میں جمع ہو گئی تھی۔ وہ اس دروازے سے ملک میں داخل ہوئے تھے۔ اور اب آٹھ سو سال گذر جانے پر اسی کی طرف دھکیل دیے گئے تھے۔ اندلس ان کی آخری پناہ گاہ تھا۔ وہ کوئی ڈیڑھ سو دو سو سال تک یہاں پاؤں جمائے عیسائیت کا مقابلہ کرتے رہے لیکن یہاں یورپ کی متحدہ قوت انھیں کچلنے کے درپے تھی وہاں مسلمان ملکوں کو ان کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ ان کی بقا و فنا میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ اس بے چارگی کی حالت میں بھی وہ مدتوں دشمن کا مقابلہ مردانگی سے کرتے رہے۔ لیکن پندرہویں صدی میں جب فرڈی نینڈ اور اشبیلہ کی شادی نے ہسپانیہ کی دو طاقتور عیسائی طاقتوں کو ایک ہی تاج کے تحت متحد کر دیا تو غرناطہ کے لیے اس قوت کے سامنے زیادہ دیر تک ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ فرڈی نینڈ عیسائیت کو دوبارہ فروغ دینے کے لیے بے تاب تھا، اسکی سرکردگی میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسا خوفناک سیلاب امڈ پڑا جو انھیں تنکوں کی طرح بہا لے گیا۔ عربی عظمت کی آخری یادگار غرناطہ عیسائیوں کے ہاتھ آئی لیکن فاتحین نے صرف اس پر بس نہ کی۔ انھوں نے ہسپانیہ سے اسلام کا نام و نشان مٹا دینے کی ٹھان لی۔ مسلمانوں کو سرکاری طور پر بتا دیا گیا کہ ہسپانیہ میں رہنا چاہتے ہو تو عیسائی بن کر رہو ورنہ اس ملک کو چھوڑ جاؤ۔ لاکھوں نے دیس نکالا قبول کیا مگر جن بے ہمتوں نے دنیا دی

آسائش کو ضمیر کی آواز پر ترجیح دی ان کی تعداد بھی لاکھوں کو پہنچتی تھی۔

آج ہسپانیہ میں اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں لیکن دیکھنے والی آنکھ کو عربوں کی یادگاریں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ شہروں، بستیوں، پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں اور میدانوں کے عربی نام آج تک چلے آتے ہیں۔ ملکی زبان اور مقامی بولیوں میں عربی الفاظ آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ مروجہ روایات اور طور طریقوں میں عربی اثر موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آبادی میں عربی خون کی خوبو صاف نظر آتی ہے۔ صرف ہسپانیہ میں ہی نہیں بلکہ یہ خوبو سات سمندر پار ان ملکوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں ہسپانوی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ ارجنٹائن اور جنوبی امریکہ کے دوسرے ملکوں بھی یہ چیز بالکل اسی طرح عیاں ہے جس طرح ہسپانیہ اور پرتگال میں۔

الحمرا اور اس کے نواح

اندلس میں عربوں کی اہم ترین یادگار الحمرا کا محل ہے جو غرناطہ کے ایام عظمت کی کہانی زبان حال سے بیان کرتا ہے۔ عربوں کے آخری زمانے میں اندلس کا دارالسلطنت تھا۔ یہ شہر ایک شاداب وادی میں واقع ہے الحمرا کا محل سرخ پتھر کا بنا ہے اور عرب فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ تاریخ کی اس داستان عبرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے آتے ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں میں ذرائع حمل و نقل میں جو بے اندازہ سہولت پیدا ہوئی ہے اس کی بدولت الحمرا کے زائرین کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ سارا سال زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے اس صورت حال کا اثر جنوبی ہسپانیہ کی معاشی حالت پر بھی پڑا ہے۔ ملک کا یہ حصہ اپنے افلاس کے لیے ضرب المثل ہوا کرتا تھا مگر اب سیاحوں کی بدولت عوام کے لیے نفع بخش کاروبار کے کئی دروازے کھل گئے ہیں۔

جو سیاح الحمرا کو دیکھنے آتے ہیں وہ یہاں سے فارغ ہو کر قرب و جوار کی زیر زمین بستیوں کو بھی ضرور دیکھتے ہیں۔ جنوبی ہسپانیہ میں کئی ایک پوری کی پوری بستیاں زمین کے نیچے بستی ہیں۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کی اکثر چٹانیں چونے اور نرم پتھر کی ہیں۔ ان چٹانوں کو کاٹ کر غاریں تیار کرنا بہت آسان ہے۔ نیز یہاں بہت سی قدرتی غاریں بھی موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری کی پوری بستیاں غاروں میں آباد ہو گئی ہیں۔

آسوزش

غار میں رہائش اختیار کرنے کی ایک وجہ خرچ کی کفایت ہے۔ مکان تعمیر کرنے کے مقابلے غار تیار کرنے پر بہت کم خرچ آتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جب کہ سامان تعمیر کی قیمتیں دنیا میں ہر جگہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک معمولی سی غار صرف ستر روپے کے صرف سے تیار ہو سکتی ہے۔ ایک بڑا اور کشادہ غار ایک ہزار روپے میں تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں تعمیر کے لیے نہ اینٹوں کی ضرورت ہے نہ لکڑی کی اور نہ لوہے اور فولاد کی۔ یہاں ضرورت صرف پتھر کاٹنے والے اوزاروں اور انسانی محنت کی ہے معمولی قسم کی غاریں صرف دو ایک کمروں پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن عمدہ قسم کی غاریں کئی فراخ کمروں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان میں وہ تمام سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں جو جدید قسم کے مکان میں ہونی چاہئیں۔

الحمرا سے چند فرلانگ آگے کسی سمت میں نکل جائیے۔ سنگلاخ چٹانوں کے پہلو میں سفیدی کے مستطیل دھبوں کی لمبی قطاریں ملیں گی یہ غاروں کے دروازے ہیں جن کے ارد گرد سفیدی کی گئی ہے۔ اکثر دروازوں پر صرف ایک ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ چٹانوں کے اوپر گنبد نما دودکشوں کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں ان کی راہ سے باورچی خانے کا دھواں اور کثیف ہوا باہر خارج ہوتے رہتے ہیں اور یوں غار میں تازہ ہوا کا آنا جانا جاری رہتا ہے۔

غاروں میں رہائش کا سبب محض افلاس نہیں بلکہ اس میں موسم کی شدت کو بھی دخل ہے۔ ہسپانیہ کا جنوبی حصہ گرمی اور سردی دونوں کی شدت کے لیے مشہور ہے۔ گرمیوں میں یہاں اس بلا کی دھوپ پڑتی ہے کہ چٹانیں جلنے لگتی ہیں۔ سردیوں میں بلا کا جاڑا پڑتا ہے اور ہڈیوں تک پہنچنے والی برفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ غاریں اپنے مکینوں کو گرمی اور سردی دونوں کی شدت سے بچائے رکھتی ہیں۔ جب باہر جھلس دینے والی لو چل رہی ہو، غار کے اندر آرام دہ خنکی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح باہر برفانی ہوائیں چل رہی ہوتی ہیں غار کے اندر ان کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ موسم کی شدت سے بچانے کے علاوہ غاریں چوری چکاری کے خطرے کو بھی دور کر دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غاروں میں نہ صرف غریب لوگ ہی رہائش اختیار کرتے ہیں بلکہ امرا بھی بڑے شوق سے غاریں تیار کراتے ہیں۔ کشادہ غاروں کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے ان میں جگہ جگہ محرابیں تیار کی جاتی ہیں اور ان کے فرشوں اور دیواروں پر بالکل اسی طرح پلستر کیا جاتا ہے جس طرح جدید مکانوں میں کیا

ہندی الاصل خانہ بدوش

اندلس کی غاروں میں بسنے والے بیشتر لوگ سیاہ آنکھیں اور سیاہ بال رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ لوگ خانہ بدوش تھے مگر اب غاروں میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ یہ لوگ کوئی پانچ سو برس گزرے شمالی افریقہ کی راہ سے ہسپانیہ میں داخل ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں اس میں کلام نہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ مصر سے آئے تھے۔ لیکن وہ اپنا اصل وطن ہندوستان بتاتے تھے ہندوستان سے گھومتے پھرتے وہ مصر میں آ نکلے اور یہاں سے آگے بڑھتے بڑھتے ہسپانیہ میں آ کر آباد ہو گئے۔

جس زمانے میں یہ خانہ بدوش لوگ ہسپانیہ میں داخل ہوئے اس وقت عربوں کے اقتدار کا سورج ڈھل چکا تھا اور وہ سمٹ سمٹا کر جنوبی ہسپانیہ میں آ چکے تھے۔ نو وارد خانہ بدوشوں کو بھی اس جگہ پناہ مل گئی شمال کی عیسائی ریاستیں ان ایشیائی خانہ بدوشوں کو منہ لگانے کے لیے تیار نہ تھیں۔ چنانچہ وہ وادیٔ غرناطہ میں ہی ٹک گئے اور آج تک وہاں آباد ہیں۔

تاہم یہ خیال نہ کر لینا چاہیے کہ غاروں کی تمام آبادی ان مشرقی نژاد خانہ بدوشوں پر مشتمل ہے جنوبی ہسپانیہ میں غاروں میں رہنے کا رواج عام ہے اور پورے کے پورے گاؤں اور قصبے غاروں میں زمین کے نیچے بستے ہیں۔ بعض قصبوں کی آبادی ہزاروں کو پہنچتی ہے۔ یہاں نہ صرف مکان زمین کے نیچے ہیں، بلکہ مدرسے گرجے ہسپتال اور دوسری سرکاری عمارتیں بھی زمین کے نیچے تعمیر کی گئی ہیں۔ گرجوں کے گنبد اور کلس البتہ زمین سے اوپر دکھائی دیتے ہیں۔

مصر سے آنے والے خانہ بدوش مدت سے بستیوں میں آباد چلے آتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف قسم کی دستکاریوں میں خوب ماہر ہیں۔ لوہے سے طرح طرح کی چیزیں بنانا اور دھات کے برتن تیار کرنا ان کے خاص پیشے ہیں۔ وہ آج تک اپنے اس کارنامے کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ جب فرڈی نینڈ نے غرناطہ پر حملہ کر کے شہر کو محاصرے میں لیا تھا تو انہوں نے ہی اس کی توپوں کے لیے گولے تیار کیے تھے۔ اپنا یہ کارنامہ بیان کرتے وقت وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ چیز ان کی محسن کشی اور احسان فراموشی کی دلیل ہے

ان لوگوں کے درمیان ایک اور روایت بھی مشہور ہے وہ یہ کہ مسیح کو صلیب پر لٹکانے کے لیے لوہے کے کیل انہوں نے تیار کیے تھے۔ اور یہ اس بات کی سزا تھی کہ صدیوں تک خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

دف اور گٹار کے نغمے

مشہور امریکی ادیب ارونگ واشنگٹن کوئی سوا سو سال گذرے الحمرا کو دیکھنے آیا تھا۔ اس عبرت کدہ کو دیکھ کر اس پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کی تصویر اس نے بڑے جاں گداز پیرائے میں کھینچی ہے۔ واشنگٹن جب الحمرا کی چھت پر کھڑا افق کے نظارے میں کھویا ہوا تھا تو اچانک گٹار اور دف کے دھیمے نغموں نے اسکی توجہ کو کھینچ لیا۔ نغموں کی یہ آواز قریب کی زیر زمین بستی سے آرہی تھی۔ الحمرا کے نواح میں یہ نغمے آج بھی اسی طرح سنائی دیتے ہیں۔ سیاحوں کی آمدورفت بڑھ جانے سے رقص و موسیقی کی ان محفلوں کی سرپرستی بڑھ گئی ہے اور اس کی بدولت زیر زمین بستیوں کے کئی گھرانے بڑے امیر بن گئے ہیں۔

اگر آپ کسی شام ایک ایسی کشادہ غار میں جا نکلیں جہاں رقص و موسیقی کی محفل برپا ہو تو وہاں ایک عجیب قسم کا رومانی منظر دکھائی دے گا۔ یوں محسوس ہوگا جیسے آپ یک دم الف لیلیٰ کی دنیا میں جا نکلے ہیں۔ بجلی کے قمقموں نے غار میں دن کا سماں پیدا کر رکھا ہے۔ دھیمی دھیمی خوشبوؤں نے ہوا میں ایک کیف آور لطافت پیدا کر رکھی ہے مشتاق نگاہوں کے جھگمٹے میں ایک سیاہ چشم نوجوان حسینہ محو رقص ہے۔ اس کا لوچدار جسم دف اور گٹار کی رسیلی آواز پر یوں بل کھا رہا ہے جیسے کھجور کا پودا تیز آندھی میں اٹک رہا ہو۔ رقاصہ کی ماں حاضرین کے لیے دورے کا اہتمام کر رہی ہے۔ غار کی دیواروں پر چاروں طرف قسم قسم کے دھات کے برتن آویزاں ہیں۔ برتنوں کو چمکا کر اس حد تک شفاف بنایا گیا ہے کہ وہ بجلی کی تیز روشنی میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔ رقاصہ کا نام غالباً "فرعون کی بیٹی" ہے۔ یہ مصری الاصل حسینہ ان خانہ بدوشوں کی اولاد میں سے ہے جو پانچ سو سال پہلے اندلس میں آکر آباد ہو گئے تھے ٭

مفید معلومات عامہ

پاکستانی زندگی اور ادب میں عورتوں کا مقام

پچھلے دنوں لندن میں شاہی انجمن برائے فنون لطیفہ میں سر جارج برڈوڈ میموریل لیکچر کی جانب سے ایک اجتماع ہوا جس میں پاکستان ہائی کمشنر کی اہلیہ بیگم اکرام اللہ نے تقریر کی۔ میموریل لیکچر لندن کا ایک ادارہ ہے جو پاکستان و ہندوستان کے آرٹ ادب اور معاشرہ کی ترقی و ترویج کے لیے وقف ہے۔ بیگم اکرام اللہ پہلی پاکستانی خاتون ہیں جنھیں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا

پاکستان سوسائٹی کے سیکریٹری سر ہربرٹ شوبرٹ کی صدارت میں یہ اجتماع ہوا جس میں وہ ممتاز اشخاص شریک تھے جن کا پاکستان سے قریبی تعلق رہا ہے۔

بیگم اکرام اللہ کا موضوع تھا۔ کہ پاکستان کی زندگی اور ادب میں عورتوں کا مقام"۔ انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ پاکستانی عورتوں کی زندگی میں سکون اور سکباری نے انھیں لکھنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کر دیا حالاں کہ بعض حالات میں رسمی تعلیم کا بھی فقدان تھا۔

شریف بیٹی۔ نثر کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے موصوفہ نے کہا کہ ناول جو اردو ادب میں ذرا دیر سے منظر عام پر آئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بے حد مقبول تھے اور مقبول نثر میں ناول عورتوں نے ہی لکھے تھے ان کا مقصد سماجی برائیوں کی تصویر کشی اور اصلاح تھا۔ مثال کے طور پر محمدی بیگم کا ناول "شریف بیٹی" اصلاحی ناول ہے۔ ان ناولوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلم گھرانوں پر مغربی تہذیب کا کیا اثر پڑا ہے طرز عمل کی تدریج تبدیلی اور اس زمانہ میں انگریزی کی چلن کی والہانہ محبت کا عکس ان ناولوں میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ عام خیال تھا کہ ہمارے دکھوں کا واحد علاج انگریزی رسوم و عادات اختیار کرنے میں پنہاں ہے۔

بیگم اکرام اللہ نے مختصر افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا جس کی طرف مسلم خواتین بعد میں رجوع ہو گئی تھیں یہ افسانہ نگار خواتین یقیناً ترقی پسند ہیں اور انھوں نے مظلوموں اور بیکسوں کی زبوں حالی کا نقشہ

ہو کر ان میں برہمی اور خفگی کے جذبات پیدا کرنے کی سعی کی ہے ۔

بلا طنز:

بیگم اکرام اللہ نے کہا کہ اس میدان میں رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آجکل کے اردو مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عصمت چغتائی ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی تحریر میں ایک کٹیلا طنز ہے۔ دوسرے اردو مصنفین میں صالحہ عابد حسین کا نام بھی شامل ہے ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے۔ ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بیگم اکرام اللہ نے کہا کہ ان کے افسانوں میں شدید حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ ان میں وہ تلخ تک چڑھاپن نہیں ہے۔ جو بعض دوسرے حقیقت نگاروں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ حجاب امتیاز علی ایک فرار پسند ادیبہ ہیں اور ان کی کہانیوں میں رومان کا وافر عنصر پایا جاتا ہے لیکن شگفتگی اور ہلکے مزاح نے ان کو دلچسپ بنا دیا ہے ۔

حقیقت پسندی

بیگم صاحبہ نے جن دوسرے مصنفین کا تذکرہ کیا ان میں آمنہ نازلی۔ قرۃ العین حیدر ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور تسنیم سلیم چھتاری اور ممتاز شیریں بھی شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے متعلق انہوں نے کہا وہ ابھی نوعمر ہیں اور امید ہے کہ وہ برابر لکھتی رہیں گی اور ان کی تحریر میں گہرائی اور پختگی پیدا ہو جائے گی۔ تسنیم سلیم چھتاری کے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ نوعمر افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ ہونہار ہیں۔ شیریں کی کہانیوں میں بڑا جوش اور حقیقت پسندی پائی جاتی ہے ۔

رجحان

آخر میں بیگم اکرام اللہ نے کہا کہ گذشتہ چند سالوں میں پاکستان کی قلم کار خواتین نے بہت کم لکھا ہے لیکن انہوں نے تشویش ظاہر کی کہ اگر سیاسی زندگی میں داخل ہو کر عورتیں ادب سے کنارہ کش ہو گئیں تو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا کیونکہ ادب کی ترویج و ترقی میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس طرف ان کا رجحان بھی ہے۔

ایشیا میں باربرداری کے مسائل

اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید (ایکیفے) کی ریلوے سب کمیٹی کا پانچواں

اجلاس بنکوک میں ہوا۔ اجلاس میں ریلوے کے ذریعہ بار برداری کے خاص مسائل پر غور کیا گیا کیوں کہ براعظم ایشیا کی اقتصادی ترقی میں اس ذریعہ مواصلات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اجلاس ۶ دن جاری رہا۔

ان ملکوں کے نمائندوں نے جو سب کے سب ریلوے نظام کے ماہرین ہیں اجلاس میں شرکت کی۔ پاکستان آسٹریلیا۔ برما۔ چین۔ فرانس۔ بھارت۔ جاپان۔ ملایا۔ نیدرلینڈز۔ فلپین۔ تھائی لینڈ۔ روس۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ اور ویت نام۔ ان کے علاوہ سنگاپور اور برطانوی بورنیو کے نمائندوں نے ایکیفے کے ایسوسی ایٹ ممبروں کی حیثیت سے شرکت کی۔ اٹلی اور وفاقی جمہوریت جرمنی نے اپنے مبصرین بھیجے تھے۔

تھائی لینڈ کے وزیراعظم مسٹر پوٹ سارسن کا تہنیتی پیغام اراکین کو سنایا گیا تھا۔ لینڈ کے وزیر مواصلات مسٹر ایس۔ ڈی ایوتھایا اور ایکیفے کے ایگزیکٹو سکریٹری مسٹر سی وی نرسمہان نے افتتاحی تقریریں کیں۔

تھائی لینڈ کے سرکاری محکمہ ریلوے کے چیف ٹیکنیکل انجینیر مسٹر ایل وی وودھی کول اتفاق رائے سے اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے

مسٹر نرسمہان نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اقوام متحدہ کی فنی امداد کا ادارہ اس علاقے میں ریلوے نظام کی ترقی کے لیے کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے لاہور میں اقوام متحدہ کی طرف سے قائم شدہ ریلوے ٹریننگ سنٹر کا بھی ذکر کیا جو فی الحال اقوام متحدہ کی فنی امداد کے ادارے کے ماتحت ہے لیکن اگلے سال سے پاکستان اس کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوگا۔ تاہم اس کی بین الاقوامی حیثیت قائم رہے گی۔

اجلاس کے صدر مسٹر وودھی کول نے تھائی لینڈ کی ریلوں کے سرکاری نظام کو جدید وضع پر لانے کے پروگرام کی وضاحت کی اور تسلیم کیا کہ ایکیفے عمدہ فنی اطلاعات فراہم کر رہا ہے اور اب ماہرین کے اجتماع کے لیے جو موقع نکالا ہے وہ از حد مفید ہے۔

اپاہج بچوں کا اسکول

سب سے پہلے اس بات کی وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ ہیمپسٹڈ میں جو فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ نامی اسکول ہے وہ درحقیقت نیا اسکول نہیں ہے۔ اس کی کشادہ اور ہوادار اور جدید طرز کی عمارات بالکل نئی ہیں اور یہ دن کا پہلا اسکول ہے جسے جسمانی طور پر اپاہج بچوں کے لیے لندن کاؤنٹی کونسل نے جنگ کے بعد بنایا ہے لیکن ایک سو چالیس طلبا مختلف اور مخصوص اسکولوں سے آئے ہیں جس میں سابقہ فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ اسکول بھی شامل ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ یہ نام طلبا نے ۱۹۵۰ء میں امریکی صدر کے اعزاز میں منتخب کیا تھا جو فالج سے معذور ہو گئے تھے۔

دو سال کی عمر سے لے کر ۱۶ سال تک کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں متعدد اندوہگین بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں مثلاً عضلاتی بیماری جس سے اعضا مفلوج ہو جاتے ہیں۔ دماغی لقوہ۔ فالج۔ شدید دل کی بیماریاں اور ہڈیوں اور جوڑوں کی دق۔ لیکن اگر آپ ان سے گفتگو کریں گے تو ان سب بچوں کو حسب معمول خوش و خرم پائیں گے۔ بہت کم ایسے مصیبت زدہ بچے ہیں جو تمام تر توجہ کے باوجود زندگی سے حظ اٹھانے کے لائق نہیں ہیں۔

آپ یہ بھی عام طور پر دیکھیں گے کہ اپنی جسمانی کمزوریوں کی تلافی کرنے کی ان میں بڑی ہمت ہے مثال کے طور پر پانچ سال کی لڑکی جون کو پہیہ دار کرسی میں سکول لایا گیا کیوں کہ وہ فالج کے حملے سے بالکل اپاہج ہو گئی تھی۔ اس نے شروع میں لوہے کی کاٹھیوں کے ذریعہ چلنے کی جدوجہد کی، پھر وہ بیساکھیوں کے سہارے چلنے لگی اور دو سال کے بعد اس نے بچوں کے ڈرامہ اسنو وائٹ میں کردار ادا کیا۔ اب وہ تیرہ سال کی ہو گئی ہے۔ اس کے اساتذہ کی رائے ہے کہ اس کا کام اوسط درجے سے بہتر ہے اور جیسا کہ اس کا خیال ہے وہ یقینی طور پر سکول چھوڑنے کے بعد سرکاری ملازمت کر لے گی۔

چھوٹے بچوں کی جماعت میں مجھے ایک چھ سال کی بچی بیٹی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تھوڑے سے

رنگ کے باوجود یہ خاصی اچھی طرح چل پھر سکتی ہے بیٹی کو تشنج کی بیماری ہے۔ یہ ڈھائی سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئی۔ اس وقت نہ چل سکتی تھی نہ بول سکتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنے جسم کے کسی حصہ پر بھی قابو نہیں ہے۔ اگر اسے اس کی کرسی پر باندھا نہ جاتا تو ہر پانچ منٹ کے بعد وہ گر جاتی۔ بیٹی کی حالت اس کے اساتذہ کے لیے بھی مایوس کن حد تک دشوار تھی۔ لیکن انھوں نے اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کر کے بڑا قابل تعریف کام کیا ہے۔ دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی اس بچی نے چلنے کی بہت کوشش کی اور آخر کار اس نے چلنا شروع کر دیا۔ گفتگو کرنا ابھی اس کے لیے قدرے دشوار ہے لیکن وہ بڑی اچھی طرح گا سکتی ہے۔

پھر دل کی بیماری کے ایک مریض بچے سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے اساتذہ کے لیے دل کی بیماری کے مریض ان کے مشکل ترین مسائل میں سے ہیں۔ تشنجی اور فالج زدہ بچوں کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ سوچنے کی بجائے جدوجہد کا جذبہ پیدا کریں۔ لیکن ان بچوں کو جو دل کے مریض ہیں نرمی کے ساتھ منع کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ سب کچھ نہ کریں جس کے کرنے کی انھیں امنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ بچے کی دل شکنی کرنا بڑا ہی ناخوشگوار معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ پیٹر سے بہت خوش ہیں۔ یہ بہت تنومند اور مضبوط لڑکا تھا۔ لیکن گٹھیا کے بخار سے اس کے دل پر اس قدر شدید اثر ہوا تھا کہ وہ نہ صرف سیڑھیوں پر چڑھنے کے قابل نہ ہوتا بلکہ اسکول کے شور و شغب کے ماحول میں رہنا بھی اس کے لیے ناممکن ہو جاتا۔ لیکن پیٹر نے جو ابھی محض نو سال کا ایک بچہ ہے بہت جلد ہی غیر معمولی طور پر اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنا لیا ہے اور بہت کم عرصے میں اپنی پابندیوں کو سمجھ لیا ہے۔ آرام کرنے کے سلسلے میں وہ بہت سمجھدار ہے اور وہ غمگین اور افسردہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح آنسو نہیں بہا سکتا۔

یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ یہ بچے بڑے ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ اپنے ایسے نئے سکول میں کام کرتے ہیں جس کا ماحول مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اس بات کی ہر امکانی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ مسرور کن اور فرحت بخش فضا میں اپنی مدد آپ کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنا سیکھ جائیں۔ یک منزلہ عمارت کے ارد گرد چند معزز بچوں کو پہیہ دار کرسیوں میں بٹھا کر ان کے ہم جماعت ان کو سیر و تفریح کراتے ہیں۔ اگر کوئی تشنجی مریضہ اچانک بے قابو ہو کر اپنی پنسلیں میز سے گرانے پر مجبور ہو جاتی ہے

دوسرا بچہ فوراً انھیں فرش پر سے اٹھانے کو دوڑتا ہے ۔

بہر حال یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ بچے کچھ نہ کچھ ہنر کام کرنے کے قابل ہو سکیں۔ کچھ بچے جن کو چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ آدھے میل تک تیر سکتے ہیں۔ دوسرے چھوٹے بچے اور بچیاں بطخ کی طرح خوب کاسکتی ہیں۔ موسیقی کے استاد ریکارڈر (ایک باجہ) کے متعلق بہت سرگرم ہیں۔ مثال کے طور پر ہولی فالج کے بعد سے اب تک بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔ لیکن وہ اپنے باجہ پر گھر پریکٹس کرتی ہے۔ جب خاندان کے دوسرے افراد باہر کھیلنے جاتے ہیں وہ اس باجہ میں کافی انہماک اور دلچسپی کا اظہار کرتی ہے اور یہ محسوس کر کے اسے قدرے اطمینان ہوتا ہے کہ وہ بہر حال کچھ نہ کچھ کر سکتی ہے جو اس کے بھائی اور بہنیں نہیں کر سکتیں۔

اس اسکول کے اوقات ایک عام اسکول سے کم ہیں یعنی ساڑھے نو بجے سے ساڑھے تین بجے تک پھر بہت سے طلبا پندرہ میل تک کے فاصلوں پر رہتے ہیں اور ان کو مخصوص بس میں یہ طویل سفر کرنا پڑتا ہے ۔ اس بس میں یہ بچے اسکول آتے ہیں اور یہی بس ان کو ان کے اپنے اپنے گھروں پر چھوڑنے جاتی ہے کام کے دن میں بھی بہت سا وقت ماہر معضوبات کے معائنے اور معالج تقریر کے جلسوں میں صرف ہو جاتا ہے کیوں کہ طلبا کی تعداد میں ایک تہائی ایسے ہوتے ہیں جو صحیح طور پر بولنا بھی نہیں جانتے ۔

کتوں کی تربیت گاہ

ہزاروں سال سے لوگ کتوں کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے پالتے چلے آ رہے ہیں چنانچہ یہ انوکھی بات نہیں ہے کہ پولیس نے بھی امن و امان قائم کرنے کے سلسلے میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا ہے اور تربیت یافتہ کتے ان کے لیے بڑے انمول اور بے بہا ثابت ہوئے ہیں ۔

لندن کی پولیس جو تقریباً ۷۰۰ مربع میل تک پھیلے ہوئے گنجان علاقہ کی نگران ہے مختلف مقاصد مثلاً ہجوم کو قابو میں لانے، مجرموں کا سراغ لگانے، قیدیوں کی نگرانی اور گشت کرنے میں کتوں کی ایک بڑی تعداد سے کام لیتی ہے ۔

پولیس کے کتے کے لیے صحیح المزاج ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کا بے حد زود حس اور زود اشتعال ہونا خطرناک ہے۔ اس کے لیے احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ضرورت کے

وقت یا جب کام کا دباؤ ہو اپنے فرائض منصبی کو دل جمعی اور بے باکی سے انجام دے۔

اب تک مختلف النسل کے کتے زیر آزمائش رہے ہیں ان میں السیشن نسل کا کتا اپنی عقل مندی فرض شناسی اور بھروسہ اعتماد کے لیے نہایت تسلی بخش ثابت ہوا ہے۔ لیبریڈر نسل کے کتے جو ایک سے زیادہ سدھانے والوں کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ ہائڈ پارک اور شاہی محلات میں رکھے جاتے ہیں۔

تربیت گاہ :- میٹروپولیٹن پولیس فورس کا ایک مخصوص شعبہ ہے جو سپرنٹنڈنٹ ایف۔ ایچ اشار کی کی زیر نگرانی کتوں کی تربیت اور ان کی تقرری کا انتظام کرتا ہے۔ کیپٹن (ضلع کنٹ) میں کتوں کی تربیت گاہ انسپکٹر جی پرلسٹرچ کی زیر نگرانی ہے۔ سارجنٹ جے۔ اے مارٹی اس تربیت گاہ کے پرانے اتالیق ہیں وہ کتوں کی نسلوں اور ان کے رکھ رکھاؤ کے متعلق جتنا ان کو علم ہے اتنا شاید بہت کم لوگوں کو ہو۔ فی الحال فہرست میں ۲۵۰ کتے ہیں۔ کتوں کی بڑی اکثریت ایسی ہے جس کو خود مالک بطور تحفہ یا برائے نام قیمت پر پولیس کو پیش کر دیتے ہیں۔ السشن کتے بچپن میں بڑے دل فریب اور پیارے ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے ہونے پر ان کے کھانے کے اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ مزید براں ان قوی ہیکل کتوں کے لیے جدید زمانے کے چھوٹے فلیٹ اور مکانات ناکافی ہوتے ہیں۔ ان کے گھومنے اور ورزش کے لیے کشادہ اور کھلی جگہ درکار ہوتی ہے۔ جو لوگ پولیس کو یہ کتے پیش کرتے ہیں اس حقیقت سے بھی واقف ہوتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ کتوں کو اچھے گھر اور مسرت کن زندگی میسر آجائے گی۔

السیشن کتے سات ماہ کی عمر سے تربیت گاہ میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ان کو دو ہفتے ایک تنہا بلاک میں گذارنے پڑتے ہیں۔ یہاں ان کے مزاج کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ تربیت کا وقفہ ۱۴ ہفتے مقرر ہے۔ اس اثنا میں کتا اپنے آقا (سدھانے والے) سے بے حد مانوس ہو جاتا ہے اور اس کے اشارہ پر چلنے لگتا ہے۔ خوشبو سے کھوج لگانا۔ صرف دائیں بازو سے آدمی کو پکڑنا اور اس کی حفاظت کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اس کو دیواروں پر چڑھنے اور بلندیوں پر کودنے کی بھی مہارت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ٹریننگ بڑھتی جاتی ہے اسے زیادہ سے زیادہ بلندی سے چھلانگ لگانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

تربیتی کورس کا تمام تر دار و مدار کنٹرول پر ہے۔ کتوں کو اس طرح تربیت دی جاتی ہے کہ وہ معتدل مزاج میانہ رو رہیں۔ اور پبلک کے کسی آدمی کے لیے باعثِ خوف و ضرر نہ بن سکیں۔ آپس میں لڑنے والے کتوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور فسادی کتے جلد ہی نکال دیے جاتے ہیں۔

کتوں کو سدھانے والے پولیس مین اپنے سپرنٹنڈنٹ کی سفارش سے رضاکارانہ خدمات انجام دیتے ہیں۔ کتا اپنے آقا کے گھر اس کے کنبہ اور گھر کے پالتو جانوروں کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس بات پر بھی خاص نگاہ رکھی جاتی ہے کہ وہ آرام طلب نہ بن جائے۔ اپنے کام کی انجام دہی کے دوران میں کتے زیادہ سے زیادہ بلندی تک چھلانگ لگا سکیں۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کا کام برابر ترقی پذیر ہے وہ ہر پندرہ روز کے بعد نئے کورس کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہ تربیت پانے کے بعد پولیس کا کتا کیا کیا کام کرتا ہے ڈینیٹے کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ گشت کے موقع پر ڈینیٹے اپنے آقا کے ساتھ تھا تو اسے شبہ ہوا کہ قریب کی کسی اجاڑ جگہ حالات ناسازگار ہیں۔ تجسس کے بعد معلوم ہوا کہ لوگوں کا ایک گروہ سیف توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آہٹ پا کر یہ لوگ گولہ بارود اور مکان میں نقب لگانے کے آلات چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ڈینیٹے اور اس کے آقا نے ان کا تعاقب کیا۔ ان میں سے ایک آدمی کو کتے نے پکڑ لیا اور اس کو قابو میں کر لیا۔ اس کے بعد ڈینیٹے کو دوسرے آدمیوں کے پیچھے بھیجا گیا۔ لیکن اس اثنا میں پہلے آدمی نے پولیس مین پر غالب آنے کی کوشش کی جس میں پولیس مین زخمی ہو گیا۔ اس لیے ڈینیٹے کو واپس آنا پڑا۔ اب اس کی مدد سے اس آدمی پر پورا پورا قابو پا لیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیف میں چھ سو پونڈ تھے۔

غرض کہ یہ اور دیگر مثالیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ تربیت گاہ کے نکلے ہوئے مشاق کتے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستا بھر مین یه دوھی تعلیمی رسالے ھین - جنکو سرکاری
و پرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی
رو صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین
یڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں
.ں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ مین چھپتے ھیں اور ان
کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ
مینجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں مین اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھولگی -
بارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل / اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

د ۱۰ شمارہ ۱] لاہور [اپریل

اس شمارہ میں

اداره تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری / فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۵۸ء

جلد ــــــــــ ۱۱
شمارہ ــــــــــ ۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

دسویں سائنس کانفرنس

ایم اے مخدومی

بہار کا موسم ہر سال لاہور کی ثقافتی اور علمی زندگی میں خاص چہل پہل لے کر آتا ہے۔ اس سال اس ثقافتی اور علمی سرگرمی کا ایک اہم حصہ دسویں کل پاکستان سائنس کانفرنس تھی جو دس سے پندرہ مارچ تک منعقد رہی۔ کانفرنس کا ایک تعلیمی سیکشن بھی تھا جس کے اجلاس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ہوتے رہے۔

تاریخ عالم میں سائنس کا ظہور ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ سائنس نے انسان کو صرف حیرت انگیز ایجادیں اور طرح طرح کی مشینیں ہی عطا نہیں کیں۔ اس نے انسانی فکر پر بھی ایک مستقل اثر ڈالا ہے اس نے انسان کو زندگی کے ہر مسئلہ پر مکمل معروضیت سے سوچ بچار کرنے کا ڈھنگ سکھایا ہے اس نے یہ بتایا ہے کہ ٹھوس تعمیر وہی ہے جس کی بنیاد جذبات و قیاسات کی بجائے حقائق و شواہد اور اعداد و شمار پر ہو۔ یہ سائنسی طرز فکر آج تمام علوم کا مسلمہ طریق کار ہے۔ علم التعلیم بھی اسی سائنسی طریق کار سے خدمت لے رہا ہے۔

تعلیمی سیکشن کے صدر ڈاکٹر ممتاز الدین احمد وائس چانسلر راج شاہی یونیورسٹی کا کا جو صدارتی خطبہ پہلے اجلاس میں پڑھا گیا اس کا اردو ترجمہ زیر نظر شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خطبے میں اکثر اعداد و شمار مشرقی پاکستان سے متعلق ہیں۔ تاہم وہ ملک کی مجموعی تعلیمی حالت کی اچھی خاصی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ملک کو آج جن چند در چند تعلیمی مسائل کا سامنا ہے خطبے میں ان میں سے اکثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تعلیم ایک ایسا موضوع ہے جس میں قدرتی طور پر ملک کے ہر شہری کو دلچسپی ہے۔ مگر اکثر لوگ تعلیمی معاملات پر بات چیت کرتے وقت ذاتی رائے کو حقائق و شواہد کا بدل خیال کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جنہیں حقائق سے بہت کم

تعلق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رضا الدین احمد کا خطبہ ملک کی عام تعلیمی صورتِ حال کا ایک مختصر مگر سائنسی جائزہ ہے
سائنس کانفرنس کے تعلیمی سیکشن میں جو متعدد تقریریں اور مذاکرات ہوئے وہ بھی بے حد مفید تھے
اس قسم کے تعلیمی اجتماعوں کی بڑی غایت یہ ہوتی ہے کہ مشترکہ مسائل کے حل اجتماعی فکر کی مدد سے سوچے جائیں۔ اس طرح مسائل کے مختلف پہلوؤں پر جو روشنی پڑتی ہے وہ حصہ لینے والوں کو حل مسائل کی نئی نئی راہیں سجھاتی ہے اور مشکل مسائل بھی رفتہ رفتہ قابل حل نظر آنے لگتے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اجتماعی فکر کی یہ تکنیک عام استعمال ہوتی ہے۔ مگر ہمارے استادوں کو ابھی اسکا استعمال سیکھنا ہے۔ بہت سے استاد اس قسم کے تعلیمی اجتماعوں کے قریب رہتے ہوئے ان سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ ایک جمہوری معاشرے میں افہام وتفہیم اور حقائق وشواہد سے استدلال ہی ہر قسم کے مسائل کا واحد ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے استادوں کو بھی طرح طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل کے حل کی بہترین صورت یہی ہے کہ انھیں عوام کے سامنے رکھا جائے، اور عوام کو ان کی اہمیت کا قائل کیا جائے۔ سائنس کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے تعلیمی اجتماع اس امر کے بہترین مواقع پیش کرتے ہیں کہ استاد اور عوام مل کر بیٹھیں اور مختلف تعلیمی مسائل کے قابل عمل حل تلاش کریں ان اجتماعوں کی کامیابی نہ صرف حکومت کے کام کو آسان تر بناتی ہے بلکہ خود استادوں کے مسائل کا تسلی بخش حل بھی قریب تر لانے کا باعث بنتی ہے ؛

کل پاکستان سائنس کانفرنس لاہور

تعلیمی سیکشن کا صدارتی خطبہ

ترجمہ از:- نذیر احمد

ذیل میں اس صدارتی خطبے کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے جو دسویں کل پاکستان سائنس کانفرنس کے موقع پر پڑھا گیا۔ کانفرنس کا تعلیمی سیکشن اپنے اجلاس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں منعقد کرتا رہا تعلیمی سیکشن کا سارا اہتمام جناب پروفیسر انیس الدین صاحب العماری نے کیا۔ خطبۂ صدارت جناب ڈاکٹر ممتاز الدین احمد وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی نے لکھا تھا سائنس کانفرنس لاہور میں دس تا پندرہ مارچ جاری رہی (معاون مدیر)

کانفرنس کا اہتمام کرنے والوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد خطبے میں کہا گیا:-

پاکستان کے تعلیمی مسائل بہت بڑے اور نہایت پیچیدہ ہیں۔ جو نظام تعلیم پاکستان کو متحدہ ہندوستان سے ورثے میں ملا وہ برطانوی دور کی یادگار ہے۔ اس نظام تعلیم کا بڑا مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کی انتظامی ضرورتیں پوری کرے۔ اس کا مقصد ملک کی ترقی نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نام نہاد نظام بے ربطی کے عالم میں بڑھتا چلا گیا اور کوئی مقررہ مقصد اسے کسی مقررہ راہ یا سمت پر نہ لگا سکا۔ یہ نظام لوگوں کے مزاج یا ان کی ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ نہ تھا۔ نہ ہی یہ تیزی سے بدلنے والی معاشی ضرورتوں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ ملک کی تقسیم نے تعلیمی صورت حال کو بُری طرح متاثر کیا۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان میں تقسیم سے پہلے کلکتہ نہ صرف صوبے کا سیاسی مرکز تھا بلکہ اس کا تعلیمی اور ثقافتی مرکز بھی جو رقبہ اس وقت مشرقی پاکستان میں شامل ہے اس میں نہ کوئی میڈیکل کالج تھا نہ انجینئرنگ کالج اور نہ ہی کوئی کمرشل کالج۔ تقسیم کی وجہ سے اور مسائل بھی پیدا ہو گئے یونیورسٹیوں کالجوں اور مدرسوں کے بہت سے غیر مسلم استاد ہندوستان کو چلے گئے اور یوں صوبے کی تعلیمی زندگی میں بڑے بڑے خلا پیدا ہو گئے۔ ساتھ ہی پاکستان کی آزاد ریاست کو چلانے کے لیے قابل فنی ماہروں کی بھاری مانگ پیدا ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ مغربی پاکستان پر بھی صادق ہوتا ہے

اس مشکل صورت حال میں پہلے چند سال تک ہماری کوشش یہ رہی کہ موجودہ نظام کے اہم خلاؤں کو پُر کیا جائے۔ اس غرض کے لیے میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ کالج قائم کیے جائیں اور موجودہ تعلیمی اداروں کو چالو رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آل پاکستان مشاورتی بورڈ برائے تعلیم اور انٹر یونیورسٹی بورڈ آف پاکستان جیسے ادارے قائم کیے گئے۔ ان کی غایت یہ تھی کہ تعلیم کو نیا رخ دیا جائے۔ اور اس کی اس طرح پر تعمیر نو کی جائے کہ وہ لوگوں کے مزاج و روایات اور جدید آزاد مملکت کی ضرورتوں کے حسب حال بن جائے۔ صوبائی حکومتوں نے مختلف کمیٹیاں اور کمیشن اس غرض سے قائم کیے کہ مختلف تعلیمی مسائل کا مطالعہ کریں۔ نئی قسم کے تعلیمی ادارے از قسم پولی ٹیکنک، کالج آف ہوم اکنامکس اور ٹیکنیکل ہائی سکول قائم کیے گئے۔ پلاننگ بورڈ نے تعلیمی توسیع و ترقی کا جو خاکہ تیار کیا ہے اس میں تعلیم کے تمام مدارج یعنی ابتدائی درجے سے لے کر یونیورسٹی کے درجے تک تعلیم کی تجدید اور توسیع کے لیے منصوبے شامل ہیں۔ یہ منصوبے پہلے پنجسالہ ترقیاتی منصوبے کا حصہ ہیں تقسیم کے وقت صرف پنجاب اور ڈھاکہ کی دو یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ سندھ یونیورسٹی تقسیم سے ٹھیک پہلے قائم کی گئی تھی۔ آزادی کے بعد تین نئی یونیورسٹیاں یعنی پشاور، کراچی اور راج شاہی کی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ موجودہ نظامِ تعلیم ہمارے معاشرتی اور معاشی نظام میں اس طرح پیوست ہو چکا ہے کہ اس کی اصلاح و تجدید رفتہ رفتہ ہی عمل میں آسکتی ہے۔ تاہم یہ امر ضروری ہے کہ ہم اپنے مختلف تعلیمی مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کے متعلق واضح رائے قائم کر لیں۔ تاکہ ہم آئندہ تعلیمی ترقی کے لیے جو منصوبے تیار کریں وہ پوری طرح ہم آہنگ اور مربوط ہوں اور انھیں عملی شکل دیتے وقت کم سے کم دشواری اور ضیاع کا سامنا ہو۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر میں چاہتا ہوں کہ پاکستان کے تعلیمی مسائل پر مختصر بحث کروں چوں کہ مشرقی پاکستان کے نظامِ تعلیم اور اس کے طریق کار کا مجھے گہرا علم ہے۔ تعلیمی مسائل کے متعلق میں جو رائے ظاہر کروں گا اس کی بنا مشرقی پاکستان کی تعلیمی صورتِ حال ہی ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ سارے پاکستان کے تعلیمی مسائل بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے میں مشرقی پاکستان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کروں گا وہ سارے پاکستان پر لاگو ہوں گے۔ میں سب سے پہلے ابتدائی تعلیم پر بحث کروں گا۔

ابتدائی تعلیم | تقسیم ملک کے وقت مروجہ نظام تعلیم کے مطابق ابتدائی نصاب چار سالہ تھا۔ مگر یہ محسوس کیا گیا کہ چار سالہ

ابتدائی نصاب ایک جمہوری معاشرے میں انسانی زندگی کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ اس مقصد کے لیے آٹھ سالہ نصاب ضروری سمجھا گیا۔ مگر چوں کہ ہمارے وسائل محدود تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ سردست ابتدائی تعلیم کی میعاد پانچ سال رکھی جائے اور نصاب کو موزوں شکل دی جائے۔

ابتدائی تعلیم پر بحث کرتے وقت پہلے میں مشرقی پاکستان کی صورت حال کو پیش نظر رکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بحث باقی ملک کے لیے بھی دل چسپی کا باعث ہوگی۔

نصاب:۔ نصاب پر نظر ثانی کر کے اس میں وہ تمام مضامین۔ دل چسپیاں اور سرگرمیاں داخل کی گئی ہیں جن کا مقصد اس قسم کی علمی اور ثقافتی تعلیم بہم پہنچانا ہے کہ طلبہ جمہوریہ پاکستان کی شہریت کے لیے تیار ہو جائیں اور ایک اچھی اور طمانیت بخش زندگی گزار سکیں۔

اکثر مدرسوں میں موزوں بلکہ کافی مکانیت کی کمی ہے اور تمام کے تمام مدرسے ضروری تدریسی امدادوں سے بالکل محروم ہیں۔ اکثر استاد موزوں تعلیمی قابلیت کے مالک نہیں۔ جو استاد مناسب تعلیمی استعداد رکھتے ہیں وہ بھی تدریس کو بہترین توجہ نہیں دیتے کیوں کہ ان کی تنخواہیں تھوڑی ہیں۔ اور یہ کمی پوری کرنے کے لیے انھیں دوسرے کام کاج کرنے پڑتے ہیں۔ بعض حالتوں میں یہ ضمنی کام کاج ان کی ساری توجہ اور قوت کو جذب کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں چھے سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے جو مثالی نصاب وضع کیے گئے ہیں وہ ان کے لیے ضرورت سے زیادہ بوجھل بن گئے ہیں اور زیادہ تر غیر موثر رہے ہیں۔ ایک حالیہ کمیشن کی سفارشوں کے مطابق ابتدائی نصاب میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہونی چاہئیں :۔

(۱) مادری زبان کا پڑھنا (۲) مادری زبان کا لکھنا (۳) حساب (۴) معاشرتی علوم جن میں تاریخ جغرافیہ اور شہریت کے اجزا شامل ہوں۔ یہ مضمون دوسری جماعت میں بالکل زبانی پڑھایا جائے اور تیسری اور چوتھی جماعتوں میں یہ قدرے زبانی پڑھایا جائے اور قدرے کتابوں سے (۵) سائنس کی مبادیات جن میں حفظان صحت بھی شامل ہو۔ یہ مضمون پہلی دوسری جماعتوں میں زبانی پڑھایا جائے۔ اس کے بعد یہ قدرے زبانی پڑھایا جائے اور قدرے کتابوں سے (۶) آرٹ اور دستکاری جو مکمل طور پر عملی ہو (۷) جسمانی تربیت کھیلیں اور موسیقی (عملی) (۸) دینی تعلیم۔ یہ تعلیم زیادہ تر عملی اور زبانی ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک مشہور ماہر نصاب ساز کی رائے کا حوالہ دینا بے موقع نہ ہوگا :-

"اس تھیلے میں ان کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے جن کی ضرورت سفر زندگی میں پیش آنیوالی ہے۔ مگر اس میں یکے بعد دیگرے مضامین ٹھونسے جاتے ہیں تاآں کہ یہ تھیلہ پھٹنے کو آجاتا ہے۔ ضروری کپڑوں کی بجائے یہ طرح طرح کے لباسوں کے ٹکڑوں سے اٹ جاتا ہے۔ اس بدتمیزی کو اور زیادہ بے ہنگم بنانے کے لیے ہم ان کپڑوں کو اندھا دھند گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ ہم ایک کپڑا زیب تن کرتے ہیں اور قبل اس کے کہ بٹن بند کرنے کی مہلت ہو ہم اسے اتار پھینکتے ہیں۔ حساب کی گھنٹی ختم ہوتے ہی فرانسیسی زبان کا پیریڈ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر تھوڑی سی سائنس پڑھی جاتی ہے۔ پھر ذرا سی لاطینی زبان۔ پھر تاریخ کا گھنٹہ آجاتا ہے اور پھر یک دم کسی ایسے مضمون کی باری آجاتی ہے جس کا سالقہ اسباق سے کچھ تعلق نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدنصیب بچہ کسی ایک کام کو بھی ٹھیک کر نہیں کر سکتا۔ وہ علم کے متعلق اجزائی طریق کار اختیار کر لیتا ہے۔ وہ تعلیم کو اسباق کا مجموعہ خیال کرنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک مطالعہ کا مفہوم یہ بن جاتا ہے کہ علمی میدان میں تیزی کے ساتھ منہ ایک طرف سے دوسری طرف موڑا جائے۔"

میں اس قدر قنوطی نقطہ نگاہ کا حامی نہیں۔ لیکن میری سختی سے یہ رائے ہے کہ جس قسم کے حالات سے ہم دوچار ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم نصاب کو ہلکا کرنے کے معاملہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مدرسوں کے اسباق سختی سے کم کر دیے جائیں اور تعلیم کے دوسرے اہم اجزا غیر رسمی کام سے حاصل کیے جائیں یہ اجزا مدرسے کے ماحول اور اس کی غیر نصابی سرگرمیوں سے جذب کیے جائیں۔ معاملے کو اس طور پر دیکھنے کے بعد موزوں اور قابل عمل طریق کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سالہ نصاب ایسے بچوں کے لیے وضع کیا جائے جو حد درجہ ناموافق حالات میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انھیں مادری زبان پر مؤثر قدرت عطا کی جائے۔ انھیں صحت مند عادات، درست نگاہ عطا کیے جائیں۔ تاکہ وہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ طلبہ کو بالغ زندگی کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ کوشش نہ ہونی چاہیے کہ طلبہ کو بالغ زندگی کے لیے مکمل طور پر تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کر دینا چاہیے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں لازمی تعلیم کا عرصہ چودہ، سولہ بلکہ اٹھارہ برس کی عمر تک جاتا ہے۔ اس کے بعد جز وقتی تعلیم کی صورت میں مزید تعلیم کے مواقع بھی موجود رہتے ہیں

اس طرح بلوغت کی عمر کو پہنچنے تک بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی ہمیں چاہیے کہ ابتدائی درجے کے بعد تعلیم جاری رکھنے کی سہولتیں پیدا کریں۔ تاکہ جو بچے ابتدائی تعلیم سے آگے پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتے وہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جمہوریہ پاکستان کے آئندہ شہریوں کی مناسب اور مؤثر تعلیم کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ یہ چیز اس لیے بھی ضروری ہے کہ جو بچے ابتدائی مدرسے سے معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں وہ خواندگی کو تازہ اور زندہ رکھنے والی سہولتوں کے فقدان کے باعث دوبارہ ناخواندگی کا شکار نہ ہو جائیں۔ یا خواندگی کا غلط استعمال کر کے گھٹیا اور نقصان دہ لٹریچر کے دلدادہ نہ بن جائیں۔ اگر ہم محض خواندگی عطا کر دیتے ہیں اور اس کے موزوں استعمال کی سہولتیں بہم نہیں پہنچاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی خواندہ آبادی کو مضرت رساں بلکہ خطرناک اثرات کے رحم پر چھوڑ رہے ہیں۔ ہم اسے بغاوت پر ابھارنے والے کتابچوں۔ اخلاق سوز رسالوں اور لادینی پھیلانے والے لٹریچر کی زد میں لا رہے ہیں۔ اس نکتے پر اس لیے زور دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی غلط فہمی ختم ہو جائے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خواندگی بذات خود ایک خوبی ہے نہ کہ تعلیم حاصل کرنے کا ایک مفید ادزار۔

ہمیں چاہیے کہ خواندہ لوگوں کے پڑھنے کے لیے موزوں قسم کا مواد تیار کریں۔ تاکہ جن لوگوں نے خواندگی نئی نئی حاصل کی ہے وہ مزید پڑھائی جاری رکھ سکیں اور آبادی کا بڑا حصہ جس کی رسمی پڑھائی ابتدائی درجے پر ختم ہو گئی تھی وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس مسئلے پر بحث کرنے کے لیے ۱۹۵۶ء میں مری کے مقام پر یونیسکو نے ایک مجلس مذاکرات کا اہتمام کیا تھا۔ خواندگی کا مسئلہ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ خیال ہے کہ یونیسکو پاکستان میں ایک ایسا مرکز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے جو ان ممالک کے لیے موزوں قسم کا لٹریچر تیار کرے۔

اس سلسلے میں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ جو ابتدائی مدرسے دیہاتی رقبوں میں واقع ہیں تقریباً ۸۰ فی صد ابتدائی مدرسے دیہاتی رقبوں میں واقع ہیں) انھیں نہ صرف اصلاحی لحاظ سے مقامی آبادی کے مرکز بننا چاہیے بلکہ انھیں گاؤں کی ساری آبادی کے لیے تعلیمی، معاشرتی، ثقافتی اور تفریحی مرکز کا درجہ حاصل کرنا چاہیے۔ یہ مدرسے تعلیم بالغاں اور معاشرتی خدمت کے مرکز بھی بن سکتے ہیں۔ اور ظاہر

تھانے میں تقریباً گاؤں کے دس گروہ موجود ہیں (۹۹۳ تھانوں میں ان کی تعداد چار ہزار ہے) اور گاؤں کے ہر گروہ میں ایک نمونے کا مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مدرسے یونین کے صدر مقام پر قائم کیے جا سکتے ہیں اور انتظامی، معاشرتی اور صحتی امور کے لیے ایک ہم آہنگ لائحہ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے۔ سرکل افسر اور یونین کے دوسرے انتظامی افسر اپنے دورے کے وقت عوام اور مدرسے کے استادوں کو مقامی حکومت خود اختیاری کے نظام اور اس کے طریق کار سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ محکمہ صحت کے انسپکٹر حفظان صحت کے کارکن اور محکمہ زراعت کے کارندے بھی یہی طریق کار اختیار کر سکتے ہیں۔ اس طرح محکمہ نشر و اشاعت کے لوگ یونین کے صدر مقام کو نشر و اشاعت کا مرکز بنا سکتے ہیں۔ اس مقام پر زراعت کا نمائشی فارم اور چھوٹی صنعتوں کا مرکز بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک کتب خانہ کھول کر عوام کی موزوں کتابیں اور اخبارات مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اس لٹریچر کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے جو عوام کے لیے دل چسپی کا باعث ہو۔ اس مرکز کو گاؤں کے معاشرتی اور مذہبی تہواروں کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ مثلاً میلاد شریف یا ڈرامے وغیرہ اس مرکز میں منعقد ہوں۔ یونین کے صدر مقام میں اس قسم کے لائحہ عمل کو اپنا کر ہم وہاں ایسی فضا اور ایسی سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں جو نہ صرف مدرسے کی تعلیم اور بچوں کی مابعد تعلیم کے لیے سازگار ہو بلکہ بالغوں کی تعلیم کو بھی سہارا دینے والی ہو۔ ولیج ایڈ پروگرام کو بھی اس پروگرام کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے اس طور پر شہری رقبوں کے لیے ان کے حسب حال منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں دینی تعلیم کو قابل فخر درجہ ملنا چاہیے اس لیے میں اس تعلیم کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ابتدائی مدرسے میں ہی بچے زندگی کے متعلق اپنے بنیادی نقطہ نگاہ کی تشکیل کرتے ہیں اور یہاں یہ مقولہ سب سے زیادہ صادق آتا ہے کہ انھیں چھوٹی عمر میں ہی قابو کرنا چاہیے" یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دین سکھایا نہیں جاتا بلکہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اور جس شخص کے اپنے سینے میں دین کی روشنی موجود نہ ہو وہ دوسروں کے سینوں میں یہ شمع روشن نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دینی تعلیم موزوں ماحول میں دی جائے اور یہ تعلیم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اپنی تربیت، اپنے مزاج اور اپنے عمل کی وجہ سے اس بات کے اہل ہوں۔ اس میدان میں محض علم اور وعظ کچھ کام نہیں دے سکتے۔ نہ صرف یہ کہ ذاتی

مثال تلقین سے بہتر ہے بلکہ تلقین کی بنیاد ہی ذاتی مثال پر ہونی چاہیے۔ تاکہ اثر پذیر ننھے دل اس مثال سے ہدایت اور ولولہ عمل حاصل کریں۔ ان حقائق کے پیش نظر میرا مشورہ یہ ہے کہ دینی تعلیم جمعہ کے دن مسجدوں میں دی جائے اور یہ تعلیم مسجدوں کے امام اور خطیب دیں جن کی زندگیاں دین کے لیے وقف ہیں اور جو اسلام کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان دینی جماعتوں کا اہتمام کم و بیش اسی طور پر کیا جا سکتا ہے جس طرح مغربی ملکوں میں لندن سکول چلائے جاتے ہیں۔ اس دینی تعلیم کو زیادہ مفید بنانے کے لیے مدرسوں میں بھی دینیات پر موزوں قسم کے سبق دیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں اس سکیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ترکی میں اماموں اور خطیبوں کی تربیت کے لیے تیار کی گئی تھی۔ حیرت ہے کہ ہم اپنے خطیبوں اور اماموں کے لیے ضروری تعلیمی استعداد مقرر کیوں نہیں کرتے۔ چوں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے اور اس پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ دین کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ ہم ان اماموں اور خطیبوں کے لیے کم از کم تعلیمی استعداد مقرر کر سکتے ہیں جنھیں بچوں کو پڑھانا ہو۔ اسلام ایک ہمہ گیر ضابطہ حیات پیش کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے اس لیے ایک مسلمان کی زندگی سراپا اسلامی روح سے معمور ہونی چاہیے جو استاد دینی تعلیم دیں انھیں نصاب کے دوسرے مضامین سے بھی واقفیت ہونی چاہیے تاکہ وہ اسلامیات کی تعلیم کو دوسرے مضامین سے ربط دیکر اسے زیادہ بامعنی بنا سکیں اور اسے طلبہ کی عملی زندگیوں سے تعلق دے سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ امام اور خطیب قومی زندگی میں بڑا اہم درجہ رکھتے ہیں اور وہ اس مقام کے حق دار بھی ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جب تک انھیں دوسرے تعلیمی وسائل سے قریب تر نہ لایا جائے گا اس وقت تک وہ معاشرتی اصلاح و پیش قدمی میں مددگار ثابت ہونے کی بجائے اس کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

میں آپ کی توجہ ابتدائی تعلیم کے ایک اور پہلو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ چھ سے گیارہ سال کی عمر کے بچوں میں سے صرف پچاس فی صد مدرسوں میں جاتے ہیں لیکن اس پچاس فی صد کی جماعت وار تقسیم حسب ذیل ہے۔

دوسری طرف صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ ہو۔

ابتدائی مدرسے

جماعت	طلبہ اور طالبات کی کل تعداد	کل تعداد کا فی صد تناسب
پہلی جماعت	۱۴۰۶۶۵۵	۵ء۱۵ فی صد
دوسری "	۵۴۲۷۸۲	۲۰ "
تیسری "	۳۴۹۵۷۸	۱۳ "
چوتھی "	۲۵۰۲۴۳	۹ "
پانچویں "	۱۷۹۴۹۹	۶ ½ "
کل تعداد	۲۷۲۸۷۷۷	۱۰۰

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ جن بچوں کو ابتدائی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ ان کا صرف دس فیصد حصہ یہ تعلیم پوری کرتا ہے صرف یہ قلیل حصہ مؤثر فوائد کی حاصل کرتا ہے۔ بچوں کی بھاری اکثریت پہلی سے لے کر چوتھی جماعت تک تعلیم کو چھوڑ دیتی ہے جو سراسر ایک تعلیمی ضیاع ہے۔ موجودہ معاشی اور معاشرتی حالات میں جبر کا راستہ قابل عمل نظر نہیں آتا۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ابتدائی درجے پر تعلیمی جمود اور ضیاع کا تدارک کس حد تک کیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی مدرسین کی حالت

ابتدائی مدرسے کے استاد کی عام تنخواہ قابل افسوس حد تک قلیل ہے پھر اس بیچارے کے لیے نہ پراویڈنٹ فنڈ موجود ہے نہ بیمہ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابتدائی مدرس اپنے کام کو پوری توجہ نہیں دے سکتا جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بالکل بے کار اور بے سہارا رہ گیا اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ناکارگی اور نااہلی کے سبب استاد کو علیحدہ کرنا ضروری ہو وہاں بھی یہ بات قابل عمل نظر نہیں آتی۔ استاد کو ہر نظام تعلیم میں کلیدی درجہ حاصل ہوتا ہے مگر موجودہ صورتِ حال نے یہ بات ممکن نہیں چھوڑی کہ ناکافی استعداد کے استاد مقرر کیے جائیں اور اس طرح نظامِ تعلیم کی اصلاح کی جائے۔

اس سوال پر میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرکے بس کر دوں گا۔

مدرسوں کی تعداد طلبہ کو بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کی موجودہ صورت غیر مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ ہمیں ابتدائی تعلیم کے موجودہ سستے نظام سے نجات حاصل کرنی چاہیے کیونکہ غلط ترین بچت تعلیمی اخراجات کی بچت ہوا کرتی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعلیمی خوبی کو قربان کردینے اور متعارضہ متعلق ذہن صاف نہ ہونے کے باعث مدارس کی پیداوار پر اثر پڑا ہو۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ موزوں معیار کے مدرسے قائم کریں۔ ایسے مدرسے جن کے اسناد و ساز و سامان اور عمارت موزوں قسم کی ہوں، خواہ اس مطلب کے لیے ہمیں سینکڑوں غیر مؤثر مدرسے قربان کرنے پڑیں ان کو باہم ملا کر متحدہ مدرسے قائم کرنے پڑیں۔

ثانوی تعلیم

موجودہ حالت :- ثانوی تعلیم کے موجودہ نظام کے مطابق ہمارے مدرسے صرف علمی اور کلاسکی قسم کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ طلبہ آرٹ کالجوں کی انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں داخلہ حاصل کرسکیں۔ حالانکہ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں سائنس کی بنیادی تعلیم ثانوی نصاب کا ضروری جزو ہے۔ شاید ہمارے مدرسوں میں دس فی صد بھی ایسے نہیں جو سائنس کی تعلیم دیتے ہوں۔ نہ ہی ان کے ہاں کوئی پیشہ ورانہ اور نیم پیشہ ورانہ نصاب موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچوں کو ثانوی مدرسوں میں ایسی تعلیم ملتی ہے جو اپنے مندرجات اور ہیئت کے اعتبار سے قرون وسطیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ میٹرک پاس کرنے والوں کی اکثریت سولہ سال کی عمر میں اپنے دیہاتی گھر کو چھوڑ کر کسی آرٹس کالج میں داخل ہونے چل پڑتی ہے۔ اس طرح یہ نوخیز میٹرک پاس آغاز بلوغت میں ہی شہری زندگی کی غیر پسندیدہ کششوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کا ہاتھ روکنے کے لیے نہ گھر کا اثر موجود ہوتا ہے اور نہ ہی کالج کے ذمہ دار لوگ ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ کالج میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے میں داخلہ لے لیا جائے۔ مگر حقیقت بہت مختلف ہے۔ اب ہفتے میں دو کی بجائے چار نصف رخصتیں آتی ہیں۔ پہلے سال میں صرف چودہ ہفتوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ اب بائیس یا چوبیس ہفتوں کی ہوتی ہیں۔ پہلے دن میں لگاتار چھے گھنٹے کے قریب پڑھائی ہوتی تھی۔ لیکن اب صرف روزانہ دو تین لیکچر ہوتے ہیں۔ اور ان میں بھی اگر کوئی جانا نہ چاہے تو ہے ٹنک نہ جائے۔ صدر معلم کی جگہ

اب پرنسپل نے لے لی ہے جو وائس چانسلر کا قائم مقام ہے اور جو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ استادوں اور استانیوں کی جگہ اب پروفیسر اور لکچرار ہیں جو طلبہ میں بہت کم دل چسپی لیتے ہیں اور کام کے معاملے میں بہت کم مواخذہ کرتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود امتحانوں کی تعداد کم نہیں ہو گی۔ اگر کچھ فرق ہوگا تو یہ کہ اب امتحان بہت زیادہ کڑے ہوں گے۔ لہٰذا کالج کو دوسرا مدرسہ کہنا کسی طرح زیبا نہیں ہے۔

یہ صورت حال نوخیز طلبہ کی بدنی اور ذہنی صحت پر تباہ کن اثرات ڈالتی ہے۔ چوں کہ ہمارے ثانوی نصاب میں ایسے کوئی مضامین شامل نہیں ہو گاؤں میں زندگی گذارنے اور کام کرنے کی تربیت دیں اس لیے میٹرک پاس نوجوانوں کی اکثریت شہروں کا رُخ کرتی ہے اور کلرکی کے لیے جوتے چٹخانے لگتی ہے۔ جوں جوں بیکاری کا مسئلہ مشکل بنتا جاتا ہے یہ نوجوان شہروں میں بلا مقصد گھومتے نظر آتے ہیں۔ دیہاتی مدرسوں میں بھی تعلیم کا مزاج اس حد تک شہری ہے کہ جونہی ایک دیہاتی بچہ مدرسے جانے لگتا ہے وہ گاؤں سے بیزار ہونے لگتا ہے۔ ان مدرسوں کے استادوں کو سردست گاؤں کی ثقافت میں کوئی دل چسپی نہیں۔ نہ ہی انہیں گاؤں کی تعمیر کے متعلق کوئی تربیت دی گئی ہے۔ گاؤں کی قدر و قیمت اور امکانات میں انھیں کوئی اعتقاد نہیں دیہاتی زندگی کے فلسفے کو سمجھنا درکنار انھیں اس کام کا علم تک نہیں۔ استاد خود شہری زندگی کے دلدادہ ہوتے ہیں، اس لیے گاؤں کے بہترین نوجوان بھی وہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ استاد اس خطرے کا راستہ نہیں روک سکتے" (کے ایم منشی)

مسٹر منشی نے ہندوستان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ پاکستان پر بھی صادق آتے ہیں۔ یہ صورت حال پاکستان جیسے ملک کے لیے بے حد افسوس ناک ہے۔ کیوں کہ اس ملک کی معیشت زیادہ تر زرعی ہے اور ۹۰ فی صد لوگ گاؤں میں آباد ہیں۔

میں اس سلسلے میں فلپائن کے زرعی ہائی سکولوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان مدرسوں نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔ یہ مدرسے ہمارے دیہاتی علاقوں کے لیے نمونے کا کام دے سکتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے شہری رقبوں میں ایسے مدرسے کھول سکتے ہیں جو ٹیکنیکل اور کمرشل تعلیم دیں۔ مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم نے تعلیم کی اصلاح کے لیے مندرجہ بالا خطوط پر ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ امید ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے

کچھ آزمائشی مدرسے جلد شروع کر دیے جائیں گے ۔

ثانوی تعلیم کی واضح تصویر پیش کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے ثانوی مدرسوں کے متعلق کچھ کوائف نیچے دکھائے جاتے ہیں :-

مشرقی پاکستان کے ثانوی مدارس

مدرسے کی قسم	تعداد	تعداد طلبہ	تعداد اساتذہ	سرکاری اور غیر سرکاری خرچ
گورنمنٹ سکول (مردانہ)	۳۰	۳۱۹۷۴۷	۱۲۷۵۷	۲۴..... روپے
" " (زنانہ)	۷	لڑکے	مرد	سرکاری مدرسے
غیر سرکاری سکول (مردانہ)	۱۴۲۵	۲۳۹۲۵	۹۸۰ تربیت یافتہ	۳۳..... روپے
" " " (زنانہ)	۶۳	لڑکیاں	۵۰۵ عورتیں ۱۱۳ تربیت یافتہ	غیر سرکاری مدرسے
	۱۵۲۵	۳۴۳۶۷۲	۱۵۷۲۲	۵۷..... روپے [illegible]

(ماخوذ از ایجوکیشن ریفارم کمیشن رپورٹ ۱۹۵۴ء)

اوسطاً حکومت ہر غیر سرکاری مدرسے کو ۲۲۰۰ روپے سالانہ امداد دیتی ہے ۔ ہر مدرسے کی اوسط تعداد طلبہ ۲۴۴ ہے اور شرح فیس اوسطاً تین روپے فی طالب علم ہے۔ اس طرح ۴۴ فیس معافیاں چھوڑ کر باقی ۲۰۰ طلبہ سے ۷۲۰۰ روپے سالانہ فیس وصول ہوتی ہے ۔ اس طرح ایک مدرسے کی انتہائی سالانہ آمدنی ۹۴۰۰ روپے بنتی ہے ۔

اخراجات کے بارے میں اگر بہت نرم اندازہ بھی لگایا جائے تو یہ تیس ہزار روپے سالانہ کے لگ بھگ ہوگا ۔ اس رقم میں عملے کی تنخواہ ۔ پراونڈنٹ فنڈ ۔ عمارت کی دیکھ بھال ۔ تدریسی سامان ۔ کتب خانہ ۔ کھیلیں وغیرہ سب کچھ شامل ہیں ۔

مشرقی پاکستان تعلیمی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ جو طلبہ چھٹی جماعت میں داخل ہوتے ہیں ان میں سے صرف ۵۰ فی صد دسویں جماعت تک پہنچتے ہیں ۔ یہ بات ذیل کے اعداد و شمار سے واضح ہو جاتی ہے ۔

(دوسری طرف ملاحظہ ہو)

ثانوی مدارس

جماعت	تعداد طلبہ	تناسب فی صد
چھٹی	۹۴۱۳۰	۲۸٫۲
ساتویں	۷۳۴۵۴	۲۲٫۵
آٹھویں	۶۴۹۱۹	۱۹٫۵
نویں	۵۱۷۲۴	۱۵٫۲
دسویں	۴۸۵۵۰	۱۴٫۶
	۳۳۲۸۸۹	۱۰۰٫۰

مشرقی پاکستان ثانوی تعلیمی بورڈ کے امتحان میٹرک ۱۹۵۷ کے نتائج نیچے درج کیے جاتے ہیں

امتحان میٹرک ۱۹۵۷ء کامیاب طلبہ

امیدواروں کی کل تعداد	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم	کل تعداد	فی صد تناسب
۴۱۶۶۲	۶۳۶	۵۷۷۳	۱۰۶۸۸	۱۷۰۹۷	۴۸٫۴

ان اعداد و شمار سے وسیع ضیاع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ناکام رہنے والے طلبہ کی تعداد خوفناک طور پر بھاری ہے اور کامیاب امیدواروں کی استعداد افسوسناک طور پر پست ہے۔

یہ اعداد و شمار طلبہ کی اس استعداد کی خبر دیتے ہیں جس کا اندازہ امتحانی مضامین کی شکل میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اکثر مدارس تعلیم کے ناقابل پیمائش اجزا مثلاً اقدار کے صحیح احساس کی ترقی وغیرہ کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔

ثانوی تعلیم کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان وسیع مقاصد کو پورا کرے جن کی طرف ملٹن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :- "لہذا میں اس تعلیم کو مکمل اور فیاض تعلیم کا نام دیتا ہوں جو آدمی کو اس قابل بنا دے کہ وہ انصاف کے ساتھ اور فیاضی کے ساتھ تمام ذاتی اور سرکاری فرائض اور زمانہ جنگ اور زمانہ امن کی ذمہ داریاں پوری کر سکے"

ایک جمہوریت میں فرد کو سہ گانہ قدر و قیمت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے:۔

(۱) بطور ایک انسان (۲) بطور ایک شہری (۳) بطور دولت پیدا کرنے والے کے لہذا نظام تعلیم کی منصوبہ بندی اس طور پر ہونی چاہیے کہ جسم۔ ذہن اور روح کی ہم آہنگ اور ہموار ترقی حاصل ہو اور ذاتی زندگی، شہری ذمہ داری اور نفع بخش کام کاج کے لیے تربیت مل جائے۔

ثانوی تعلیم کا فرض ہے کہ بچوں کی مختلف استعدادوں اور دلچسپیوں کے حسب حال متنوع نصاب پیش کریں۔ اسے چاہیے کہ بیشتر طلبہ کے لیے خود کفیل نصاب پیش کرے۔ کالج کی بنیادی کرانے والا نصاب صرف ذہین طلبہ کے لیے ہونا چاہیے جن کی لا محالہ کمی ہوگی۔

ہماری موجودہ معاشی حالت کا تقاضہ یہ ہے کہ ثانوی مدرسے میں گنے چنے طلبہ کو داخل کیا جائے تعداد کی دھن میں خوبی کو قربان نہ کر دینا چاہیے۔

ثانوی مدرسے کا نصاب بناتے وقت ہندوستانی ثانوی تعلیمی کمیشن کے مندرجہ ذیل مشورے کو سامنے رکھنا چاہیے:۔

بعض بنیادی مضامین طلبہ کے لیے لازمی ہونے چاہئیں خواہ ان کے دوسرے مضامین کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ یہ بنیادی مضامین مندرجہ ذیل ہونے چاہئیں:۔

(۱) زبانیں (۲) عام سائنس (۳) معاشرتی علوم (۴) ایک دست کاری۔

ثانوی نصاب کے متنوع حصے میں مضامین کے مندرجہ ذیل گروہ شامل ہونے چاہئیں:۔

(۱) انسانی علوم (۲) سائنسی علوم (۳) ٹیکنیکل علوم (۴) تجارتی علوم (۵) زرعی مضامین (۶) فنون لطیفہ (۷) خانہ داری کے مضامین۔ جب ضرورت محسوس ہو ان متنوع مضامین میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

بنیادی مضامین کا منشا ایک ایسی عام قسم کی تعلیم دینا ہے جس کی ضرورت ایک جدید جمہوریت میں خصوصیت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ عام تعلیم کے اس وسیع تصور پر مزید روشنی کے لیے ہارورڈ رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"چوں کہ کوئی شخص بھی تمام شعبوں کا ماہر نہیں بن سکتا اس لیے ہر شخص اس بات پر مجبور ہے کہ

اپنے ڈاکٹر کی رائے پر بھروسہ کرے۔ معمار کی رائے پر بھروسہ کریں ۱۰ اپنے وکیل کی رائے پر بھروسہ کرے ریڈیو مستری کی رائے پر بھروسہ کرے وغیرہ۔ لہٰذا مجھے اس فہم کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت ہے جو ایک ماہر اور ایک عطائی کے درمیان تمیز کر سکے اور اچھے اور برے ماہر کے درمیان فرق دیکھ سکے۔ اس نقطۂ نگاہ سے عام تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی وسیع تنقیدی نگاہ پیدا کر دے جو زندگی کے ہر میدان میں قابلیت کو پہچان سکے۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ تعلیم یافتہ شخص وہ ہے جو ایک اچھے آدمی کو دیکھتے ہی پہچان لے۔ ہر قسم کے کام کے الگ الگ معیار ہیں خواہ کام دستی ہو یا ذہنی یا فنی یا جمالیاتی۔ تعلیم یافتہ آدمی وہ ہے جو اپنے مخصوص میدان سے باہر بھی نیک و بد میں تمیز کر سکے۔ اس قسم کی عام تعلیم ایک جمہوریت میں خاص طور پر ضروری ہے۔ کیوں کہ یہاں عوام اپنے راہ نماؤں اور افسروں کا محاسبہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک عام آدمی میں اتنی سوجھ بوجھ ہونی چاہیے کہ وہ ظاہری شکل و صورت سے دھوکہ نہ کھا جائے اور صرف اسی نمائندے کو چنے جو اپنے میدان میں حقیقی طور پر قابل ہو" (آزاد معاشرے میں عام تعلیم)

اس ضمن میں انگلستان کے ثانوی نظامِ تعلیم کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں تین قسم کے ثانوی مدرسے ہیں (۱) علمی (۲) جدید (۳) ٹیکنیکل - علمی مدرسوں میں گرامر اسکول اور پبلک اسکول شامل ہیں۔ اور صرف یہی مدرسے بچوں کو یونیورسٹی تعلیم کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اسی طرح جرمنی کی وفاقی جمہوریہ میں بھی بیشتر بچے ایسے مدرسوں میں تعلیم ختم کرتے ہیں جو انگلستان کے جدید اور ٹیکنیکل مدرسوں کے صرف کوئی بارہ فی صد بچے علمی قسم کے مدرسوں میں تعلیم پا کر یونیورسٹی میں جاتے ہیں۔ ہندوستان بھی کم و بیش انہی خطوط پر اپنے مدرسے کی تعمیر نو کر رہا ہے۔ ہندوستانی منصوبہ یہ ہے کہ ہر بچے کو آٹھ سالہ بنیادی تعلیم دی جائے۔ اس کی پہلی منزل پانچ سالہ ہوگی اور یہ ادنیٰ بنیادی تعلیم کہلائے گی۔ اس ادنیٰ درجے کے بعد اسی فی صد بچے اعلیٰ بنیادی تعلیم حاصل کریں گے جس کا نصاب تین سالہ ہوگا۔ ادنیٰ بنیادی مدرسے کے صرف کوئی بیس فی صد بچے جو ذہین ہوں گے ثانوی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جا سکیں گے۔

ایک تجویز یہ ہے کہ نصابِ تعلیم کے موجودہ دس سالہ نصاب کو گیارہ سالہ بنا دیا جائے اور اس تجویز کا ایک حصہ یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ درجے کو ختم کر دیا جائے اور اس درجے کا ایک سال

ڈگری کے نصاب میں بڑھا دیا جائے لیکن اس تجویز کی راہ میں بعض شدید مشکلات درپیش ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم میں انٹرمیڈیایٹ درجے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انٹرمیڈیایٹ امتحان میں کامیاب ہونا صرف آرٹس اور سائنس کے ڈگری نصاب میں داخلہ لینے کے لیے ضروری ہے بلکہ بعض خاص مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیایٹ امتحان پاس کرنا میڈیکل، انجینئرنگ اور بعض دوسرے فنی نصابوں میں داخلہ کے لیے بھی ایک ضروری شرط ہے۔ انٹرمیڈیایٹ درجے کو ختم کر دینے سے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے داخلے میں سخت مشکلات پیش آئیں گی۔ حالت یہ ہے کہ موجودہ انٹرمیڈیایٹ سائنس کا نصاب بھی اعلیٰ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ اداروں میں داخلے کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا اس لیے اگر اس نصاب میں سے ایک سال کم کر دیا گیا تو ثانوی مدرسوں کے موجودہ پست معیاروں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کا اثر میڈیکل اور انجینئرنگ تعلیم پر بہت برا پڑے گا۔ انٹرمیڈیایٹ جماعتوں کے ختم کر دینے کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان جماعتوں کے طلبہ کی عمر سولہ اور اٹھارہ برس کے درمیان ہوتی ہے اور اس خام عمر میں ان کی تعلیم و تربیت مدرسی طریقوں اور مدرسی ضبط کے مطابق ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان نوخیز بچوں کا انٹرمیڈیایٹ کالجوں میں جمع ہونا صرف تعلیمی لحاظ سے غلط ہے بلکہ ضبط اور تعمیرِ کردار کے نقطۂ نگاہ سے بھی سخت قابلِ اعتراض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ڈگری کالجوں میں بھی یہ نوخیز بچے ہی تعداد کا بیشتر حصہ ہوتے ہیں اور ان کی مزاجی کیفیت سارے کالج کی فضا کو متاثر کرتی اور عموماً ہمارے کالجوں میں بے ضبطی پیدا کرتی ہے۔ اگر کالج میں ایسے میٹرک پاس طلبہ داخل ہونے لگیں جو موجودہ گیارہ سالہ ثانوی مدرسے سے آئیں تو اس سے صورتِ حال میں کوئی اصلاح نہ ہوگی۔ اگر ارادہ یہی ہے کہ مالی اسباب کے پیشِ نظر ڈگری کے لیے تعلیم کا کل عرصہ چودہ سال ہو جس میں سے دس سال مدرسے میں گذارے جائیں اور چار سال کالج میں، تو میرا خیال ہے کہ مسئلے کا یہ حل سخت ناپسندیدہ ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا چاہیے کہ انگلستان اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں طلبہ کی اٹھارہ سال کی عمر کے قریب یونیورسٹی میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس عمر سے پہلے انھیں اس قدر پختہ نہیں سمجھا جاتا کہ وہ یونیورسٹی طلبہ کے بالغ اور آزادیٔ عمل سے مناسب کام لے سکیں۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ڈھاکہ کے پرانے انٹرمیڈیٹ اور ثانوی بورڈ نے جو کمیشن مقرر کیا تھا، اس کی سفارش کے مطابق انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں طلبہ کی حد ۵۰ مقرر کی گئی تھی۔ تاکہ مدرسی طریقوں کے مطابق تعلیم دی جائے اور مناسب ضبط قائم رہے۔ ہمیں اس معاملے پر غور کرنا چاہیے کہ انٹرمیڈیٹ درجے کے لیے کس قسم کی تعلیم ہماری اپنی ضرورتوں کے حسب حال ثابت ہوگی۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کے انٹر یونیورسٹی بورڈ کا جو اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا وہاں ہندوستانی نمائندوں سے بات چیت کے بعد میں یہ رائے قائم کر سکا تھا کہ اگرچہ وہ عموماً اس اصول کو مان چکے ہیں کہ گیارہ سالہ ثانوی نصاب کے بعد تین سالہ ڈگری کا نصاب ہو۔ بہت سی یونیورسٹیاں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ انٹرمیڈیٹ درجہ باقی رکھا جائے۔ مگر اس کے نصاب میں مناسب ردوبدل ہو۔ جس کے برعکس جنوبی ہند کی یونیورسٹیاں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ ثانوی مدرسے کا نصاب ۱۲ سالہ ہو اور اس کے بعد ڈگری کا نصاب تین سالہ۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ثانوی تعلیم بارہ سالہ ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ تعلیم نہ صرف بچوں کی عمر اور ان کی پختگی کے حسب حال ہو بلکہ یہ ایک مکمل اکائی بھی ہو اور فارغ التحصیل طلبہ کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ حاصل کرنے کی قابلیت عطا کر سکے۔ جہاں تک ڈگری کے نصاب کا تعلق ہے اس کی لمبائی تین سال ہو سکتی ہے۔ اور اس کے بعد ایم۔اے کا نصاب ایک سال کا ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی تعلیم خاصے اونچے معیار کی ہونی چاہیے۔ تاکہ ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب ترقی یافتہ ملکوں کے نصابوں کا مقابلہ کر سکیں۔ یہاں بھی داخلہ کڑے انتخاب کے بعد ہونا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں تعلیم کی خوبی کو تعداد پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ بین الاقوامی تعاون بلکہ سائنسی اور تعلیمی مقابلے کے اس دور میں ہمیں مقررہ معیار برقرار رکھنا چاہیے تاکہ ہمارے گریجوایٹ غیر ملکی گریجوایٹوں کے ساتھ اچھی طرح مقابلہ کر سکیں اور وسیع تر قومی مفاد کو ترقی دے سکیں۔ کیوں کہ یہی لوگ قومی زندگی کے مختلف میدانوں میں رہنمائی کے فرائض دیں گے اس ضمن میں پروفیسر اے این وائٹ ہیڈ کے مندرجہ ذیل الفاظ پیش نظر رہنے چاہئیں:۔

"جدید زندگی کے حالات میں یہ قاعدہ بالکل قطعی ہے۔ جو قوم تربیت یافتہ ذہن کی قدر نہیں کرتی اس کا خاتمہ یقینی ہے"

ذیل میں ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسٹیوں کے نتائج درج کیے جاتے ہیں ان سے پتہ چلے گا کہ کامیابی کا تناسب اور کامیاب طلبہ کی استعداد کس قدر افسوس ناک ہے ۔

راج شاہی یونیورسٹی کے نتائج ۱۹۵۷ء

نام امتحان	امیدواروں کی تعداد	کامیاب ہونیوالوں کی تعداد	تناسب فیصد
انٹر (آرٹس)	۲۳۲۱	۵۹۴	۲۵ء۶ فیصد
انٹر (سائنس)	۹۵۸	۲۶۷	۲۷ء۹ "
انٹر (کامرس)	۳۰۹	۹۵	۳۰ء۸ "
بی۔ اے	۹۳۶	۲۲۲	۲۳ء۸ "
بی۔ ایس سی	۲۱۷	۹۳	۴۳ "
بی۔ کام	۱۰۵	۵۵	۵۲ء۴ "

ڈھاکہ یونیورسٹی کے نتائج ۱۹۵۷ء

نام امتحان	امیدواروں کی تعداد	کامیاب ہونیوالوں کی تعداد	تناسب فیصد
انٹر (آرٹس)	۵۰۰۱	۲۰۷۱	۴۱ء۴ "
انٹر (سائنس)	۲۰۴۸	۸۲۰	۴۰ "
انٹر (کامرس)	۱۴۷۳	۵۰۷	۳۴ "
بی۔ اے	۱۹۶۵	۵۹۹	۳۰ء۵ "
بی۔ ایس سی	۴۹۲	۲۶۷	۵۴ "
بی۔ کام	۶۲۲	۲۴۶	۳۰ء۴ "

ڈگری کالجوں کے سلسلے میں ان ملحقہ کالجوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ملک کے مختلف حصوں میں واقع ہیں، اور طلبہ کو مختلف حصوں میں واقع ہیں اور طلبہ کو مختلف یونیورسٹی امتحانوں کے لیے تیار کرتے ہیں ان امتحانوں کے نصاب کلی طور پر یونیورسٹی تیار کرتی ہے۔ یہ امتحان خارجی امتحانوں کے زیر اثر تیار کیے جاتے ہیں۔ کالج جو پڑھائی کا کام انجام دیتے ہیں انھیں نہ ہی نصاب بنانے میں کوئی دخل حاصل ہے

اور نہ ہی امتحانی سوال وضع کرنے اور نتائج مرتب کرنے میں کوئی دخل. ملحقہ کالجوں کا نظام جو خارجی امتحان کی پیداوار ہے بے حد مضر ثابت ہوا ہے. اس نے کالجوں کو امتحانی تیاری کے مرکزوں میں تبدیل کر دیا ہے جہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ بیشتر کالج صرف عام ڈگری کی سطح تک تعلیم دیتے ہیں. ان کے پاس نہ ایسے استاد ہیں اور نہ ہی ایسی سہولتیں کہ کسی قسم کا تحقیقی کام کیا جا سکے. بلکہ عام جماعتوں میں استادوں کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ اپنے اپنے مضامین میں جدید ترین معلومات سے باخبر رہیں. نتیجہ یہ ہے کہ تدریسی کام فرسودہ وضع کا رہتا ہے. تدریس نہ صرف بے جان رہتی ہے بلکہ اکثر حالتوں میں اس کی معلوماتی سطح بھی جدید حقائق کا ساتھ نہیں دیتی. اس صورت حال کا علاج یہ ہے کہ ملحقہ کالجوں کی تعداد گھٹا دی جائے اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ان کے اساتذہ. ان کی تدریسی سہولتوں اور مکانیت کو بہتر بنایا جائے تاکہ ان تعلیمی اداروں کی حالت یونیورسٹی کام کے حسب حال ہو جائے. مثلاً مشرقی پاکستان کے ہر ضلعی صدر مقام میں ایک اچھا ڈگری کالج قائم کیا جا سکتا ہے. سردست یہ کالج آرز درجہ تک ڈگری تعلیم دے سکتے ہیں لیکن جس قدر جلد ممکن ہو ان کالجوں کو یونیورسٹی کالجوں کے درجے تک بلند کر دینا چاہیے جس طرح برطانیہ میں کیا گیا ہے. یہ کالج یونیورسٹی کالجوں کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک درمیانی منزل ہے. بالآخر ان کالجوں کو یونیورسٹیوں میں تبدیل ہو جانا چاہیے. ہمارے اکثر کالج صرف آرٹس مضامین پڑھاتے ہیں سائنس بہت تھوڑے کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے جس کی وجہ استادوں اور ساز و سامان کی کمی ہے ملکی مفاد کے پیش نظر ضروری ہے کہ تمام کالجوں میں سائنس کی تدریس کا فوری بندوبست کیا جائے اور اس مطلب کے لیے ان کی مکانیت. ان کے کتب خانوں. تجربہ گاہوں اور دوسرے لوازمات میں اضافہ کیا جائے.

یہ امر افسوس ناک ہے کہ ٹکنالوجی اور طب کی تدریس کے لیے ہمارے یہاں کافی سہولتیں موجود نہیں. یہ امر بہت اہم ہے کہ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے میدانوں کو موزوں توجہ دی جائے.

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے یہ ہر ایک کے لیے لازمی بھی ہونی چاہیے اور مفت بھی لیکن ثانوی اور اعلیٰ تعلیم گنے چنے طلبہ کے لیے مخصوص ہونی چاہیے.

یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی پیداوار اور کاروبار کے مختلف میدانوں کے

درمیان ہم آہنگی موجود ہو۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں آرٹس کے گریجوایٹ بیکاری کا شکار ہو رہے ہیں وہاں سائنس داں، ڈاکٹروں اور انجینیروں کی ابھی سخت کمی ہے۔

یونیورسٹی گریجوایٹوں کی موجودہ بے کاری بلکہ غلط کاری کی حالت اس سے بھی بدتر ہے جس کا نقشہ ۱۹۴۳ء میں مرکزی تعلیمی مشاورتی کمیٹی نے کھینچا تھا۔ آزادی کی آمد کے چند سال بعد تک یونیورسٹی گریجوایٹ نئی ریاست کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے جذب ہوتے رہے۔ مگر آرٹس گریجوایٹوں کی بیکاری کا مسئلہ اب پھر ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ عالمی حالات میں نام نہاد تعلیم یافتہ طبقے کی بے کاری کسی معاشرے کے لیے ایک خوفناک خطرہ ہے۔ ایک ایسا خطرہ جو ہر وقت سر پہ منڈلاتا رہتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری محکموں میں کلرکی کی آسامیوں کے لیے بھی درجنوں یونیورسٹی گریجوایٹ امیدوار ہوتے ہیں وہ آسامیاں جنھیں میٹرک پاس امیدوار بخوبی پُر کر سکتے ہیں گریجوایٹوں سے پُر کی جا رہی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بہت سے گریجوایٹ ایسی آسامیوں پہ کام کر رہے ہیں جو نہ ان کی تعلیمی استعداد کے حسب حال ہے اور نہ اس وقت اور خرچ کے حسب حال جو انھوں نے تعلیم پہ صرف کیا۔

ذیل کے اقتباس سے برطانیہ عظمیٰ کے فکری رجحان کا پتہ چلے گا۔ یہ وہ ملک ہے جہاں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی وساطت سے اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رکھا گیا ہے۔ "یہ بات اہم ہے کہ سائنس دانوں، ڈاکٹروں اور ماہرین ٹکنالوجی کی تربیت کرنے کے علاوہ یونیورسٹی تربیت یافتہ ذہن اور وسیع ثقافت رکھنے والے آدمی اور عورتیں پیدا کرے جو معاشرتی مسائل حل کر سکیں۔ ملکی معاملات کا انتظام کر سکیں اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو ایک نیا حسن عطا کر سکیں"۔

تاہم یہ بات پسندیدہ ہے کہ تمام شعبوں کی پیداوار بڑھانے کی طرف بھی کچھ توجہ دی جائے۔ کیوں کہ اگرچہ یونیورسٹی تعلیم سے استفادہ کرنے کے مواقع زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو ملنے چاہئیں۔ لیکن اگر بہت سے گریجوایٹوں کو کام نہ مل سکے یا غلط قسم کا کام مل سکے تو اس سے بددلی اور مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس ضمن میں اس رپورٹ کا ایک اقتباس پیش کرنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا جو ۱۹۴۲ء میں مقررشدہ ثانوی مدرسوں کی امتحانی کمیٹی نے بورڈ آف ایجوکیشن کے صدر کو پیش کی تھی۔

یونیورسٹیاں اور کالج:۔ ہمیں اس بات کی خاص طور پر فکر ہے کہ کسی ایسے طریق کار کی سفارش نہ کر دی جائے جو ذہنی قابلیت یا یونیورسٹی گریجوایٹوں کے تعلیمی معیاروں کو پست کر دینے والی ہو۔ ہم کوئی ایسی تجویز پیش کرنا نہیں چاہتے جو ملک کو معمولی استعداد کے گریجوایٹوں سے بھر دے۔ ایسے لوگوں کے لیے مابعد کی زندگی میں موزوں کام تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یورپ کے ملکوں کو تلخ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی بیکاری کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یورپ کا یہ سبق اس ملک میں نظر انداز نہ ہونا چاہیے"۔

اس بات کا شدید احساس موجود ہے کہ جو لوگ یونیورسٹیوں میں داخلہ کرنے اور ان کے طلبہ کو فارغ التحصیل کرنے کے لیے ذمہ دار ہیں وہ اس بات کا انتظام کریں کہ یونیورسٹیوں کی پیداوار اور ملکی ضرورتوں اور خالی جگہوں کے درمیان ہم آہنگی موجود رہے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے داخلہ لینے والے نوجوانوں کی موزوں رہنمائی ہونی چاہیے تاکہ وہ ایسے مضامین لیں جن کی ملک کو فی الواقع ضرورت ہو۔

جو طلبہ اپنی ذہانت اور فطری میلان کے باعث اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں کافی مالی امداد ملنی چاہیے تاکہ کوئی مستحق طالب علم ضروری سہولتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ یا کوئی طالب علم اپنے والدین یا سرپرستوں کے افلاس کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ ایک جمہوریت میں اس قسم کا انتظام ضرور ہونا چاہیے کہ ہر ایک کو اہلیت کے مطابق تعلیمی مواقع میسر آسکیں۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں آبادی اور رقبے کی نسبت سے یونیورسٹیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ نیز وہاں ذرائع رسل و رسائل بھی بہتر اور آسان تر ہیں۔ ہمیں بھی اپنی اعلیٰ تعلیم کو اس طور پر منظم کرنا چاہیے کہ ملحقہ کالجوں کا فرسودہ نظام ختم ہو جائے اور موزوں مقامات پر پہلے یونیورسٹی کالج اور پھر یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں۔ ذرائع اور وسائل کی ہمارے ہاں جو کمی ہے اس کے پیش نظر مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ یہ عمل رفتہ رفتہ ہی مکمل ہونا چاہیے۔ تاہم یہ آخری مقصد اور منزل کا تاثر پیش نگاہ رہنی چاہیے۔ تاکہ ہمارے تعلیمی منصوبے اور پروگرام صحیح سمت میں حرکت کریں۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے خاص خاص یونیورسٹیوں کے معاملات کی تحقیق کے لیے کمیشن اور کمیٹیاں مقرر کی تھیں۔ پلاننگ بورڈ نے بھی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے منصوبے تیار کیے ہیں۔ تاہم اعلیٰ تعلیم کے

قومی مسائل کا ہمہ گیر جائزہ لینے اور کل پاکستان سطح پر ان مسائل کی جزئیات کا جائزہ لینے نیز متعلقہ منصوبوں کو ملکی سطح پر عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک یونیورسٹی گرانٹ کمیشن قائم کیا جائے ۔

پلاننگ بورڈ نے سفارش کی تھی کہ برطانوی یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے نمونے پر یہاں بھی ایک یونیورسٹی گرانٹ کمیشن آئینی طور پر قائم کیا جائے ۔ پاکستان کے انٹر یونیورسٹی بورڈ نے بھی بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اس قسم کا کمیشن فوراً قائم کر دیا جائے تاکہ ملک میں اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت عمل میں آسکے اور یہ بھی ممکن ہو جائے کہ یونیورسٹیاں اپنی اپنی جگہ خود مختار اداروں کے طور پر کام کر سکیں صوبائی اور مرکزی حکومتیں مالی امداد دینے کے بہانے ان کے معاملات میں دخل نہ دے سکیں ۔ پاکستان جیسے نوخیز جمہوری ملک کے لیے جہاں غلط قسم کی روایات ابھی باقی ہیں، یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا سا آئینی ادارہ جلد از جلد وجود میں آئے ۔ یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارا ہمسایہ ملک ہندوستان جس کے حالات کم و بیش ہمارے جیسے ہی ہیں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن مقرر کر چکا ہے ۔ اور یہ کمیشن گذشتہ چند سال سے بہت تسلی بخش خدمات انجام دے رہا ہے ۔

سوالات

محمد عبدالعزیز

مسلسل نمبر ۲

اچھے سوالات کی خصوصیات

سوال واضح ہو

طلبہ کلاس میں بظاہر آمادۂ کار بیٹھے سمجھے جاتے ہیں۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان کے لیے تادیر بانوجہ بیٹھے رہنا ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ انھیں بہت سی باتیں یاد رہیں۔ سوال پوچھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ سوال مختصر اور واضح ہو۔ ورنہ سوال میں تین قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں ایک انحراف توجہ کی اور دوسری یادداشت کی۔ اگر ایجاز و اختصار کے ساتھ معنی کی وضاحت کر دی جائے تو طلبہ تھوڑی سی کاوش کے بعد اس کا جواب موزوں کر سکتے ہیں۔

سوال فکر انگیز ہو

سوال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ایسے سوالات جن کا تعلق یادداشت سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن کا مقصد طلبہ کی صلاحیتوں کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مدرس کی توجہ کا مرکز موخرالذکر قسم کے سوال ہوں تو طلبہ کے ذہنوں کو متنوع کیا جا سکتا ہے۔

سوال مبہم نہ ہو

جو سوال پوچھا جائے وہ غیر مبہم ہو۔ اگرچہ سوالات کے سلسلے میں سب سے مشکل مرحلہ یہی ہوتا ہے بعض اوقات بڑے تجربہ کار مدرس کو بھی یہی دقت درپیش ہوتی ہے۔ سوال مبہم ہو تو سننے والوں کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے الفاظ اس قسم کے ہوں کہ اس سے وہی معنی مرتب ہوں جو کہنے والا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن چوں کہ خیالات نتیجہ ہوتے ہیں انسان کے اپنے ذاتی تجربوں کا اور کبھی کسی دو فرد کے تجربے یکساں نہیں ہوتے اس لیے اگر الفاظ و معانی میں اختلاف ہو جائے تو تعجب نہیں اس کے باوجود کوشش

یہی ہونی چاہیے کہ الفاظ اور ترتیب الفاظ میں ابہام نہ ہو۔

سوال طلبہ کی عمر اور اہلیت کے مطابق ہو

بچوں کی اہلیت میں فرق ہوتا ہے۔ ذہنی لحاظ سے ابتدائی مدارس کے طلبہ ثانوی مدارس کے طلبہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی فہم وفراست اور سوجھ بوجھ میں بڑی آسانی سے حد فاصل قائم کی جا سکتی ہے ان حالات میں جو سوال دس سال کی عمر کے طلبہ سے پوچھے جا سکتے ہیں۔ وہی سوال چودہ سال کی عمر کے طلبہ سے پوچھنا صحیح نہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی عمر کے طلبہ میں ایسا ذہنی تفاوت ہوتا ہے کہ ان سے ایک معیار کے سوال نہیں پوچھے جا سکتے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ کا گھریلو ماحول بھی ان کی ذہنی بلندی و پستی کی تعین کرتا ہے۔ آداب و اطوار میں اچھے گھر کے بچے برے گھر کے بچوں سے یقیناً بہتر ہوں گے، اور جن طلبہ کو سیر و سیاحت اور دوسرے سماجی مشاغل میں حصہ لینے کا زیادہ موقع ملتا ہے انکی معلومات دوسروں سے زیادہ متنوع ہوں گی سوال پوچھتے وقت مدرس کو ان حقائق کو بھولنا نہیں چاہیے۔

سوال میں جواب کا اشارہ نہ ہو

بعض اوقات مدرس اس قسم کے سوال پوچھ لیتا ہے جن کا جواب ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔ کیا لاہور دریائے راوی کے کنارے آباد نہیں ہے؟ ایسے سوالات سے نہ بچوں کی ذہنی ورزش ہوتی ہے اور نہ وہ صحیح انداز میں کسی چیز کے سوچنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے سوالات مدرس بالعموم غیر شعوری طور پر پوچھ لیتے ہیں اور اس کا انھیں اس وقت اندازہ ہوتا ہے جب بچہ جواب دیتا ہے۔

جواب ہاں یا نہیں نہ ہو؟

اس سے ملتی جلتی جوابات کی دوسری قسم ہے۔ ایسے سوالات کی صورت میں طلبہ اٹکل سے جواب دے دیتے ہیں اس میں ۵۰ فی صد صحیح ہونے کا امکان ہوتا ہے ۵۰ فی صد جواب غلط ہو سکتے ہیں لیکن جب بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اٹکل سے بھی ایک جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ کوشش کرنے سے حدًا اجتناب کرنے لگیں گے اور یہ اقدام تعلیم کے منافی ہوگا

سوال میں ایک خیال ہو۔ سوال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ طالب علم سے بیک وقت ایک ہی چیز پوچھی جائے

اگر ایک سوال میں دو یا دو سے زیادہ خیالات گڈمڈ ہوں گے تو اس کا نتیجہ کبھی بہتر نہیں ہو سکتا۔ اول تو یہ کہ طلبہ اس کی خود تشریح نہیں کر سکیں گے اور دوم یہ کہ اس کا جواب خاصہ طویل ہوگا۔ ایسی صورت میں مدرس کو مجبوراً سوال دو یا تین حصوں میں تقسیم کر دینا پڑتا ہے۔ اس سے ایک نقص تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ ایک قسم کے ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کلاس کا وقت ضائع ہوتا ہے اور ان میں دوبارہ ذوقِ تعلیم پیدا کرنا پڑتا ہے۔

سوال کا ایک مخصوص مقصد ہو

ہم جو کام کرتے ہیں اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ سوال کا بھی مقصد ہونا چاہیے۔ اگر اس کی تہ میں کوئی مقصد نہیں تو اس سوال کی اپنی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ سوال کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ مدرس اور طلبہ دونوں کے پیشِ نظر ایک منزل ہو، اور اس کا نصاب اور سبق سے گہرا تعلق ہو۔ اگر ایک بے معنی اور مبہم سوال پوچھ لیا جائے تو بجائے اس کے کہ اس کا کلاس پر عمدہ اثر پڑے، اس سے طلبہ کا رہا سہا ذوق بھی مجروح ہو جاتا ہے۔ اگر مدرس ایسے سوالات سے اغماض کرے تو طلبہ کا بہت سا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور مدرس اور معلمین دونوں ایک گورکھ دھندے سے نکل کر خوش کامی کی فضا میں سانس لے سکیں گے۔

سوال میں کتابی الفاظ نہ ہوں

بعض مدرس سوال پوچھتے وقت غیر شعوری طور پر کتاب کے الفاظ، ترکیبیں اور جملے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کرنا طلبہ کے لیے مفید نہیں۔ اس سے ایک تو بغیر سوچے سمجھے یاد کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور اس سے تعلم کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک یہ اندیشہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ مدرس اور طالب علم دونوں کو یہ غلط فہمی رہے کہ پڑھنے والے کو بہت کچھ آتا ہے۔ اس میں قوتِ فکر بھی ہے اور قوتِ بیان بھی۔ اگرچہ یہ دونوں غلط۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ متعلم نے کچھ پڑھا ہے، اس سے کچھ اخذ بھی کیا ہے یہ ضروری ہے کہ سوال کے الفاظ یا کم از کم ترتیب الفاظ ایسی ہو جو نصابی کتاب سے ذرا مختلف ہو۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ طالب علم کو غور و خوض کرنے کی عادت پڑ جائے گی، اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ان خیالات پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

مدرس اور سوالات

ہمارے مروجہ طریق تعلیم میں سوال پوچھنے کا حق مدرس کو ہوتا ہے۔ طلبہ یا تو سوال پوچھتے ہی نہیں اور یا اکا دکا کسی نے کچھ پوچھ لیا تو یا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا جاتا ہے اور اگر مدرس میں قدرے تجدد کی جھلک ہوئی تو ہاں یا نہیں میں ایک مبہم سا جواب مل جاتا ہے۔ اگرچہ یہ اصول صحیح نہیں لیکن چوں کہ ہمارے مدرسوں میں اس کا رواج ہے اس کا اس پہلو سے جائزہ لینا کہ سوال پوچھتے وقت مدرس کو کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، ضروری ہے۔

مدرس کا تخاطب سب سے ہو۔

مروجہ طریق تعلیم میں مدرس ایک فرد کو نہیں ساری جماعت کو پڑھاتا ہے جس میں تیس چالیس اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طالب علم ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کسی طالب علم کی طرف اشارہ کر کے سوال پوچھا جائے تو اس سے جماعت کو فائدہ پہنچنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ انفرادی طور پر کسی ایک سے نہیں بلکہ ساری جماعت سے سوال پوچھنے میں تین فائدے ہیں۔ اول یہ کہ اس سے ساری جماعت کی توجہ مدرس کی جانب مبذول ہو جاتی ہے اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر سوال سنتے ہیں اور تھوڑی سی غور و فکر کے بعد جواب دینے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ اس میں ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ بعض ایسے طلبہ جو سبق سے بے توجہ، ہوا یں واں ہو جاتے ہیں۔ ان میں بھی ایک مرتبہ پھر جھرجھری سی ہوتی ہے، مبادا مدرس کی نگاہ تیز انھیں پہ پڑ جائے۔ اور بالعموم ایسا ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ اس طرح ہر طالب علم کو غور و فکر کا موقع ملتا ہے اور وہ ایک جواب سوچ لیتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ جواب غیر مکمل اور قدرے مبہم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر مدرس یہ کہے کہ احمد یہ بتاؤ کہ پانی پت کی تیسری لڑائی کن کے مابین ہوئی تھی تو ساری کلاس ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے گی کہ یہ تو احمد کا کام ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ احمد کے علاوہ چند مخصوص محنتی بچے ہی اس سوال کی طرف توجہ دیں گے۔ باقی طلبہ خاموش و ساکت بیٹھے رہیں گے۔ اس طرح اس سے فائدہ کی بجائے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ سوم یہ کہ قدرے توقف کے بعد جب مدرس دو تین طالب علموں سے پوچھتا ہے اور کلاس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جواب تشنہ ہیں یا یہ کہ مدرس مطمئن نہیں ہے تو ایک تنقیدی فضا پیدا ہو جاتی ہے

اور طلبہ اس سوال پر زرا اور تفحص کرتے ہیں اور جہاں اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی تو ذہنی گہما گہمی اور بڑھ جاتی ہے۔ اور تعلیم کا یہی سب سے بڑا اور اہم مقصد ہے۔

سوالات کی تقسیم مساوی ہو

ہمارے مدرسوں میں مروجہ طریقہ یہ ہے کہ مدرس پہلے تو کم زور طلبہ کو اپنا ہدف بناتا ہے اور جب وہ لعنتی صورت بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ انھیں سخت وسست کہتا ہے اور ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ جب مدرس کی انا مطمئن ہو گئی تو وہ چند ہوشیار اور ذہین طلبہ سے رجوع کرتا ہے اور فی الفور اور معاملہ جواب مل جاتا ہے۔ لیکن من حیث المجموع جماعت استفادہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے اگر مدرس وقتاً فوقتاً مختلف طالب علموں سے سوال پوچھتا ہے تو بہتر ہے۔ کبھی احمد سے کبھی محمود سے کبھی سالک سے کبھی جعفر سے۔

مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ مدرس کے پاس طلبہ کی ایک فہرست ہو جس میں بہت اچھے، اچھے، متوسط، برے اور بہت برے طلبہ کے نام علاحدہ علاحدہ درج ہوں۔ اس سے مدرس کو یہ آسانی ہو گی کہ کوئی طالب علم بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں جا سکے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر طالب علم سے روزانہ سوال ضرور پوچھا جائے۔ بالخصوص جن جماعتوں میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو اس قسم کی تقسیم ممکن نہیں۔ دیہاتی مدرسوں میں ذریق وار تعداد بعض اوقات ستر اور سو تک پہنچ جاتی ہے۔ ان حالات میں یہ اصولی باتیں موہوم معلوم ہوتی ہیں لیکن ایک اچھا مدرس اس انبوہ میں بھی کام کی باتیں کر لیتا ہے۔ بہر صورت اس ضمن میں کوئی حتمی اور آخری بات نہیں کہی جا سکتی۔ اصول کی افادیت اپنی جگہ پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسے کس موقع پر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

جواب کے لیے کافی وقت دینا چاہیے

پڑھاتے وقت سوال کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ ایک سوال سے دوسرے سوال کی ترغیب ہوتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقفے میں جاری رہتا ہے۔ لیکن اگر مدرس کی یہ آرزو ہو کہ سوال کے الفاظ ختم بھی نہ ہوں اور طلبہ کے پاس ایک میکانکی قسم کا جواب موجود ہو تو یہ نہ تو طلبہ کی کوئی خدمت ہو گی اور نہ اس سے تعلیم ہی کا کوئی مقصد حل ہو سکے گا۔ سوال کے بعد ایک ہلکا سا توقف ناگزیر ہے۔ تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اس کا جواب دے سکیں۔

ایسا جواب جو مبہم اور بے معنی نہ ہو۔

بعض مدرس قدرے عجلت سے کام لیتے ہیں اور چوں کہ سوال سے پہلے ان کے ذہن میں اس کا جواب موجود ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خود جواب سننے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ طالب علم کو بہر صورت وقت چاہیے۔ اس وقت بھی جب کہ اس کے پاس مواد کا ایک وافر ذخیرہ ہو اس کے پاس اتنا وقت ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنے اس ذخیرے سے متوقع معلومات کو ترتیب دے کر اچھے الفاظ میں پیش کر سکے۔ یہ وقفہ کم از کم چودہ اور زیادہ سے زیادہ بیس سکنڈ کا ہونا چاہیے۔

مرکزی خیالات پر سوالات کی تنظیم

دوران تدریس میں سوالات کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ جزئیات کی تشریح ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کم زور طلبہ انھیں جزئیات ہی میں گم ہو جائیں اور اصل کی جانب رجوع ہی نہ کریں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ سوالات موضوع کی چند بنیادی باتوں پر مشتمل ہوں۔ انھیں طلبہ کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جائے کہ ان کی ذہنی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ خیالات کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے ان کے جذبات مرتعش ہوتے رہیں اور ایک ہمہ گیری سی قائم رہے۔

تکرار سے احتراز

مدرس بعض اوقات عادتاً اور بعض اوقات کلاس کے اصرار پر سوال دہرا دیتا ہے۔ سوال یا جواب دونوں کا دہرانا مستحسن نہیں۔ طلبہ بالعموم متوقع ہوتے ہیں کہ سوال ایک بار دہرا دیا جائے یوں تو دہرانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اس سے طلبہ عادی ہو جاتے ہیں اور یہ چیز رفتہ رفتہ انحراف توجہ کا باعث ہو جاتی ہے اور مکرر کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ اس کا تجربہ ثانوی مدارس ہی میں نہیں اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر شروع ہی سے انھیں توجہ سے سننے کی تربیت دی جائے تو بڑی جماعتوں میں پہنچ کر وہ انحراف توجہ کے اتنے شکار نہ ہوں۔ اس سے صرف ایک ہی طالب علم کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بھی اس کی بے توجہی کا خمیازہ بھگتتے ہیں۔ وہ اپنی عدم توجہی کا ازالہ اس صورت میں کرتا ہے کہ اپنے پڑوسی سے پوچھتا ہے کہ میاں ماسٹر صاحب نے کیا پوچھا اور

اگر ایک کلاس میں اس قسم کے دس بارہ لڑکے ہوئے تو اس سے کم از کم تینوں کا اور نقصان ہونے کا احتمال ہے۔ لیکن اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ سوال کی صدائے بازگشت ممکن نہیں تو وہ توجہ سے بیٹھیں گے اور توجہ سے کام کریں گے۔

جواب کی صورت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ جب مدرس یا کوئی اور طالب علم کسی سوال کا جواب دے رہا ہو تو کلاس کا ہمہ تن گوش ہونا ضروری ہے۔ اگر طلبہ نے جواب غور سے نہ سنا تو ان میں تنقیدی تحسین کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ بولنے والے محتاط اور درست لہجے میں کوئی بات کر سکتا ہے۔

سوال پوچھنے میں خود اعتمادی ہو

سوال و جواب میں داد و ستد کی بات ہوتی ہے۔ سوال پوچھنے والا اور جواب دینے والا جب تک دونوں میں اعتماد نہ ہو تو اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے اس سے طلبہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کلاس کی فضا کو اتنا متوازن اور پرسکون بنا دیا جائے کہ دونوں اطمینان قلب کے ساتھ ایک بحث میں شریک ہو سکیں تو اس سے نہ صرف یہ کہ تعلم کی رفتار میں اضافہ ہوگا، بلکہ اس سے ذہن کی صحت مندتر تی ممکن ہو جائے گی۔

بعض باتیں استدلالی نقطہ نگاہ سے درست نہیں ہوتیں لیکن طلبہ کی نفسیات کے پیش نظر ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک طالب علم کسی سوال کا صحیح جواب نہ دے سکے، یا یہ کہ اس کا جواب ادھورا ہو۔ منطق اور استدلالی نقطہ نگاہ سے یہ درست نہیں کہ اس جواب کو قبول کیا جائے۔ لیکن نفسیاتی نقطہ نگاہ سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ دوسری مرتبہ وہ اس سے بہتر جواب دے سکتا ہے۔

بعض مدرس فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی بے چینی، ان کی گفتگو، نقل و حرکت اور چہرے بشرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک پرانے ہم کار ایک دو سوال پوچھنے کے بعد خود اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ اس وقت ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ آواز میں کرختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بچھلاوہ بن کر وہ ایک طالب علم کے پاس سے دوسرے طالب علم کے پاس پہنچتے ہیں۔ اس کی سرزنش اس کی زجر و توبیخ۔ غرض یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہتا ہے۔ اور سوال اس جذباتی اتار چڑھاؤ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ ندی اتر جاتی ہے تو لہروں کی ترک روی ایک سکون پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ان کی

اس روش سے الجھاؤ زیادہ ، ذہنی ترتیب و تنظیم کم پیدا ہوتی ہے۔

حالات سے مطابقت پیدا کرنا

حالات سے مطابقت پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اور مدرس کے لیے بعض اوقات اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ پڑھاتے وقت کیا صورت ہو گی۔ سوالات کس قسم کے پوچھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مدرس قبل از وقت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ متوقع حالات سے ہٹ کر اسے بعض نئے حالات کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اس کے لیے مدرس کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

یہ ضروری نہیں کہ سوال اشارات سبق کے عین مطابق ہوں۔ ممکن ہے آغاز سبق ہی میں کوئی ایسی غیر متوقع صورت پیدا ہو جائے کہ طلبہ کے طمانیت قلب کے لیے مدرس کو اپنا انداز استفسار بدلنا پڑے۔ اس لیے سوالوں کی ترتیب میں اگر ردو بدل کی جائے یا سرے سے دوسرے قسم کے سوال پوچھنے پڑ جائیں۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کے لیے مدرس میں ان جملہ صفات کا ہونا ضروری ہے جن کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا جا چکا ہے۔ مضمون پر قدرت ، خود اعتمادی۔ فکری تنوع اور اسی قسم کی دوسری خوبیاں جن کے بغیر مدرس غیر متوقع حالات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا بہت ضروری ہیں۔

طلبہ کے سوالات

ہمارے مدرسوں میں سوال کا حق صرف مدرس کو ہوتا ہے جو اصولاً غلط ہے۔ سوال ہمیشہ اس شخص کو پوچھنا چاہیے جس کی معلومات کم ہوں اور ذوقِ جستجو اسے استفسار پر اکساتا ہو بعض باتیں دوسروں سے پوچھی جا سکتی ہیں اور بعض کی تلاش انسان کو از خود کرنی پڑتی ہے۔ بچے جو باتیں پوچھ کر اپنے ذوق معلومات کو تسکین دے سکتے ہیں اس سے بڑھ کر تعلیم کے لیے اور کوئی ہیچ نہیں ہو سکتا۔ جو نہیں جانتا اسے ان لوگوں سے سیکھنے دیجیے جو جانتے ہیں۔ تحصیل علم کا یہ طریقہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے۔ اس لیے اگر طلبہ کو سوال پوچھنے کا موقع دیا جائے تو رفتار ترقی بڑھ جاتی ہے۔ ایک اچھا مدرس اپنے طالب علموں کو صرف یہی نہیں کہ سوال کا موقع دیتا ہے بلکہ ان کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جائے اور مدرس کے پاس امداد طلب ہو کر آئے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اپنی مشکلات مدرس کے

سامنے بیان کر دیتا ہے اور تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد جو فضا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کے لیے ایک ایسی ذہنی خوراک ہوتی ہے جو اسے تا دیر اس علمی ماحول میں زندہ رکھ سکے گی۔

اس سلسلے میں چند باتیں ناگزیر ہیں جن کا خیال رکھنا مدرس کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً :-

طلبہ کی ہمت افزائی

۱۹۴۳ء میں استاذی محترم مسٹر آلوچ نے ہندوستان کی روایتی تعلیم اور طلبہ کی عمومی حالت کا ایک نظم (انگریزی) میں تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ امتحان سے پہلے طلبہ کی کیفیت پانی سے بھرے ہوئے جگ کی ہوتی ہے۔ امتحان میں وہ اس پانی کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں اور جب امتحان کے ہال سے باہر آتے ہیں تو ان کی کیفیت خالی جگ کی ہوتی ہے جس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ طلبہ کو غور و فکر کی تربیت ہی نہیں دی جاتی۔ اس صورت میں جو علم انھوں نے حاصل کیا اس کی حیثیت عارضی ہوتی ہے۔ عارضی اور بالکل عارضی۔ لیکن اس کے برعکس اگر طلبہ کو تحصیل علم میں شریک کار بنالیا جائے تو یہ عارضی تاثر مستقل اور دیرپا ہو جاتا ہے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ طلبہ کو بولنے اور پوچھنے کا موقع دیا جائے ان کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ مزید معلومات کے لیے آگے بڑھیں اور جو کچھ انھیں نہیں آتا اس کے پوچھنے میں تامل نہ کریں۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے کہ طلبہ تعلیم میں ذوق و شوق سے حصہ لے رہے ہیں تو مدرس کا یہ یقین کہ ان کا یہ اقدام منزل کی جانب ہے صحیح ہوگا

سوال فروعی نہ ہوں

اس ضمن میں مدرس کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ سوالات موزوں اور اہم ہوں۔ بے معنی اور دور از کار سوالات سے تو احتراز کرنا مناسب ہوتا ہے۔ پڑھاتے وقت بالعموم طلبہ کچھ سوالات پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سوالات موضوع سے ہٹے ہوئے ہوں یا اس کے کسی غیر اہم پہلو سے متعلق ہوں تو ایسے سوالات دراصل طلبہ کو ناپختہ کاری اور ناتجربہ کاری کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لیکن تدریس کی تیز روی میں فروعی اور غیر فروعی سوالات میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں مدرس کو کیا کرنا چاہیے طلبہ کو سوال پوچھنے کی اجازت ہو یا انھیں اس کا حق نہ ہو۔ موخر الذکر حد بندی اصولاً غلط ہوگی۔ اس سے

تعلم کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ بہتر ہو گا کہ مدرس حتی الامکان ان میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کرے اور حسب ضرورت طلبہ کی رہ نمائی کرے کہ یہ سوال موزوں نہیں اور یہ سوال غیر ضروری ہے۔ یا اس میں یہ قباحت ہے۔ اسے اگر یوں پوچھا جائے تو مناسب تھا۔

سوال کی اہمیت کا عرفان

بعض اوقات ایسے سوالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کو اگرچہ سبق سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے بعض پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوال موضوع زیر بحث سے غیر متعلق ہو۔ لیکن اس کی افادیت مسلم ہو۔ ایسے سوالات جن سے ساری کلاس مستفیض ہو سکتی ہے۔ اگر ان پر تبصرہ کیا جائے تو بے محل نہ ہو گا۔

مدرس سے اختلاف

روایتی طریق تدریس میں اور بالخصوص پاکستانی مدرسوں میں مدرس سے اختلاف غالباً گناہ کبیرہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر طالب علم اختلاف کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن چند طالب علم ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں اتنی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ موضوع زیر بحث کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔ ایسے طلبہ کو اختلاف اور بحث کا موقع دینا لازمی ہے۔ اگر مدرس ان کی تنقید برداشت نہیں کر سکتا تو یہ اس کی کوتاہ اندیشی ہے۔ دراصل اختلاف نکتہ چینی نہیں ہوتی، بلکہ ایک چیز کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھنا اور اس پر نقد و تبصرہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر مدرس اپنے طالب علموں میں یہ ذوق تنقید پیدا کر دے تو یہ تعلیم و تعلم اور طلبہ اور قوم کی بہت بڑی خدمت ہے۔ مدرس کی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا ایک میکانکی عمل بن جاتا ہے۔ اس سے تعلیم مفقود نہیں ہوتی، اسے اختلاف کرنے دیجیے۔ اس سے آپ کے بھی بعض تاریک گوشے روشن ہو جائیں گے۔

عدم معلومات کا اعتراف

ہمارے ملک میں اب تک مدرسہ اور اس کے ماحول میں مدرسین کی عزت کا ایک جھوٹا خول منڈھا ہوا ہے اور طالب علم کے کسی سوال کا جواب نہ دینا اعتراف شکست کے مترادف ہوتا ہے اپنی

موہوم توقیر کی خاطر مدرسین کی اکثریت اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے یہ یاد رہے کہ طلبہ مدرس کی اس چابک دستی کو فوراً پہچان جاتے ہیں۔ اس لیے دانشمندی یہی ہے کہ جو بات اسے نہیں آتی اُس کا اعتراف کر لیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ مدرس کو سب کچھ آئے اور وہ سرچشمۂ دانش بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ جو بات اس سے پوچھی گئی ہے اس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی ہو۔ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس سے سابقہ پڑ جائے تو دیانت داری سے یہ کہہ دینا چاہیے کہ میاں میں اس کا جواب دینے سے اس وقت تک قاصر ہوں۔ دیکھ کر بتا سکتا ہوں یا اسی قسم کا کوئی اور موزوں جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس سے مدرس کا وقار گھٹتا نہیں بڑھتا ہے ؎

ہمارے مقاصدِ تعلیم

شمشاد لودھی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اطلبوا العلم من المھد الی اللحد" اس حدیث پاک میں علم سے مراد وہ عام اثرات ہیں جو انسان کے نفس پر مسلسل مرتسم ہوتے رہتے ہیں اور جن کی بدولت انسان اپنے ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہیں ہوتا تو مجبوراً ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ علم کا یہ مفہوم وسیع ہے اور عام طور پر علم کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ علم سے مراد وہ خاص اثرات لیے جاتے ہیں جو کسی قوم کے بالغ افراد خاص مقاصد کے پیش نظر بچوں پر ڈالنے کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں"۔ چناں چہ نپولین بونا پارٹ تعلیمی ادارے قائم کر کے اپنی قوم کے نوجوانوں کے ذہنوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا" اور میکالے اگر حکومت کے مصارف بچانے کے لیے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتا تھا، تو اسے یہ بھی الیقین تھا کہ اس کے مجوزہ طریقۂ تعلیم سے فیض یاب ہونے والے ہندوستانی نہ صرف یہ کہ مذہبی معاملات میں غیر متعصب رہیں گے۔ اور اگلی نسل تک ہندوستانیوں کا اپنے مذہب سے روایتی عشق معمولی دل چسپی میں تبدیل ہو جائے گا۔ بلکہ ایسے تعلیمیافتہ لوگ رنگ و نسل میں ہندوستانی لیکن ذہنی طور پر انگریز ہوں گے۔

آئیے علم کی اس تعریف کی روشنی میں تعلیم کے مقاصد کا جائزہ لیں۔ یعنی کہ تعلیم کے مقاصد کیا کیا سمجھے جاتے ہیں اور صحیح مقاصد کیا کیا ہونے چاہئیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی کے لیے تعلیم کے دو مقصد ہو سکتے ہیں اولاً زیادہ سے زیادہ واقفیت اور امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبروں کا حصول۔ دوم آئندہ پیشوں کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

لیکن یہ دونوں مقاصد زیادہ سے زیادہ جزوی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے میں حصول واقفیت بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں۔ اس میں جسمانی اور روحانی تربیت وغیرہ کا کوئی ذکر سرے سے

نہیں آتا۔

تعلیم کا معیار پرکھنے کے لیے قابلیت کو امتحانات کے ترازو میں تولنا، کتابی نظریۂ تعلیم کہلاتا ہے۔ جس میں واقفیت کے سوا انسانی زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ حالاں کہ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی چیز کے متعلق واقفیت ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ اس کا صحیح استعمال بھی ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی دائرۂ عمل میں بہترین کام انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کام کے متعلق صحیح ترین واقفیت بھی حاصل ہو۔ لیکن صحیح معلومات میں سے صحیح ترکیبِ عمل خود بخود پیدا نہیں ہوسکتی۔ ولیم جیمز کے الفاظ میں "شعبۂ وقوف اور شعبۂ احساس دونوں پر انسانی فطرت کا شعبۂ ارادی غالب ہے۔ اور یہ ارادہ اور ادراک مل کر دونوں اس لیے ہیں کہ عمل میں کام آسکیں"

سماج اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور ایسی جدوجہد کی ایک کڑی تعلیمی ادارے قائم کرنا ہے۔ لیکن ایک ہوش مند سوسائٹی کو ایسی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس میں ذہانت کی زمام اخلاقی اقدار کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بصورتِ دیگر بے لگام ذہانت سماج کے لیے سودمند ثابت ہونے کی بجائے وبالِ جان بھی ہوسکتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ ایک تعلیم یافتہ غنڈہ اَن پڑھ غنڈوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔

سائنسی ترقی کے زینوں پر چڑھتی ہوئی مذہبی و اخلاقی اقدار سے بے نیاز قوموں کے لیے علامہ اقبال نے اسی کلیے کے پیشِ نظر پیش گوئی کی ہے ؎

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صرف واقفیت کی فراہمی کسی اچھے تعلیمی نظام کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ واقفیت کا حصول سرے ہی سے بے کار ہے۔ اس کے برعکس ایک اچھے نظامِ تعلیم میں واقفیت کو صحیح مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک اہم ذریعے کے طور پر استعمال کرنا پڑے گا۔

اب رہا پیشوں کی تربیت سے متعلق مقصدِ تعلیم اس میں ایک خامی تو یہ ہے کہ کسی بچہ کے آئندہ پیشے کے متعلق پیش گوئی کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ چناں چہ اگر کسی بچے کو پہلے ہی دن سے صرف کسی خاص پیشے کے لیے تیار کیا جائے اور کسی خاص وجہ سے وہ بچہ بڑا ہو کر اس پیشہ کو اختیار نہ کر سکے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کسی کام کا بھی نہ رہے گا۔ چناں چہ ہمارے ہاں تعلیم کا سلسلہ بالعموم نوکری حاصل کرنے کی غرض سے شروع کیا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو کسی وجہ سے نوکری نہیں ملتی تو وہ دنیا میں کسی دوسرے کام کے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور نتیجہ کے طور پر وہ اپنے اور سوسائٹی کے لیے ایک بوجھ بن جاتے ہیں یاد رہے کہ اس سلسلہ میں جو تجربے ہوئے ہیں ان سے آئندہ پیشہ کے متعلق پیشن گوئی نہ کر سکنے کی توضیح ہوتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں گیارہ سال کی عمر کے بچوں کا ایک امتحان لیا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ کو سامنے رکھ کر بچوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اگر ایک گروہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں سمجھ کر گرائمر سکولوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں سے فارغ التحصیل ہونے پر انھیں یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا ہے دوسرے گروہ کو ذہنی اعتبار سے پست خیال کر کے سکینڈری ماڈرن سکولوں میں مختلف پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے جس کے بعد اس گروہ کے نوجوان کارخانوں میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ لیکن آج کل انگلستان کے ماہرین تعلیم شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ یہ تقسیم نفسیاتی لحاظ سے غلط ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گیارہ سال کی عمر میں نہ تو بچے کی ذہانت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ اس کے مستقبل کے صحیح پیشہ کا تعین کرنا ہی ممکن ہے چناں چہ لیسٹر شائر کے مقامی محکمۂ تعلیم نے اس تقسیم کے لیے گیارہ سال کی عمر کا امتحان ختم کر دیا ہے۔

بایں ہمہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ مستقبل قریب میں سائنس داں کوئی ایسا آلہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے آئندہ پیشہ کا صحیح پتہ چل سکے۔ تو بھی تعلیم کا یہ مقصد ناقص ہی رہے گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کسی ایک فن میں مہارت پیدا کرنا نہ صرف مشکل ہے بالکل بے سود بھی ہے۔ چناں چہ کسی ایسی قوم کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں جس کے افراد غور و فکر میں شب و روز محو رہیں۔ لیکن عزم و عمل سے انھیں کوئی سروکار نہ ہو۔ اسی طرح اس سوسائٹی کی زندگی کے دن بھی گنے جا چکے ہیں۔ جس کے افراد

...... ہر وقت عمل کے لیے تو کمربستہ نظر آئیں لیکن عقل سے کبھی کام نہ لے سکیں۔ علاوہ ازیں ایسی تعلیم کس کام کی جو ایک شخص کو بہترین روزی تو پیدا کرنے کے قابل بنادے لیکن روپے کا صحیح مصرف اور اوقات فرصت کسی سماجی فلاح و بہبود کے کام میں صرف کرنے کی بجائے تاش، شطرنج، ناچ اور سینما میں ضائع کرتے ہیں یاد رہے کہ روزی کمانا زندگی کا ایک اہم مسئلہ سہی۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ چناں چہ ہربرٹ سپنسر کے الفاظ میں تعلیم کا صحیح مقصد کامل زندگی ہونا چاہیے۔ بس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھے نظامِ تعلیم میں متعلمین کو روزی کمانے کے قابل بنانے کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔ لیکن اسے واحد مقصدِ تعلیم کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

دورِ حاضر کے ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح نظامِ تعلیم وہ ہے جو افراد اور معاشرہ دونوں کی بہبود کا خیال رکھے۔ چناں چہ جان ڈیوی کے خیال میں تعلیم کے بنیادی عناصر دو ہیں:-

پہلا نا پختہ حیوان ناطق۔

دوسرا بالغ نظر اور پختہ کار طبقہ کی متعین کردہ اقدار اور مخصوص سماجی اغراض و مقاصد۔

اس کا کہنا ہے کہ تعلیم ان ہی دو عناصر کے صحیح تفاعل سے عبارت ہے۔ اور اچھی تعلیم کی عمارت ان میں سے ہر ایک عنصر کے منفرد اور کامل تصور پر استوار کی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اچھے نظامِ تعلیم کا مقصد ایسی سیرت کی تشکیل ہے جس میں انسان کے روحانی، اخلاقی، جمالیاتی، ذہنی اور جسمانی پہلوؤں میں ہم آہنگی پائی جائے۔ تاکہ اس چشمہ سے سیراب ہونے والی شخصیتیں معاشرہ کی نت نئی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوئے قومی نصب العین کو پا سکیں۔ نیز ایسا نظامِ تعلیم ایک عام معیار قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ صلاحیتوں کے لیے میدانِ عمل کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اس طرح تعلیم کے دور میں بچوں میں اوقاتِ مصروفیت گذارنے اور فرصت کے لمحات بسر کرنے، کاروبار چلانے، گھریلو زندگی کے فرائض انجام دینے سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے۔ قومی نصب العین کو اپنانے اور اخلاقی اقدار کا پاس رکھنے کی صلاحیتیں شعوری اور غیر شعوری طور پر استوار ہوتی رہتی ہیں۔ تعلیم کے یہی وہ اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے سماج کو تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور ایسے اداروں کے فارغ التحصیل انسانیت کے بہترین نمونے ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم کا کوئی تراشا ترشایا اور بنا بنایا مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ قومیں اپنی ضروریات اور حالات کو سامنے رکھ کر اپنے مقصد کا تعین کرتی ہیں۔ مثلاً یونان کی ریاست ایتھنز میں غلاموں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اور مقصدِ تعلیم مقرر کرنے والا طبقہ انھیں ہمیشہ غلام رکھنا چاہتا تھا جس کے لیے انھوں نے حکمرانی کا کاروبار چلانے کی تعلیم صرف امیر لوگوں کے لیے مخصوص کر دی اور غلاموں کو ایسے پیشے کی تربیت دی جن سے وہ حکمران طبقے کے دستِ نگر رہے۔ اسی طرح جب سپارٹا کی ریاست دشمنوں سے گھری ہوئی تھی تو اس کے ہر شہری کو وطن کی حفاظت کے لیے سخت قسم کی فوجی تربیت دی جاتی تھی اور حد یہ تھی کہ ان کے ہاں صرف صحت مند بچوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔

ایتھنز اور سپارٹا کی باتیں تو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ آج ہمارے سامنے روس اور امریکہ کی مثالیں موجود ہیں۔ جنھوں نے اپنے مقاصدِ تعلیم اپنے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر مرتب کیے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ملک و قوم کو ترقی کے راستے پر چلا رہے ہیں۔ مثلاً روس میں جب زار کی شہنشاہیت ختم ہوئی تو مزدوروں اور کسانوں کی حالت غلاموں سے بدتر تھی۔ آزادی کے بعد نئی حکومت نے عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کا نصب العین تیار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ملک سے جہل و افلاس دور کر لیا۔ ایسے ہی امریکہ کے باشندے دراصل مختلف ممالک سے جا جا کر آباد ہوئے ہیں۔ ان کی زبانیں، عادات و اطوار ایک دوسرے سے الگ تھے۔ امریکہ کی حکومت نے اپنی تعلیم کا مقصد ایک قوم کی تشکیل قرار دیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم کی بدولت مختلف قوموں کے یہ افراد آج ایک قوم بن گئے ہیں۔

انگریز قوم کے زیرِ اثر ہماری تعلیم کا کوئی ایسا مقصد نہ تھا جو زندگی کو سنوارنے میں مدد دے سکتا۔ اور بدقسمتی سے ہمیں اپنی بے مقصدی کا شعور بھی نہ تھا۔ آج ہمیں آزاد ہوئے گیارہ سال ہونے کو آئے لیکن ابھی تک ہمارا تعلیمی نصب العین کم از کم عوام کے لیے واضح نہیں وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد ملازمت کے قابل بنا دینا ہے اور اس کے لیے امتحانات پاس کر کے سندیں حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اوقات وہ بے صبرے ہو جاتے ہیں اور تعجب سے سوال پوچھتے ہیں کہ آخر اس کام کے لیے اتنی مدت کیوں صرف کی جاتی ہے اور مختلف مضامین پڑھانے اور مدرسے میں مختلف سماجی مشاغل جاری

بنے کی کیا اہمیت ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب ہم آزاد ہیں۔ اس آزادی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد تعلیم کو نہ صرف متعین کریں بلکہ اس کی نشر و اشاعت اس پیمانے پر کریں کہ عوام کو صحیح تعلیمی نصب العین کا پتہ چل سکے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ منزل کا علم ہمارے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔ ہم اپنا راستہ ڈھونڈ سکیں گے اور اس کی مناسبت سے زاد راہ کا انتظام کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہم خود اپنا احتساب کر سکیں گے۔ حصول مقصد میں ہمیں کتنی کامیابی ہوئی اور ابھی کیا کچھ کرنا باقی ہے۔ مزید برآں تعلیمی نصب العین کی تعیین عمل میں یک جہتی پیدا کر سکے گی۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے آئین کے مطابق اس کی قومی زندگی اسلامی بنیاد پر استوار کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد اسلامی اصول ہوں گے جس کی تعمیر کا ساز و سامان ہمیں اپنے ماحول ہی سے لینا ہوگا۔ اسلامی زندگی کے اصولوں کے مطابق ہمارے معاشرے میں ہر شہری کے لیے خوراک، لباس اور رہائش کی آسانیاں میسر ہوں گی اور ہماری زندگی انصاف، ضبط اور قربانی کا بہترین عملی نمونہ ہوگی۔

ایسا معاشرہ تیار کرنے کے لیے ہمارے مدرسوں کو کیا کچھ کرنا چاہیے۔ انھیں اپنے سامنے کیا مقصد رکھنا چاہیے اور بچوں کو کیسی تعلیم دینی چاہیے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دیے بغیر ہم اپنے نظام تعلیم کو درست نہیں کر سکتے۔ چناں چہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بڑے بڑے مقاصد حسب ذیل ہوتے ہیں:

(۱) موجودہ زمانے کے ساتھ مطابقت کے لیے ضروری مہارتوں کا حصول۔

(۲) تہذیب و تمدن کی ترقی میں بنی نوع انسان کے کارناموں کو سمجھنا اور ان کی ستائش کرنا۔

(۳) اپنی قومی روایات پر ناز کرنا۔

(۴) ذاتی عادات کی تشکیل اور ایسی دل چسپیوں کی نشو و نما جو کارآمد اور تسلی بخش زندگی گزارنے میں مدد دے سکیں۔

(۵) ایسے پیشے کے لیے تیار کرنا اور اس کے انتخاب میں مدد دینا جو فرد کے لیے باعث تسلی اور معاشرے کے لیے سود مند ہو۔

(۶) شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض کو پورا کرنے کا اہل بنانا۔

آئیے دیکھیں ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے:۔

(۱) انسان کو دوسروں کے خیالات سمجھنے اور انھیں اپنانے کے لیے صحیح زبان کا استعمال ازبس ضروری ہے۔ ہمارے پاس الفاظ کا ذخیرہ جتنا بڑا ہوگا اور قوت فہم اور قوت بیان جتنی زیادہ ہوگی نئی واقفیت حاصل کرنے کے امکانات اتنے ہی بڑھ جائیں گے۔ اس لیے ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے پڑھنے، لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرنا چاہیے۔ آج کی دنیا میں کامیاب زندگی گذارنے کے لیے زبان کے بعد دوسری اہم چیز حساب ہے۔ ہم حساب کو صرف اپنی روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے ہی میں استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ آج کی منظم کاروباری دنیا کے معاملات چلانے میں بھی ہمیں اس کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ چناں چہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ریاضی کی اعلیٰ قابلیت رکھنے والوں کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف انجینئر اور سائنس دان بلکہ ماہر نفسیات اور ماہر تعلیم کو بھی اعلیٰ ریاضی میں دست رس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کو سنوارنے اور پیشوں میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں مختلف دست کاریوں کی بنیادی تربیت دی جائے۔ اس کے علاوہ ہمیں مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ صحیح طرز فکر حقائق و آرا کا غیر جانب دارانہ تجزیہ اور صحیح فیصلے پر پہنچنے کی عملی تربیت مل سکے۔

(۲) دور جدید سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور دل چسپ اور کارآمد زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تہذیب و تمدن کے ارتقا کے سلسلے میں نسل انسانی کی جدوجہد سے واقفیت حاصل کریں۔ اس لیے ہمیں ادب، فنون لطیفہ، سے واقف ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ ماضی اور حال کی انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت واضح ہو۔ دنیا کے سربستہ رازوں کو افشا کرنے میں سائنس کا مقام متعین ہو۔ اور دور جدید کی عظیم تکنیکی ترقی کا صحیح تصور ہو۔ اور ان طریقوں کا پتہ ہو جن سے صنعت و زراعت زندگی کے معیار کو بلند کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ نیز اچھی تعلیم پرانی نسلوں کا ورثہ نئی نسل تک نہیں پہنچاتی بلکہ اس کے ساتھ وہ اس کے دل میں اس ورثے کو بڑھانے کی آرزو پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہمیں اس تخلیقی قوتوں کے

بیدار کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

(۳) تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں اپنی قومی روایات سے آشنا کرائے اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم اسلامی ممالک کی تاریخ پڑھیں اور ان مقاصد و نظریات کا وقوف پیدا کریں جن کے تحت اسلامی جمہوریت قائم کی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ صحیح تعلیم ہمیں ان مسائل کا احساس دلائے گی جن سے ہمارا ملک دوچار ہے اور اس جدوجہد کا مکمل خاکہ ذہن نشین کرائے گی جو ان مسائل کے حل کے لیے کی گئی ہیں۔

(۴) ہمارے تعلیمی اداروں کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اوصاف حمیدہ اور عادات صالحہ کی نشوونما کریں، کہ ان کے ذریعہ ہمیں ان پر عمل کر رہنے کا ڈھنگ آجائے۔ اسکولوں میں اسلامی مساوات کو عملی طور پر بچوں کے کردار کا جزو بنایا جائے۔ دوسری قوموں، مذہبوں اور سیاسی تنظیموں کے لوگوں کے لیے خیر سگالی اور رواداری کے جذبات کی نشوونما کی جائے۔ نیز اوقات فرصت گذارنے اور تفریحات کے لیے مختلف النوع فعالیتوں کے مواقع بہم پہنچائے۔

(۵) استاد بچوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کر کے ان کے رجحانات کا اندازہ لگائے اور ہر بچے کی انفرادی صلاحیت اور دلچسپی کے مطابق اسے مناسب پیشہ اختیار کرنے میں مدد دے اور حصول علم کے سلسلے میں ایسے طریقے بچوں کو سکھائے جو انہیں اعلیٰ تعلیم یا آئندہ پیشوں کے سلسلے میں بآسانی مہارت حاصل کرنے میں مدد دے سکیں۔ اس کے علاوہ استاد بچوں کو ان کے فرائض کا احساس دلائے اور ان میں محنت کرنے کی عادت ڈالتے ہوئے احساس ذمہ داری کی تربیت کرے۔

(۶) سکول ہی وہ ادارہ ہو سکتا ہے جس میں صحیح شہری کے کردار کی تشکیل ممکن ہے۔ سکول کا پروگرام کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ بچوں کو پاکستانی نظام حکومت سمجھنے میں مدد دے سکے۔ قانون کی پابندی کرنے کا جذبہ عطا کرے۔ ذاتی مفاد کو معاشرتی بہبود پر قربان کرنے کی عادت ڈالے اور جمہوری نظام چلانے کی عملی تربیت دے۔ یاد رہے کہ گھر کا ماحول جمہوری نہیں ہوتا۔ والدین بچے سے یا تو بے حد محبت کرتے ہیں یا اسے بے اندازہ ڈانتے ڈپٹتے ہیں۔ وہ اس کی شخصیت اور اس کی رائے کو

قابل احترام نہیں سمجھتے۔ اسی لیے بعض اوقات بچے گھروں میں گھٹے گھٹے رہتے ہیں اور جہاں آزاد ہوتے ہیں تو اس درجہ کہ لوگ ان کی آزادی سے پناہ مانگتے ہیں۔ مدرسے کے آزاد ماحول میں استاد کا کام یہ ہے کہ بچے کی خوبیوں کے اظہار کے لیے دلچسپ ذرائع مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت سے اس کی برائیاں دور کر دے۔ اس طرح بچے کو اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے صحیح نمائندے کے انتخاب کی تربیت دے اور جائز۔ احتجاج کے طریقے سکھائے۔ اس طرح بچہ تعلیم و تربیت کی اس فضا میں آپ ہی آپ بہتر بنتا جاتا ہے۔ دوسروں کو بہتر بناتا ہے۔ اور ایک اچھے شہری کی صلاحیتیں خود بخود پیدا کر لیتا ہے ۔

بحرِ ہند کی جنتِ ارضی

ادریس احمد

دارالسلطنت یا گلستان؟

مشہور امریکی رسالے نیشنل جیوگرافک میگزین کا نمائندہ ایمین ویلیئرز لکھتا ہے :-

"میں نے سن رکھا تھا کہ جنوبی سمندروں کے بعض جزیرے پھولوں سے اس طرح بھرپور ہیں کہ ان پر گلستان کا دھوکہ ہوتا ہے۔ میں نے بہت سا وقت ان جزیروں کی تلاش میں کھویا تھا مگر ان کا کہیں سراغ نہ پایا تھا۔ اب بالکل غیر متوقع طور پر میں اس قسم کے ایک جزیرے میں آ نکلا تھا۔ مگر یہ جزیرہ جنوبی سمندروں میں نہیں بلکہ بحر ہند میں واقع تھا۔ میں قدیم وضع کے بادبانی جہاز سے پرسکون بندرگاہ پر اترا۔ بندرگاہ کا پلیٹ فارم مہاگنی کے خوبصورت تختوں سے بنا تھا۔ اس کے ایک جانب ڈاک خانہ تھا اور دوسری جانب محصول گھر۔ میں جونہی پلیٹ فارم سے آگے بڑھا دو مسکراتے ہوئے چہرے میرے استقبال کو آئے۔ ان میں سے ایک محکمہ محصول کا افسر تھا اور دوسرا محکمہ صحت کا افسر۔ یہ دونوں سائیکل سوار تھے۔ میرے قریب آ کر وہ سائیکلوں سے اتر پڑے اور ہم تینوں شہر کی طرف چل دیے۔ ہم جوں جوں آگے بڑھتے گئے میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ دارالسلطنت تھا۔ مگر نہ یہاں کوئی کار نظر آتی نہ گاڑی نہ ٹانگہ اور نہ کوئی سڑک۔ حد یہ ہے کہ رکشا گاڑی کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ غرض اس بھیڑ اور شور و غل کا شائبہ تک نہ تھا جو جدید زندگی کا خاصہ ہے۔ تمام راستے میں نہ کوئی ٹریفک کا نظر آیا نہ کوئی پولیس کا سپاہی۔ یوں گمان ہوتا تھا کہ میں ایک شہر میں نہیں چل رہا۔ بلکہ کسی باغ میں چہل قدمی کر رہا ہوں"

یہ ہیں تاثرات ایک مغربی سیاح کے جب اس نے جزائر مالدیپ کے دارالسلطنت مالے میں پہلی بار قدم رکھا۔

شہر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے یہی سیاح کہتا ہے ۔ جدھر دیکھو باغیچے ہی باغیچے ہیں دیواروں پر طرح طرح کی بیلوں نے جال تان رکھے ہیں اور ان کے رنگا رنگ پھول ایک عجیب سماں پیدا کرتے ہیں۔ ہم ان گلستانوں میں سے ٹہلتے ٹہلتے سلطان کے محل کے سامنے آنکلے۔ یہاں ایک بہت بڑا میدان ہے جو شکل میں بالکل مستطیل اور رنگا رنگ پھولوں کا مرقع تھا۔ اس وسیع چوراہے میں سے چاروں طرف فراخ اور سیدھی سڑکیں شہر کے مختلف گوشوں کو جاتی ہیں۔ استوائی سورج کی کرنیں ان سڑکوں کی سفید ریت پر ایسی چکا چوند پیدا کر رہی تھیں کہ وہ روشنی کی نہریں معلوم ہوتی تھیں۔ وسیع چوراہے کے قریب ہی مالے کا کاروباری حصہ واقع ہے۔ بڑی بڑی دوکانیں سب اسی جگہ ہیں۔ میں نے ان دکانوں کو دیکھا وہ طرح طرح کے سامان سے بھرپور تھیں۔ یہاں بڑی بڑی پتنگیں پڑی تھیں۔ مالدیوی لوگ ان پتنگوں کے بڑے شائق ہیں۔ ان کے علاوہ دوکانوں میں ہر قسم کا منیاری کا سامان اور ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیں وغیرہ موجود تھیں۔ چوراہے کے پاس ہی ایک تنگ گلی کے منہ پر چند ملاح بیٹھے ایک بہت بڑا بادبان تیار کر رہے تھے۔ ان کے پاس چند لڑکے بیٹھے کشتیوں کے لیے مضبوط رسے بانٹ رہے تھے۔ سامنے بندرگاہ کی طرف سے آدمیوں کی ایک قطار چلی آرہی تھی۔ یہ لوگ خشک مچھلی کے بڑے بڑے بورے سروں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر بورے کا وزن سو پونڈ سے کم نہ ہوگا۔ مگر یہ لوگ یوں اچھلتے کودتے ہنستے چلے آرہے تھے گویا مل کر تفریح کو نکلے ہیں۔"

عبرت کا مرقع

جزائر مالدیو عظیم جزیرہ نمائے ہند کے ٹھیک مغرب میں اور لنکا کے جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ کولمبو کی بندرگاہ سے مالے کا فاصلہ ۵۰۰ میل ہے۔ کولمبو ان جزیروں سے قریب ترین غیر ملکی بندرگاہ اور لنکا ان کا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ ان کی بیشتر تجارت لنکا کے ساتھ ہے۔ جزائر مالدیو کی سب سے بڑی پیداوار خشک مچھلی ہے جس کی بڑی منڈی لنکا ہے۔ پہلے عرب اور مشرقی افریقہ کو بھی خشک مچھلی بھیجی جاتی تھی مگر اب ان ملکوں کے ساتھ تجارت کم ہو گئی ہے۔ مالدیو اور ہندوستان کے درمیان رو بادبانی جہاز کولمبو اور مالے کے درمیان آتے جاتے ہیں اور ان ہی کے طفیل مالدیو کا تعلق بیرونی دنیا کے ساتھ قائم ہے۔ مالدیو کی خشک مچھلی

چٹائیاں، کوڑیاں اور دوسری ہر قسم کی پیداوار کولمبو پہنچتی ہے۔ اور اس کے بدلے یہاں سے چاول، کپڑا، مٹی کا تیل اور ہر قسم کی مصنوعات جزائر مالدیپ کے لیے لادی جاتی ہیں۔

بحرِ ہند کے نقشے پر نگاہ ڈالو تو جزائر مالدیپ کی مرکزی حیثیت فوراً نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ مونگے کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن کی تعداد دو ہزار سے اوپر ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے اور ٹاپو دو متوازی قطاروں میں شمالاً جنوباً پھیلتے چلے گئے ہیں۔ بحرِ ہند کی بے پناہ وسعت میں ان کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی کاتب نے لکھتے وقت دو مرتبہ قلم جھٹکا ہو اور نوکِ قلم سے گرنے والی سیاہی کے ننھے ننھے دھبے دو متوازی قطاروں میں پھیل گئے ہوں۔ ان جزیروں کو ناریل اور اس قسم کے دوسرے سرسبز درختوں نے ڈھانپ رکھا ہے اور یہ کم گہرے سمندر سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف میلوں تک سمندر کی گہرائی بہت کم ہے اور ان کم گہرے پانیوں میں طرح طرح کی مچھلیاں خوب پلتی ہیں۔ سطحِ سمندر سے جزیروں کی بلندی عموماً چند فٹ سے زیادہ نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر میں ہی ناریل کے جھنڈ اُگے ہوئے ہیں۔

موں سون خطے میں جزائر مالدیپ کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے طفیل قدیم زمانوں سے فاتحین اور جہاز رانوں نے انھیں للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ماضی کے دھندلکے میں نگاہ دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے یہاں ہندوستانی سامراج نے قدم جمائے۔ پھر ایرانی فاتح آئے۔ ان کے بعد عرب آئے جو اپنے ساتھ ایک نئی زندگی کا پیغام بھی لائے۔ عرب سیادت کا دور دورہ بھی چند صدیوں بعد ختم ہو گیا۔ مگر اس کے اثرات پائیدار ثابت ہوئے۔ اہلِ مالدیپ آج تمام کے تمام مسلمان ہیں اور اپنی جفاکشی اور پاکیزہ زندگی کے لیے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی کل تعداد کوئی بچانوے ہزار کے قریب ہے۔ جزائر مالدیپ کی تعداد کہنے کو تو دو ہزار سے اوپر ہے۔ مگر ان میں سے صرف ۲۱۵ جزیرے ایسے ہیں جہاں آبادی ہے، باقی جزیرے کیچڑ اور پانی کے مرکب ہیں جہاں آبادی ممکن نہیں۔ آباد جزیروں کا کل رقبہ صرف ۱۱۵ مربع میل ہے۔ مگر ان جزیروں کے درمیان اور ان کے اردگرد کم گہرے سمندر کی جو چادر پھیلی ہوئی ہے اس کا رقبہ بہت بڑا ہے۔

اہلِ مالدیپ کی نسل کے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ وہ مالدیپی بولی بولتے ہیں جو سنہالی بولی کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ مالدیپ کے رقبے اور آبادی کو دیکھ کر ان کی سیاسی زندگی کے متعلق کوئی زیادہ

خوش فہمی نہیں ہوتی۔ مگر اس چھوٹی سی قوم کا استقلال اور جذبہ آزادی قابل تعریف ہے کہ اس نے مغربی استعمار کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب یورپی لٹیروں نے ایشیا پر یورش کی تو جزائر مالدیو کو بھی استعمار کا نشانہ بنایا گیا۔ یکے بعد دیگرے پرتگیزوں، ولندیزوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے یہاں اپنے قدم جمانے چاہے۔ مگر ہر ایک کو منہ کی کھانا پڑی۔ ان میں سب سے زیادہ عبرتناک انجام پرتگیزوں کا ہوا۔ وہ واحد یورپی قوم تھی جس نے مالدیو کو بزور شمشیر اپنی مٹھی میں رکھنا چاہا۔ پورے دس سال تک پرتگال کی یہ آہنی گرفت جاری رہی۔ تاہم مالدیو دل ہی دل میں اس استعماری گرفت سے نجات پانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ آخرکار ایک رات ان کے غصے کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ وہ مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بھی پرتگیزی سپاہی کو زندہ نہ چھوڑا۔ اس کے بعد کسی گوری قوم کو یہ حوصلہ نہ ہوا کہ جزائر مالدیو پر زبردستی قبضہ جمائے۔

آج کل جزائر مالدیو برطانیہ کی زیر حفاظت ہے۔ مگر برطانیہ کے ساتھ یہ سیاسی رشتہ بالکل اسی قسم کا ہے جس طرح دیگر اکثر آزاد ملکوں نے اپنے آپ کو کسی ایک بلاک کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ موجودہ بین الاقوامی حالات میں کسی چھوٹی قوم کے لیے خود اپنا دفاع آپ کرنا ممکن نہیں۔ محدود وسائل کے ساتھ جدید قسم کی فوجیں اور آلات حرب مہیا کرنا چھوٹی قوموں کے بس کی بات نہیں۔ اس مجبوری کے تحت جزائر مالدیو نے اپنے آپ کو برطانیہ کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ورنہ یہ چھوٹی سی قوم اپنے اندرونی معاملات میں اب بھی اسی طرح آزاد ہے جس طرح پہلے تھی۔ جزائر مالدیو میں نہ کوئی غیر ملکی سفارت خانہ ہے نہ کوئی انگریز نمائندہ۔ گوری قوم کا فرد ادھر آ نکلے تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اسے دیکھنے جمع ہو جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ نے ایک انتہائی جنوبی جزیرے میں ہوائی اڈہ قائم کیا تھا۔ مگر جنگ کے خاتمہ پر یہ ہوائی اڈہ ترک کر دیا۔ اب برطانیہ نے جزائر مالدیو کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے یہ ہوائی اڈہ دوبارہ قائم ہو جائیگا۔

آج کل جزائر مالدیو آبی شاہراہوں سے دور واقع ہیں۔ بحر ہند کی تمام آبی شاہراہیں ان جزیروں سے کافی شمال میں سے گذر جاتی ہیں۔ اسی طرح تجارتی ہوائی راستے بھی ان جزیروں سے بہت دور ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ جزیرے جو کبھی اہم تجارتی شاہراہوں پر واقع ہوا کرتے تھے۔ اب باقی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے ہیں، بہت شاذ

ہی کوئی ہوائی جہاز ان جزیروں کے اوپر سے گذرتا ہے۔ اسی طرح بادبانی کشتیاں بھی ادھر بہت کم آتی ہیں بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ پرانی قسم کے بادبانی جہاز ہیں۔ جو کولمبو اور مالے کے درمیان چلتے ہیں۔ اگر یہ جہاز مون سون ہوا کے ساتھ چل رہے ہوں تو ۴۵۰ میل کا فاصلہ تین دن رات میں طے کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مون سون کے طوفانی تھپیڑوں کے خلاف جا رہے ہوں تو یہی فاصلہ ایک مہینے میں طے ہوتا ہے

امن وسکون کی فراوانی

جدید سائنسی تہذیب نے جہاں انسان کو طرح طرح کی سہولتیں عطا کی ہیں۔ وہاں اس نے بے پناہ شور و غل دود و غبار اور بے تحاشا بھاگ دوڑ کے سامان بھی پیدا کئے ہیں۔ سائنسی تہذیب کے یہ لوازمات انسانی اعصاب پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ اور جدید انسان اس اعصابی تناؤ سے اکتا کر بسا اوقات اس پُرسکون زندگی کی آرزو کیا کرتا ہے۔ جو پرانے بھلے زمانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ جزائر مالدیپ میں امن وسکون کی آج بھی اسی طرح فراوانی ہے۔ جس طرح صدیوں پہلے تھی۔ جدید تہذیب کے ہنگاموں کا وہاں گذر نہیں ہوا۔ صرف سلطان کے پاس ایک چھوٹی سی کار ہے اور دس بارہ ہلکے سے ٹرک ہیں۔ جن کی مدد سے بندرگاہ پر مال پہنچایا اور وہاں سے لایا جاتا ہے۔

جزائر مالدیپ کا دارالسلطنت جزیرہ مالے کا شہر ہے۔ یہ جزیرہ صرف میل بھر لمبا اور کوئی آدھ میل چوڑا ہے۔ شہر کی آبادی آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ تمام لوگ صاف ستھرے فراخ مکانوں میں رہتے ہیں جو شہر کی سیدھی اور فراخ سڑکوں کے کنارے بنے ہیں۔ ہر گھر میں طرح طرح کے پھل دار درخت مثلاً آم" کیلا۔ ناریل وغیرہ سر اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اور مکانوں کی دیواریں سرسبز بیلوں سے ڈھکی پڑی ہیں۔ سلطان کے محل اور ایک آدھ سرکاری عمارت کو چھوڑ کر باقی تمام عمارتیں یک منزلہ ہیں۔

مالے کی حیرت انگیز صفائی اور اس کی جیومیٹری تعمیر ہر غیر وارد کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے شہر کا نقشہ بحریہ کے کسی مشہور انجینئر کا تیار کردہ ہو اور اس کی صفائی اور ستھرائی کے لئے خاص قوانین نافذ ہوں۔ لیکن مالدیپ میں کبھی کسی غیر ملکی انجینئر کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان کی بحریہ کا سب سے بڑا افسر امیر البحر کہلاتا ہے۔ غرض شہر کی تعمیر میں جس حیرت انگیز جیومیٹری صحت سے کام لیا گیا

ہے۔ اور اس کی صفائی کا جو انتظام ہے وہ بے حد حیرت انگیز ہے۔ زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ فن تعمیر اور حفظانِ صحت کا یہ کارنامہ خالصۃً مالدیوی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس میں کسی خارجی اثر کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ غرض مالے کا شہر صفائی ستھرائی، امن و سکون اور دلجمعی کا ایک ایسا مثالی نمونہ پیش کرتا ہے جس کی تمنا دنیا بھر کے شاعر اور ادیب کرتے آتے ہیں۔ اس شہر کو دیکھ کر یہ یقین نہیں آتا کہ یہ پُرہجوم غلیظ اور افلاس زدہ ایشیا کا ایک گوشہ ہے۔

لازمی تعلیم

اگرچہ جزائر مالدیو کا کل بقیہ مربع میل سے زیادہ نہیں اور وہاں زندگی کی عام ڈگر پرانی وضع کی ہے۔ تاہم تعلیم کے معاملے میں اہل مالدیو دنیا ترقی پسند قوموں کے ہم پلّہ ہیں۔ ابتدائی تعلیم بچوں اور بچیوں کے لئے یکساں طور پر لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خواندگی کا تناسب نوّے فی صد سے زیادہ ہے۔

تعلیمی سہولتیں عام کرنے کے لئے اہل مالدیو نے نہایت کارگر طریق کار اختیار کر رکھا ہے۔ مالے کا شہر بہت سے حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصّے کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کا خود بندوبست کرنے چنانچہ شہر کا ہر حصّہ اپنے بچوں کے لئے ابتدائی مدرسہ قائم کرتا ہے۔ مالے میں ایک بہت بڑا ثانوی مدرسہ بھی قائم ہے۔ یہ مدرسہ شہر کے تمام لوگوں نے مل کر قائم کیا ہے۔ اس ثانوی مدرسے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں اسی مدرسے میں پڑھتے ہیں، لیکن ان کی پڑھائی کے اوقات الگ الگ ہیں۔ لڑکے دن کے وقت پڑھنے آتے ہیں۔ اور لڑکیاں رات کے وقت۔ وجہ یہ کہ اہل مالدیو اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ سیانے لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھیں۔ بلکہ لڑکیاں جب ذرا سیانی ہو جاتی ہیں تو وہ گلیوں بازاروں میں بھی نہیں نکلتیں۔

مالدیوی عورتیں

مالدیوی لڑکیاں اور عورتیں عموماً مغربی وضع کا لباس پہنتی ہیں۔ سر پہ ہیٹ اور جسم پر لمبا فراک البتہ بوڑھی عورتیں اب تک پرانی وضع کا لباس پہنتی ہیں۔ جو اب متروک ہوتا جا رہا ہے۔ مالدیوی عورتوں کے متعلق سب سے عجیب بات ان کی حیرت انگیز صحت ہے۔ ان کی شکل سے عمر کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے

مدرسوں میں پڑھانے والی استانیاں جن کی عمر کسی صورت میں پچیس تیس برس سے کم نہ ہو دیکھنے میں طالبات سے زیادہ بڑی معلوم نہیں ہوتیں۔ حد یہ ہے کہ ادھیڑ عمر کی عورتیں جو چالیس پچاس برس کے پیٹے میں ہوں وہ بھی دیکھنے میں نوعمر معلوم ہوتی ہیں۔ صرف زیادہ بوڑھی عورتیں ہی سال خوردہ نظر آتی ہیں۔

مالدیپی عورتوں کی وفاداری اور خدمتگذاری کو دنیا کے دو مشہور سیاحوں نے خراج تحسین ادا کیا ہے ان میں سے ایک ابن بطوطہ ہے جو تغلق دور میں ہندوستان میں بھی آیا تھا۔ ابن بطوطہ نے مالدیپ میں کئی سال گذارے اور یہاں بہت سی شادیاں کیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے "میں نے دنیا میں کسی اور جگہ ایسی عورتیں نہیں دیکھیں جن کی رفاقت اس قدر دل نواز ہو۔ بیوی یہ کبھی گوارا نہیں کرتی کہ شوہر کی خدمت کا کام کسی دوسرے کے سپرد کرے۔ وہ خود اس کے سامنے کھانا لاکر رکھتی ہے۔ جب کھا لیتا ہے تو خود اسے اٹھاکر اٹھاکر لے جاتی ہے۔ خود اس کے ہاتھ دھلاتی ہے۔ خود وضو کراتی ہے اور جب وہ آرام کرنے کے لئے لیٹتا ہے۔ تو خود اس پر کپڑا ڈالتی ہے۔ میں نے اس ملک کی کئی عورتوں کے ساتھ شادی کی "

دوسرا سیاح جس نے جزائر مالدیپ کے حالات لکھے ہیں فرانس کا ڈی لاوال ہے۔ ۱۶۰۲ء میں اس کا جہاز جزائر مالدیپ کے قریب تباہ ہوگیا اور اس نے پانچ سال ان جزائر میں گذارے۔ اس نے بھی کئی ایک مالدیپی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اور اہل مالدیپ کے رہنے سہنے کے طریقوں کے حالات قلمبند کئے۔ ڈی لاوال کی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ ڈی لاوال نے اہل مالدیپ کے اہم ذریعہ معاش یعنی ماہی گیری کا تفصیلی ذکر کیا ہے، یہ بیان آج بھی کم و بیش اسی طرح درست ہے جس طرح سترھویں صدی کے آغاز میں۔ ڈی لاوال نے اہل مالدیپ کی جفاکشی اور خدا ترسی کی بڑی تعریف کی ہے۔

مالدیپی عورتیں اب بھی گلیوں اور بازاروں میں نہیں نکلتیں۔ وہ اپنے فراخ مکانوں کے اندر ہی رہتی ہیں۔ تاہم مکانوں کی دیواروں میں سوراخ بنے ہیں۔ جن میں سے عورتیں باہر جھانک سکتی ہیں۔

علاج معالجہ

علاج معالجے کے لئے جزائر مالدیپ میں ڈاکٹر اور حکیم موجود ہیں۔ مالے کے شہر میں ایک پاکستانی ڈاکٹر نے دوا خانہ کھول رکھا ہے جو خوب چلتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی لوگ بھوتوں پریتوں میں بھی یقین رکھتے ہیں

جب کوئی شخص بیمار ہو جاتے تو عام حالتوں میں پہلے ان لوگوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو آسیب دور کرنے میں مہارت رکھتے ہیں تاکہ اگر کسی جن بھوت کا اثر ہو تو وہ زائل ہو جاتے۔ اگر اس سے بیماری دور نہ ہو تو پھر سمجھا جاتا ہے۔ کہ تکلیف کا باعث بھوت پریت نہیں۔ بلکہ کوئی جسمانی مرض ہے۔ اب حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ مالدیپ میں آسیب دور کرنے والے جادوگروں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر مہینے سند یافتہ حکیموں اور ڈاکٹروں کی جو سرکاری فہرست شائع ہوتی ہے اس میں کچھ نام جادوگروں کے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ایک امریکی سیاح جو حال ہی میں مالدیپ گیا تھا۔ اپنا تجربہ بیان کرتے ہوتے کہتا ہے۔ میں نے لنکا میں ہی مالدیپی جادوگروں کے متعلق سن لیا تھا۔ اس لئے ان جزائر میں آنے کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی جادوگر کی مہارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ چنانچہ ایک دن ایک مشہور جادوگر میرے بنگلے میں لایا گیا۔ وہ ایک بہت بارعب انسان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک اور اس کے طور طریقوں میں ایک عجیب قسم کا جلال تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور کچھ منتر پڑھنے لگا۔ وہ پیالے میں ہاتھ ڈبو کر سامنے کی جھاڑی کی طرف پانی کے چھینٹے پھینکتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی جاتی تھیں، اب اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا لے کر ایک پلیٹ میں سیاہی سے کچھ نقوش کھینچے اور انہیں پانی سے دھو کر پانی جھاڑی کی طرف پھینک دیا۔ میری نگاہ جھاڑی پر گڑی تھی اور میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی بھیانک جن جھاڑی میں سے سر باہر نکالے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کے بعد جادوگر چلا گیا۔ ہم حسب معمول رات کو سوتے۔ مگر اس رات یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ خبیث روحیں بنگلے میں منڈلا رہی ہوں۔ ہم میں سے کوئی پل بھر کے لئے نہ سو سکا۔ ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے گذر گئی۔ خدا خدا کر کے صبح کی اذان کی آواز آئی تو بنگلے کی فضا میں سکون آیا اور ہماری آنکھ لگ سکی۔

بھوتوں پریتوں میں اس یقین کے متعلق نئی روشنی کے لوگ خواہ کچھ بھی کہیں لیکن اہل مالدیپ بیماری سے علاج کے لئے پہلے جادوگروں کی خدمات سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ جدید مغربی طریق علاج سے بہت مختلف نہیں۔ جدید مغربی طب مریض کی نفسیاتی کیفیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس بات

کا مطالبہ کرتا ہے کہ علاج معالجہ کے ساتھ ساتھ مریض کی نفسیاتی تائید بھی حاصل کی جاتے۔ مالدیوی جادوگر تقریباً اسی قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

ابن بطوطہ نے اپنے سیاحت نامے میں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ اہل مالدیو علاج معالجے میں صندل کی لکڑی اور عرق گلاب سے بہت کام لیتے ہیں۔ یہ بات آج بھی درست ہے۔ امریکی سیاح اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ استوائی سورج کی تمازت کے باعث میرے زخم پر کچھ آبلے نکل آئے۔ ہر قسم کی مرہم استعمال کی گئی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک روز ایک مالدیوی طبیب کچھ عرق گلاب اور صندل کا ایک ٹکڑا لئے آیا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹہ تک صندل کو عرق گلاب میں گھستا رہا اور یہ گاڑھا لیپ آبلوں پر لگا دیا۔ آبلے تین دن کے اندر اندر غائب ہو گئے۔

ذریعہ معاش

مالدیوی لوگوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش مچھلی پکڑنا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کے چاروں طرف گم گہرے سمندر کی وسیع چادر پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں طرح طرح کی مچھلیاں خوب پلتی ہیں چنانچہ پورانے وقتوں سے اہل مالدیو زیادہ تر مچھلیوں پر گذارا کرتے چلے آتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے خوبصورت کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں مچھلیوں سے لدی واپس آتی ہیں۔ آپ ان مچھلیوں کو کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں۔ اور انہیں ذرا سا ابال کر دھوئیں پر خشک کر لیا جاتا ہے۔ یہ خشک مچھلی زیادہ تر لنکا کو بھیجی جاتی ہے۔ پہلے عرب اور مشرقی افریقہ کو بھی خشک مچھلی بھیجی جاتی تھی۔ مگر اب ان ممالک میں مچھلی کی برآمد تقریباً ختم ہو گئی ہے۔

اجزائر مالدیو کے چمکیلے ساحلوں پر رنگ برنگ کی کوڑیاں اور گھونگے کثرت سے ملتے ہیں کسی زمانے میں کوڑیاں بطور سکے کے استعمال ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی یہ حیثیت دیر سے ختم ہو چکی ہے۔ اب ایک روپے کے عوض ہزاروں کوڑیاں مل جاتی ہیں۔ مالدیوی روپیہ قیمت میں پاکستانی روپے کے تقریباً نصف کے برابر ہے۔

مالدیوی کاریگر عام استعمال کی گئی ایک چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مالدیوی سمندر کے گھونگے سے اپنی رنگ برنگ

ابجری وارکھوپری کے لئے مشہور ہیں، جس سے نہایت نفیس کنگھیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لکڑی کے رنگین اور پھولدار برتن تیار ہوتے ہیں۔ ناریل کے ریشے سے رستے تیار کئے جاتے ہیں ساحلوں پر عنبر بھی ملتا ہے۔ یہ بھورے رنگ کے بدشکل ڈھیلوں کی شکل میں لہروں پر تیرتا تیرتا ساحل پر آ پہنچتا ہے۔ یہ ڈھیلے ویل مچھلی اپنے پیٹ سے اگلتی ہے۔

مالدیوی مچھیرے صبح سویرے مچھلیاں پکڑنے نکل جاتے ہیں۔ اور ساحل سے کوئی ایک درجن میل کے دائرے کے اندر اندر گھومتے پھرتے ہیں سمندری پرندوں کی مدد سے یہ معلوم کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کہ مچھلیاں کس جگہ بہتات میں ہیں۔ سہ پہر کو جب یہ لوگ ساحل پر واپس آتے ہیں تو مچھلیوں کے خریداران کی انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جن ماہی گیروں کی قسمت نے غیر معمولی یاوری کی ہو وہ مشقت سے فارغ ہو کر گانے ناچنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دائرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈھول بجنے لگتا ہے۔ اور گیتوں کی آواز کے ساتھ پاؤں کو دتے اور جسم بل کھانے لگتے ہیں اس کے ساتھ ہی ہر شخص عجیب وغریب طرح سے منہ بنانے لگتا ہے۔ یہ ہے اہل مالدیو کی مصروانہ دل لگی۔

کئی ماہی گیر دن کی مشقت سے فارغ ہو کر سمندر میں ہوا خوری کو نکل جاتے ہیں۔ وہ بال بچوں کو اپنی ہلکی پھلکی کشتی میں بٹھا کر ساحل سے تھوڑی دور نکل جاتے ہیں۔

اہل مالدیو کی سب سے بڑی تفریح پتنگ بازی ہے زرق برق چیزوں سے بڑے بڑے پتنگ بناتے جاتے ہیں۔ اور جب وہ اوپر آسمان پر پہنچ جاتے ہیں تو استوائی سورج کی کرنیں اس پتنگ سے نور کا ایک نہر کی شکل میں سفید چمکیلی ریت کی طرف بہنے لگتی ہیں۔ اہل مالدیو کا شوق پتنگ بازی اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ اگر آپ ڈاکخانے میں ٹکٹ یا کارڈ خریدنے جائیں تو یہ آپ دیکھیں گے۔ کہ کلرک ایک ہاتھ سے آپ کو ٹکٹ دے رہا ہے۔ مگر اس کا دوسرا ہاتھ ایک رسی کو تھامے ہوئے ہے جو کھڑکی میں سے گذرتی ہوئی اوپر آسمان میں ایک آتشیں شعلے پر ختم ہو جاتی ہے۔

جامع مسجد مالے شہر کے وسط میں جامع مسجد کا بلند وبالا گول مینار سر اٹھاتے ہے یہ

مینار دور سے روشنی کا مینار معلوم ہوتا ہے اس مینار سے دن میں پانچ بار موذن لوگوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے۔ یہ جامع مسجد ۱۰۸۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔

جزائر مالدیو گو برطانوی حفاظت میں ہے مگر اس کا حکمران سلطان محمد فرید اپنے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار ہے۔ جمعہ کے دن سلطان سبز عبا اور سبز ٹوپی پہنے جمعہ کی نماز پڑھانے نکلتا ہے وہ مسجد تک پیدل جاتا ہے اس کے دائیں بائیں چند ملازم اور آگے مالدیوی جھنڈا ہوتا ہے۔

جزائر مالدیو کی جنت ارضی بھی کوے کی کرخت کائیں کائیں موجود ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان جزیروں کی دلفریب فضا نے کوؤں کو غیر معمولی تعداد میں کھینچ لیا ہو۔ تاہم جمعہ کے روز سلطان کے نوکر صبح سے بندوقیں پکڑتے گلیوں اور سڑکوں پر چلتے نظر آتے ہیں وہ خالی فائر کر کے کوؤں کو بھگا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کی کرخت آواز جمعہ کی نماز میں مخل نہ ہو مگر معلوم ہوتا ہے کوے سلطان مالدیو کے حکم سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ کیونکہ جمعہ کے روز وہ صبح ہی سے نہایت پراسرار طریقہ پر غائب ہو جاتے ہیں۔ اگلی صبح پھر پوری جمعیت کے ساتھ آن موجود ہوتے ہیں۔ اور اگلے چھ روز تک خوب کان کھاتے ہیں۔

تعلیمی دنیا پر ایک منظر

لندن یونیورسٹی، علم و دانش کا گہوارہ

یوں تو لندن دنیا کے ان بڑے بڑے دارالخلافوں میں شامل ہے جن کی اپنی یونیورسٹیاں بہت بعد میں قائم ہوئیں۔ تاہم اب سے کوئی سوا سو برس پہلے سے جب اس عظیم دانشگاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ لندن یونیورسٹی نے ترقی کی منزلیں بڑی تیزی کے ساتھ طے کیں، اس کا نتیجہ ہے۔ آج اسے دنیا کی یونیورسٹیوں میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اسے یہ معتدر حیثیت نہ صرف اپنی تعلیمی سرگرمیوں بلکہ علم کے تشنہ لبوں کی پیاس بجھانے اور جغرافیائی توسیع کی بدولت بھی حاصل ہوئی۔ کچھ بھی ہو برطانیہ میں اسے ثانوی حیثیت مل چکی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا دل اس کے نواحی علاقوں میں دھڑک رہا ہے، اور یہ کچھ غلط بھی نہیں یہ نواحی علاقے بلومسبری میں برطانوی میوزیم کے شمال میں ہیں۔ جنہیں اب برابر ترقی دی جا رہی ہے۔ تاہم اس سے ملحق ادارے لندن کے بڑے وسیع علاقہ اور کاؤنٹیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں تک خود گرد و نواح کا تعلق ہے تو اس کی چار دیواری میں نہ صرف سینیٹ ہاؤس، نظم و نسق کے دفاتر، یونیورسٹی لائبریری اور طلباء کی انجمن بلکہ یونیورسٹی کے دو قدیم کالج یعنی یونیورسٹی کالج اور برک بیک کالج بھی واقع ہیں۔ یونیورسٹی کالج جس میں ساڑھے تین ہزار کے قریب طلباء زیر تعلیم ہیں، اور جو یونیورسٹی کے تعلیمی اداروں میں سب سے بڑا ادارہ ہے بذات خود ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر اسی چار دیواری میں متعدد نئے تحقیقاتی ادارے بھی ہیں جن کے لئے خود یونیورسٹی ذمہ دار ہے ان میں تاریخی تحقیق و تفتیش، تعلیم، آثار قدیمہ، فنون سے متعلق اداروں کے علاوہ سلافی زبان اور مشرقی یورپی علوم اور مشرقی و افریقی زبانوں سے متعلق اسکول بھی شامل ہیں۔

یونیورسٹی کے کچھ اسکول خصوصی نوعیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر ساؤتھ کینسنگٹن میں عظیم امپیریل کالج آف سائنس و ٹیکنالوجی، لندن اسکول آف اکنامکس، خواتین کا چھوٹا سا کوئین الیزبتھ کالج، جہاں امور

خانہ داری اور غذائیت کے ڈگری کورس پیش کئے جاتے ہیں ۔ رائل ویٹرنری کالج اور اسکول آف فارمیسی ، علاوہ ازیں انڈر گریجویٹوں کے لئے کم وبیش بارہ طبی تعلیمی ادارے ہیں ۔ پوسٹ گریجویٹ طبی ادارے ان کے علاوہ ہیں جن میں طب کے کسی بھی شعبہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے ۔ غرضیکہ یونیورسٹی طبی مطالعہ کو جو اہمیت دیتی ہے اس کا اس حقیقت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پورے طلباء کا ایک تہائی حصہ طب کے طالب علموں پر مشتمل ہے ۔

یونیورسٹی بہت وسیع علاقہ پر پھیلی ہوئی ہے جس میں لگ بھگ بیس ہزار طلباء زیر تعلیم رہتے ہیں ۔ ان میں سے ایک چوتھائی تعداد عورتوں کی ہے ۔ اور یہ سب ڈگریوں یا پوسٹ گریجویٹ ریسرچ میں شب و روز منہمک رہتے ہیں ۔ ان کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے پروفیسروں پر مشتمل عملہ ہے ۔ جن کی علمی برتری اور امتیاز سے ملک کی کوئی اور یونیورسٹی ٹکر نہیں لے سکتی ۔ پھر یونیورسٹی میں فالتو اوقات میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے بھی کافی سہولتیں رکھی گئی ہیں ۔ اس قسم کی تعلیم کے انتظام و انصرام کے لئے ایک خصوصی شعبہ قائم رہا ہے ۔

لندن کے کچھ کالج تو بے حد وسیع و عریض ہیں ۔ اور کچھ چھوٹے ۔ نیز رہائشی جگہ کے اعتبار سے بھی یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ لیکن یونیورسٹی کالج جیسے بڑے کالج میں بہت کم طلباء یہاں رہائش پذیر ہوتے ہیں ۔ اور ان میں سے اکثر قریب جوار یا دور دراز جگہوں میں نجی رہائش اختیار کرتے ہیں تا کہ اس پر نسبتاً کم خرچ آئے ۔ چنانچہ یہاں علماء اور طلباء کے درمیان آکسفورڈ اور کیمبرج جیسا قریبی تعلق اور تعلیمی نظام نہیں ۔ فضا آزاد اور کھلی ہوتی ہے ۔ اور ذہنی و تخلیقی روایات کو قدرے کم قطری کہا جا سکتا ہے ۔ غرضیکہ یہاں فائدے کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہیں ۔ ہاں جس چیز کی شدید کمی ہے ۔ وہ ہے ایک ذہن کا دوسرے ذہن پر مفید اور محرک اثر ۔ یہی مکمل اور جامع تعلیم کی ایک لازم و ملزوم شرط ہے ۔

تاہم اس قسم کے نقصانات ۔ اگر انہیں نقصانات کہا جا سکے مقابلہ میں لندن کے طالب علم کے لئے فائدے زیادہ ہیں ۔ چنانچہ یہاں سیاسیات کے طالب علم کے لئے ایوان ہائے پارلیمان اور سرکاری محکموں کا مطالعہ معمولی سی بات ہے ۔ معاشیات مالیات یا تجارت کا طالب علم لندن کے شہر اس کے بنکوں مالی اداروں

جہاز کے دفاتر اور اس کی عظیم بندرگاہ اور صنعتی اور تجارتی کارپوریشنوں کا با آسانی مطالعہ کرنیکے قابل ہے۔ قانون کے طلباء کو لیجئے تو وہ انز آف کورٹ یا عدالتوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی امور کا طالب علم سفارتخانوں، فنون کا طالب علم عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں اور ادب یا فلسفہ کا طالب علم بیشمار علمی ادبی انجمنوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پھر ان طلباء کے لئے ان لوگوں سے ملاقات کا موقع بھی ملتا ہے۔ جو برطانیہ، دولت مشترکہ اور دنیا کے ہر حصہ سے یہاں آتے ہیں۔ غرضیکہ اگر یہ کہا جاتے کہ لندن کا طالب علم دنیا کے نزدیک تر ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

اسی بنا پر اسکاٹ لینڈ کے نازک اور نفیس مزاج شاعر ولیم ڈنبار نے ۱۵۰۰ء کے قریب لندن کو، تمام شہروں کا چنیدہ پھول قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ کوئی شخص اگر لندن سے تنگ آجاتے تو اسکا یہ مطلب ہے کہ وہ زندگی سے بیزار ہے اور اب بیسویں صدی میں لندن یونیورسٹی اپنی چانسلر ملکہ الیزبتھ مادر ملکہ کی نگرانی میں، سرگرم عمل ہے اور اس نئے عہد کے تقاضوں پر پوری اتر رہی ہے۔

برطانیہ کے میلے اور تقریبات

وہ لوگ جن کے متعلق عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ نمائشی نہیں اور ضرورت سے زیادہ خاموشی کی طرف مائل ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی برطانوی عوام شاندار بناوٹ پر شاہی جلوس فوجی سوانگ کے مارچ اور عجیب غریب مقامی تقریبوں کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔

کوئی بھی بڑی تقریب ہو وہ عوام کی زندگی میں پرانے زمانے کی روایات کو بھرپور اور شجاعانہ انداز سے پیش کرتی ہیں۔ ان شاندار تقریبات کے علاوہ برطانیہ میں دوران سال اس قسم کے خوشگوار اور دلفریب مواقع آتے رہتے ہیں۔ جن سے عوام لطف اندوز ہو سکیں۔

کنجیوں کی تقریب

اگر شاہی محلات کے باہر سرخ وردی پہنے متعینہ گارڈ کے جوان نہ ہوں۔ تو اس کے بغیر لندن میں زندگی کتنی روکھی پھیکی ہو جاتے، یا لندن ٹاور کے محافظ ہر شام کنجیوں کے تبادلے کی جو رسم ادا کرتے ہیں اگر یہ رسم ختم کر دی جاتے تو کیا مزا باقی رہے؛ بھلا لندن کا کوئی شہری لارڈ میئر کے جلوس کا نظارہ کئے

بغیر رہ سکتا ہے۔ اس جلوس میں جہاں لندن شہر کا سب سے بڑا شہری نہایت قیمتی لباس میں ملبوس ہوتا ہے، وہیں اس کا محافظ دستہ سترھویں صدی کے سپاہیوں کی وردی پہنے اس کے جلوس چلتا ہے اس کے آگے ایک اعصا بردار ہوتا ہے۔ یہ عصا دنیا کا سب سے قدیم میونسپل نشان ہے۔ جو لندن کے شہری حاکم کی حاکمیت کی علامت ہے۔

سرکاری طور پہ جب برطانیہ کے حکمران کی سالگرہ منائی جاتی ہے تو اس موقع پہ فوجی دستوں کے اجتماعی کا مقابلہ بھلا کوئی اور تقریب کر سکتی ہے؟ بریگیڈ آف گارڈز کے جوان سرخ کوٹوں میں ملبوس ملکۂ وقت کے سامنے اپنے فوجی کرتبوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ملکہ گھڑسوار دستوں کی پریڈ دیکھ کر اپنے محافظ دستوں کے آگے آگے بکنگھم پیلس کی جانب روانہ ہوتی ہیں۔ لیکن کتنے لوگ ہوں گے جو اس رسم کے آغاز سے واقف ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب رجمنٹ کا نشان لڑائی کے دوران میں اس کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، تاکہ ہر فوجی اپنے نشان کو اچھی طرح پہچان سکے۔ اس لئے نشان کو فوجی دستوں کے اردگرد پھرایا جاتا ہے۔

برطانیہ میں تقریباتی رجحانات فطری ہیں۔ اور ان کا مخزن مقامی رسوم ہیں۔ جو دوسرے لوگ ان رسوم کو دیکھتے ہیں۔ انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے متعلقات کتنے بھرپور اور کتنی علامات ان سے وابستہ ہیں۔ لوک کہانیاں اور علم الاصنام کا اثر عوام پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ مدت ہوئی لوگ قدیم زمانے کے معاشرے کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

ڈربی شائر میں "خوش پوشی" کی تقریبات ہوتی ہیں۔ ان موقعوں پہ زمانہ قدیم کے چشموں کو پھولوں سے بڑی خوبصورتی اور انوکھے طریقوں سے سجایا جاتا ہے۔ ملک بھر میں یوم مئی (یکم مئی) کی مختلف رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ گھروں کو قسم قسم کے پھولوں سے آراستہ پیراستہ کیا جاتا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں درختوں کی سبز ٹہنیاں اٹھاتے بازاروں میں سے گزرتے ہیں۔ اور یہ جلوس ایک ایسی جگہ جا کر ختم ہوتا ہے جہاں پھولوں سے سجا ہوا ایک کھمبا اس موقع کے لئے نصب ہوتا ہے۔ نوجوان عورتیں اور مرد اس کے گرد رقص کرتے ہیں اور آخر میں حسین ترین لڑکی کو ملکہ بہار منتخب کر کے اسے پھولوں کا تاج پہنایا جاتا ہے۔

حمد کا ترانہ

اس روز نوجوان بہروپ بھرتے ہیں۔ اور مورلیس رقص میں حصہ لیتے ہیں۔ اس روز علی الصبح مگڈالین کالج کے مینار سے لاطینی زبان میں حمد کا ترانہ گایا جاتا ہے۔ اور اس تقریب کی ابتدا ہوتی ہے

مخصوص مقامی تقریبات کے موقعوں پہ خاص قسم کی خوراک ہوتی ہے۔ مثلاً ایک قصبے میں وہاں کے لوگ ایک ایسی رسم کی پابندی کرتے چلے آرہے ہیں جس کی ابتدا ۱۲۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اس تقریب میں ایک خاص قسم کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مسرور جوڑے کو بطور اعزاز پیش کیا جاتا ہے۔ جو بھری محفل میں یہ اعلان کرے کہ اس نے ایک سال اور ایک دن کے دوران میں سوتے یا جاگتے کبھی اس بات کا افسوس نہیں کیا ان کی باہم شادی کیوں ہوئی۔ اسٹریٹفورڈ۔ آن۔ایوان میں ہر سال ولیم شیکسپیئر کی برسی کے موقع پر بیل کا گوشت بھون کر کھایا جاتا ہے۔ وہٹیبل اور کالچسٹر میں مچھلی کے شکار کے موسم کا افتتاح وہاں کے میئر کرتے ہیں۔ اور اس موقع پر خوش ذائقہ کستورا مچھلی سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔

خیرات کی رقم

ایسٹر کے موقع پر بہت سے برطانوی دیہاتوں میں خاص قسم کے کیک، میٹھے کلچے بسکٹ اور ان کے ساتھ چاندی کے سکے بیواؤں اور غرباء میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ایسٹر کے دنوں میں اتوار سے قبل جمعرات کے روز برطانیہ کا فرمانروا ویسٹ منسٹر ایبے میں غرباء کو خیرات تقسیم کرتا ہے۔ اس موقع پر فرمانروا کی عمر کے سالوں کے مطابق غرباء ایبے میں موجود ہوتے ہیں۔ اور عبادت کے بعد فرمانروا اپنے دست اپنے ہاتھوں سے ہر ایک کو ایک تھیلی پیش کرتا ہے۔ جس میں چاندی کے وہ سکے ہوتے ہیں۔ جو اس خاص تقریب کے لئے ڈھالے جاتے ہیں۔ اور انہیں خیرات کی رقم کہا جاتا ہے۔

دولت مشترکہ میں کرکٹ وجہ اتحاد ہے؟

کوئی شخص ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا ہے کہ آیا دولت مشترکہ میں کرکٹ وجہ اتحاد ہے یا یہ محض حسن اتفاق ہے۔ کہ وہ لوگ جو کرکٹ کھیلتے ہیں۔ وہ دولت مشترکہ ممالک ہی میں رہتے ہیں۔ تاہم یہ امر یقینی ہے کہ ویلڈ (جنوبی انگلستان) میں جس کھیل نے دیہاتیوں کے کھیل کی حیثیت سے نشوونما پائی تھی آج

ان کے عظیم ترین مشترکہ دلچسپیوں میں سے ایک ہے۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ کرکٹ نے دولت مشترکہ کے بندھن کو مضبوط تر کر دیا ہے۔

یہ کھیل بحریہ کے ذریعہ کورفو پہنچا۔ اور پھر جنوبی سمندری جزیروں میں بھی سب سے پہلے کرکٹ کے کھلاڑی ملاح تھے۔ یہاں کے باشندے اس کھیل کے اس قدر شائق تھے کہ انہوں نے بین دیہاتی میچ شروع کر دیئے اور ایک طرف سو یا اس سے بھی زیادہ کھلاڑی بعض اوقات تو ایک ہفتہ تک کھیل جاری رکھتے تھے۔ اور اس عرصہ میں انہیں فصلوں کی طرف توجہ دینے کا موقعہ بھی نہ ملتا تھا۔ فصلوں سے اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سموآ اور ٹونگا میں کرکٹ کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا گیا۔

ایسے ریکارڈ موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر، بلجیم، فرانس، ہانگ کانگ، ارجنٹینا، اسپین، پرتگال اور جرمنی میں کرکٹ کافی عرصہ سے کھیلی جاتی رہی ہے۔ لیکن کھیلنے والے زیادہ تر انگریز تھے جنہوں نے ان ملکوں میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ یا ملازمت کیلئے گئے ہوتے تھے۔

امتیازی خصوصیات

کرکٹ کے اہم اصول ہر جگہ ایک سے ہیں۔ لیکن مسلمہ کرکٹ کے کھلاڑی ملکوں میں سے ہر ملک بلا شبہ اس کھیل کے سب سے بڑے مبلغ انگریز ملاح ہی رہے ہیں۔ انگلستان کے باہر کرکٹ کا پہلا تذکرہ ایک جہاز کے پادری ہنری ٹیونگے کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ۱۶۷۶ء میں برطانیہ کی شاہی بحریہ کے افسروں نے الیپو کے باہر میدانوں میں کرکٹ کھیلی۔ کیپٹن پیری کے اس جزیرہ میں جس میں شمالی مغربی راستہ کی دریافت کے سلسلے میں دوسرے سفر کا حال درج ہے۔ ایک باتصویر صفحہ بھی ہے۔ جو اس کے سرورق کے مقابل ہے اس تصویر میں اس کے ساتھیوں کو ۱۸۲۲ء میں برف میں ڈھکے مقام پر کرکٹ کھیلتے ہوتے دکھایا گیا ہے۔

مختلف طرز سے کرکٹ کھیلتا ہے۔ جسمانی خصوصیات سے قطع نظر، غرب الہند کی ٹیم کھیل کے میدان میں ہندوستان کی ٹیم سے اسی قدر مختلف ہے جتنی آسٹریلیا کی ٹیم نیوزی لینڈ کی ٹیم سے مختلف ہے۔ یا جس طرح ہندوستان کی ٹیم پاکستان کی ٹیم سے مختلف ہے سر ڈونلڈ بریڈ مین، رانجی، ڈڈلی، نورس، فرینک

دریل اور پلیٹرے کی عظیم الشان بلڈنگ میں ان کے اپنے ملک کا مزاج رچ بس گیا ہے۔

برطانیہ کی پہلی کرکٹ کی ٹیم نے سمندر پار ممالک کینیڈا اور امریکہ کا پہلا دورہ ۱۸۵۹ء میں کیا لیکن آج کل امریکہ میں سوائے ہالی ووڈ کی برطانوی نوآبادی، الی نوس اور فلاڈلفیا کے کہیں اور یہ کھیل نہیں کھیلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کینیڈا نے جس کی آبادی بھی مختصر ہے ۱۹۵۲ء میں کرکٹ ٹیم انگلستان میں مقابلہ کے میچوں میں کھیلنے کے لئے بھیجی تھی۔

آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، غرب الہند نیوزی لینڈ پاکستان اور ہندوستان کو ٹیسٹ میچوں کا معیار حاصل ہو گیا ہے۔ اور اب لنکا کو بھی یہ رتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ فیجی کی ٹیمیں نیوزی لینڈ کا دورہ کر چکی ہیں۔ اور انہوں نے وہاں شاندار کرکٹ کھیلی ہے۔ اور اس نئے سال میں میرل بون کرکٹ کلب نے کینیا ٹانگانیکا اور یوگنڈا میں میچ کھیلے ہیں، دوسرے صرف دو ممالک ایسے ہیں جن کی کرکٹ کے معیار کو کسی حد تک سراہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ کھیل کے معیار کے لحاظ سے یہ دونوں بھی فجی، لنکا، مشرقی افریقہ یا کینیڈا سے بہت پیچھے ہیں، کوئی بھی شہنشاہی طاقت، عوام کو ان کی مرضی کے خلاف کرکٹ کھیلنے پر مجبور نہیں کر سکتی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب پیچیدہ اور مشکل معلوم ہوگی۔ اور بعض کے لئے ناقابل فہم بھی لیکن یہ ان لوگوں کو عجیب نہیں معلوم ہوتا ہے جنہوں نے انگریزی زبان استعمال کی ہے۔ یا جنہیں کافی عرصہ تک انگریزوں کی مجلس حاصل رہی ہے۔

ایک وقت آئے گا جب کہ کرکٹ کے یہ کھلاڑی کھیل کا اعلیٰ معیار حاصل کر لینگے۔ اور جنوبی افریقہ میں بھی کرکٹ کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اکثر یہ چیز زیر بحث رہی ہے کہ کرکٹ بھی ایک قسم کی جنگ ہے۔ جو بغیر خون خرابے کے لڑی جاتی ہے۔ یقیناً ایک عام برطانوی کے لئے بھی یہ امر ضرور تکلیف دہ ہوگا۔ کہ کسی ایسے ملک سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے جائیں جس کی کرکٹ ٹیم نے سرزمین انگلستان میں متعدد ٹیسٹ میچ کھیلے ہوں۔

پاکستان کے لیے نئی نئی کتابیں

برطانوی ہائی کمشنر مقیم پاکستان سر الیگزینڈر سائمن نے گذشتہ دنوں کراچی یونیورسٹی کے

وائس چانسلر کو چھ سو کتابیں پیش کیں۔ اس سال برطانیہ کی جانب سے پاکستان کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کو جو کتابیں ملنے والی ہیں ان کی یہ پہلی کھیپ ہے۔ یہ کتابیں کولمبو منصوبہ کی فنی امداد باہمی اسکیم کا ایک جزو ہیں اور ان کی مجموعی قیمت کا جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ چار لاکھ روپے سے زیادہ ہے

کتابوں کا یہ تحفہ پیش کرتے ہوئے ہائی کمشنر نے کہا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتابیں نہ صرف اس عظیم یونیورسٹی کے طلبا کے لیے مفید ہوں گی بلکہ یہ ان کے کردار بنانے میں معاون ہوں گی۔ اور اس طرح وہ پاکستان کو ترقی اور عروج دینے میں مددگار ہوں گے۔

انھوں نے وضاحت سے بتایا کہ کتابوں کی یہ کھیپ آئندہ چل کر بہت سی برطانوی کتابوں کی پاکستان میں آمد کا پیش خیمہ ہوگی جو پاکستان کے تعلیمی اداروں کو بھیجی جانے والی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتابوں کے انتخاب کا جہاں تک تعلق ہے کالجوں کے سربراہوں اور لائبریریوں کے انچارجوں کو مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ برطانیہ کی معیاری کتابوں کی جدید ترین فہرستوں سے اپنی ضروریات کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرلیں۔ ایک سو بیس سے زائد ذرائع سے فہرستیں حاصل ہوئی ہیں اور بہت سی ابھی تک موصول ہو رہی ہیں۔

اصل مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے دونوں صوبوں کے تعلیمی اور تحقیقاتی اداروں میں چھوٹی لیکن خود کفیل فنی لائبریریاں قائم کی جائیں۔ کتابیں حاصل کرنے والے اداروں میں یونیورسٹیوں کے سائنس کے شعبے، اساتذہ کے تربیتی کالج، سائنسی اور تحقیقات کی کونسلیں اور تقریباً چالیس ڈگری کالج شامل ہیں۔

آموزش

۱ شمارہ ۲] لاہور [مئی ۸

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد }

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش
لاہور

مئی ۱۹۵۸ء

جلد ——— ۱۱
شمارہ ——— ۲

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ایک اہم تعلیمی اجتماع

ایم اے مخدومی

آئندہ تعطیلات گرما میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور واشنگٹن سٹیٹ کالج مل کر اساتذہ کے لیے جس تجدیدی نصاب کا اہتمام کر رہے ہیں اس کی تمہید کے طور پر سنٹرل ٹریننگ کالج میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جو ۲۶ سے ۲۸ اپریل تک جاری رہی اور جس میں لاہور ڈویژن کے بہت سے صدر معلموں اور صدر معلمات نے شرکت کی۔ استادوں اور صدر معلموں کے اجتماع عموماً ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ پہلا اجتماع تھا جس میں صدر معلموں اور صدر معلمات نے باہم مل کر ملک کے تعلیمی مسائل پر غور کیا۔

کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے عمر کا بڑا حصہ بچوں اور بچیوں کو تعلیم دینے میں صرف کیا ہے ان کے تجربوں اور مشاہدوں کو یکجا کر کے اہم تعلیمی مسائل کا ایک عام جائزہ لیا جائے۔ تاکہ آئندہ جولائی میں جب استادوں کی ایک جماعت سوات میں جمع ہو تو وہ انھی خطوط پر سوچ بچار کر سکے۔ کانفرنس نے اپنے سہ روزہ مذاکرات میں ایسے بہت سے مسائل پر غور و فکر کیا جن سے ملک کے بیشتر مدارس دوچار ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم مسائل یہ تھے

(۱) تدریس انگریزی کو موثر بنانے کی تدابیر (۲) ثانوی مدارس میں ریاضی کا مقام (۳) استادوں کی دوران ملازمت بالیدگی کی ضرورت (۴) درسی کتابوں کا مسئلہ (۵) تعلیمی معیاروں کی پستی (۶) طلبہ کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کی ضرورت۔

یہ مسائل ایسے ہیں جو تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی توجہ کے مستحق ہیں۔ آزادی کی

آمد کے ساتھ تعلیم میں عوامی دل چسپی کافی بڑھ گئی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ نظامِ تعلیم اور مدرسوں کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی ہونے لگی ہے۔ اخبارات و رسائل کے علاوہ عوامی رہنما بھی اکثر حالتوں میں مروجہ نظامِ تعلیم پر آئے دن لے دے کرتے رہتے ہیں۔ یہ نکتہ چینی بسا اوقات خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اکثر یہ نکتہ چینی واقعات و حقائق سے لاعلمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور تو اور بعض صورتوں میں خود اساتذہ صحیح صورتِ حال سے واقف نہیں ہوتے تعلیمی اجتماعوں کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ واقعات و حقائق کو منظرِ عام پر لانے میں مدد دیتے ہیں۔

دورِ حاضر میں انسان کی اجتماعی زندگی جس تیز رفتار تبدیلی کی زد میں ہے۔ اس کی مثال تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔ اس صورتِ حال کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مختلف معاشرتی مسائل کا جائزہ بار بار لیا جاتا رہے اور فرسودہ راہوں سے ہٹ کر ان کے نئے حل تلاش کیے جائیں۔ اجتماعی فکر اس سمت میں پہلا قدم ہے۔ مگر ہم نے ابھی اجتماعی فکر سے مؤثر خدمت لینا نہیں سیکھا۔ جس کانفرنس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا اہتمام ایک سرکاری ادارے کی طرف سے کیا گیا تھا۔ پھر اس میں صرف تعلیم و تعلم سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ شامل نہ تھے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایک عرصے سے یہ حقیقت تسلیم کی جا چکی ہے کہ بچوں کی تعلیم خالصتہً ایک عوامی مسئلہ ہے، جس کے متعلق ماہرینِ تعلیم اور عوام کو مل کر سوچنا چاہیے۔ ہم ابھی اس منزل سے دور ہیں۔ تاہم یہ امر طمانیت بخش ہے کہ ہمارے تعلیمی رہنما اجتماعی فکر کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ استادوں اور معلموں کے اجتماع اس دن کو قریب تر لا رہے ہیں، جب استاد اور عوام مل کر ہر قسم کے تعلیمی مسائل حل کیا کریں گے ۔

تعلیمی معیاروں کی پستی

فضل احمد

امتحانی نتائج

آزادی کی آمد کے بعد سے یہ شکایت ہر جگہ سنی جا رہی ہے کہ تعلیمی معیار دن بدن گرتے جا رہے ہیں سکولوں اور کالجوں سے جو نوجوان فارغ ہوتے ہیں وہ پہلے کی نسبت کم علم اور کم صلاحیت ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس قسم کی شکایت بعض اوقات ترقی یافتہ ملکوں میں بھی سنی گئی ہیں اور شاید آج بھی سنی جاتی ہوں۔ مثلاً پہلی عالمی جنگ کے بعد جب ترقی پسند طریقہ ہائے تدریس کو مغرب میں رواج ملا تو بہت سی آوازیں یہ کہتی سنی گئیں کہ مدرسوں کی جدت پسندی نے تعلیمی معیاروں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ اعتراض کرنے والے لوگ روائتی طریقہ ہائے تدریس اور روائتی نصاب کے اس قدر دلدادہ تھے کہ وہ ان سے ذرا سے انحراف کو بھی تعلیمی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے لیکن ترقی پسند مدرسوں نے ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔ روائتی طریقہ ہائے تدریس اور جدید طریقوں کو پہلو بہ پہلو رائج کر کے دونوں کے نتائج کا موازنہ کیا گیا۔ اس قسم کے کئی تجربے ہوئے اور ہر بار یہی ثابت ہوا کہ گو روائتی طریقے بچوں کے ذہن کو طرح طرح کے الفاظ و عبارات سے لادنے میں خوب کامیاب ہیں مگر وہ ان الفاظ و عبارات کا کوئی قابل ذکر فہم پیدا نہیں کرتے۔ فہم پیدا کرنے کے معاملے میں جدید طریقہ ہائے تدریس کی برتری پورے طور پر ثابت ہو گئی اور اعتراض کرنے والی آوازیں رفتہ رفتہ خاموش ہو گئیں۔

مگر ہماری صورت حال مختلف قسم کی ہے۔ مغرب میں تعلیمی معیاروں سے بے اطمینانی اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ ان تعلیمی مقاصد کو قصداً بدل دیا گیا تھا۔ صدیوں سے تدریس کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ طرح طرح کی کتابی معلومات ازبر کرا دے۔ موجودہ صدی کی نفسیاتی تحقیقات نے اس ذہنی بوجھ کو ذہنی بالیدگی کی دلیل قرار دینے سے انکار کر دیا۔ تجرباتی شہادت نے یہ بات ثابت کر دی کہ ذہنی بالیدگی اور فہم کا چولی دامن کا

ساتھ ہے تعلیم خالصتاً بالیدگی کا نام ہے۔ اس لیے اسے فہم کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ حافظے پر طرح طرح کے بوجھ لادنے کی بجائے عادات واطوار میں پسندیدہ تبدیلی پیدا کرے۔ ایسی تبدیلی جو آئندہ زندگی کا راستہ آسان اور خوشگوار بنا دے۔ غرض بیسویں صدی کے نفسیاتی انکشافات نے تعلیم کے مقاصد میں بنیادی تبدیلی پیدا کردی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس بھی بدلے۔ جو لوگ روایتی مدارس کے مداح تھے انھیں یہ تبدیلی پسند نہ آئی۔ اوّل اوّل اکثریت انھی لوگوں کی تھی۔ مگر جب نئے نصاب تعلیم نے عملی آزمائش کے ترازو میں اپنی فوقیت ثابت کردی تو یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ تعلیمی معیار گرنے کی بجائے بلند تر ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کا معاملہ بالکل جداگانہ نوعیت کا ہے۔ ہمارے نصاب تعلیم یا طریقہ ہائے تدریس میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آئی۔ ہمارے نصاب تعلیم کے سامنے آج بھی وہی روایتی مقاصد موجود ہیں جو پچھلی صدی کے وسط میں اس کے پیش نظر تھے۔ مدارس کی تمام دوڑ دھوپ مختلف مضامین از بر کرانے اور اچھے امتحانی نتائج دکھانے پر ختم ہو جاتی ہے۔ انھیں سیرت سازی یا تشکیل کردار سے کوئی غرض نہیں مگر روایتی مقاصد کے برقرار رہنے کے باوجود یہ احساس بہت عام ہے کہ تعلیمی معیار گرتے جا رہے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسروں کو شکایت ہے کہ مدرسے جو طلبہ ان کے حوالے کر دیتے ہیں وہ دن بدن کمتر استعداد ساتھ لے کر آتے ہیں۔ دفتروں اور دوسرے اداروں کو شکایت ہے کہ مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے جو نوجوان فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں وہ نہ صرف بنیادی علمی مہارتوں کے معاملے میں فرومایہ نظر آتے ہیں بلکہ اکثر حالتوں میں موجودہ دنیا سے بھی بے خبر۔ تعلیمی معیاروں کی پستی کی شکایت ذمہ دار سرکاری افسر اور عوامی رہنما بھی کرتے سنے جاتے ہیں۔

یہ شکایت محض ظن و قیاس کی پیداوار نہیں۔ بعض افسوس ناک حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک فیصلہ کن شہادت امتحانی نتائج کی ہے۔ ذیل میں پنجاب کے بعض اہم ترین امتحانات کے متعلق اعداد و شمار درج ہیں۔

سامنے صفحہ پر ملاحظہ ہو

میٹرکولیشن امتحان

سال	امیدواروں کی تعداد	کامیاب ہونیوالوں کی تعداد	تناسب فی صد
۱۹۴۷ء	۴۲۶۲۲	۲۸۴۷۱	۶۷٫۴
۱۹۵۵ء	۴۸۵۳۲	۲۳۲۰۸	۴۷٫۸

انٹرمیڈیٹ امتحان

۱۹۴۷ء آرٹس	۷۰۴۶	۴۲۰۹	۵۹٫۴
سائنس نان میڈیکل	۲۳۱۰	۱۴۰۱	۶۰٫۶
سائنس میڈیکل	۱۰۷۰	۶۱۸	۵۷٫۳
۱۹۵۵ء آرٹس	۸۴۲۶	۲۸۰۰	۳۳٫۲
سائنس نان میڈیکل	۲۲۵۱	۷۰۳	۳۱٫۲
سائنس میڈیکل	۲۱۰۱	۶۶۰	۳۱٫۴

بی۔ اے امتحان

۱۹۴۷ء بی۔ اے	۵۰۳۰	۲۴۷۰	۴۹٫۲
بی۔ ایس سی	۶۴۹	۲۹۲	۴۵٫۶
۱۹۵۵ء بی۔ اے	۳۶۹۵	۸۲۵	۲۲٫۸
بی۔ ایس سی	۹۲۵	۳۳۸	۳۶٫۳

یہ اعداد و شمار اپنی کہانی خود بیان کرتے ہیں تقسیم ملک کے وقت سے لے کر اب تک امتحانی نتائج میں جو انحطاط رونما ہوا ہے وہ بے حد تشویش ناک ہے۔ یہ نتائج قیمتی قومی وسائل کے ایسے ضیاع کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پاکستان جیسے مفلس ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ مختلف امتحانوں میں کامیاب طلبہ کا فی صد تناسب اگرچہ بے حد افسوس ناک ہے مگر اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ جو امیدوار ان امتحانوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی استعداد کے متعلق بھی شکایات سننے میں آتی ہیں۔

چند در چند اسباب

تعلیمی معیاروں کی اس پستی کا ذمہ دار مختلف اسباب کو ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ پست تعلیمی معیار کسی ایک سبب کی پیداوار نہیں۔ تعلیم اور زندگی کے درمیان نہایت گہرے رشتے موجود ہیں۔ ہم اس وقت ایک تیز اور معاشرتی انقلاب ہی سے گزر رہے ہیں۔ اس انقلاب نے زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح مدرسے کو بھی شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ اس لیے اسباب کی تلاش کرتے وقت ہمیں اس مسئلے کے گوناگوں پہلوؤں کا پوری طرح جائزہ لینا چاہیے۔

اسباب کی بحث سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ روایت پسند مدرسے کے سامنے اہم ترین مقاصد نوشت و خواند کی مختلف مہارتیں ہوتی تھیں۔ یہ مدرسہ قرات، ہجے، قواعد زبان، خطاطی وغیرہ کو توجہ کا مرکز بناتا تھا اور عام صورتوں میں اس کے فارغ التحصیل طلبہ ان مہارتوں میں اچھی خاصی دسترس ساتھ لے کر آتے تھے۔ مگر جدید سائنسی تہذیب نے ان مہارتوں کی اہمیت پہلے سے کم کر دی ہے۔ بے شک اچھے مقرر اور اچھے ادیب کی آج بھی وہی قدر و قیمت ہے جو پہلے تھی مگر بعض سائنسی ایجادوں نے ان مہارتوں کو مرکزی حیثیت سے محروم کر دیا ہے۔ مثلاً ٹائپ رائٹر کی ایجاد نے خطاطی کی اہمیت گھٹا دی ہے اسی طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے خطابت اور قصہ خوانی کے فن کو پہلے کی طرح اہم نہیں رہنے دیا۔ اسی طرح ریڈیو اور متحرک فلم نے کتاب خوانی کی ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ ان تمام عوامل کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ گو ابتدائی مدرسہ بنیادی مہارتوں کو اب بھی اپنے نصاب کا محور بنائے ہوئے ہے۔ ثانوی درجے اور کالج میں ان مہارتوں کو پہلے کی طرح اہم نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً ایک مغربی مصنف کا اس ضمن میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"اگر میرے طالب علم کو بعض مشکل الفاظ کے ہجے معلوم نہیں تو یہ کوئی بڑی خامی نہیں۔ وہ بوقت ضرورت لغات میں سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ مناسب برتاؤ کرنا ضرور آنا چاہیے۔ یہ وہ چیز ہے جو بوقت ضرورت کسی حوالے کی کتاب سے اخذ نہیں کی جا سکتی۔ یہ اس کی سیرت کا جزو ہونی چاہیے۔"

ہم روزمرہ زندگی میں ابھی سائنسی ایجادوں سے اس حد تک خدمت نہیں لیتے جس حد تک ترقی یافتہ ملکوں میں لی جاتی ہے تاہم اس عالمگیر رجحان کا اثر ہمارے ہاں بھی نمایاں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قرات، خوش نویسی

ہجا، پہاڑے وغیرہ آلاتی مضامین پہلی سی توجہ سے محروم رہتے ہیں۔ جو لوگ روایت پسند مدرسوں میں پڑھے ہیں انھیں یہ چیز ایک بہت بڑا عیب دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جدید نوجوان گو بنیادی مہارتوں کے معاملے میں پہلے وقتوں کے طلبہ کی طرح کمال حاصل نہ کرے۔ وہ زندگی کے عام معاملات میں نسبتاً زیادہ چوکس اور ہوشیار نظر آتا ہے۔ وہ چھوٹے موٹے مشینی کل پرزوں اور اوزاروں کو بڑی آسانی سے استعمال کر لیتا ہے۔ اس چیز کو روایتی مہارتوں میں فروتر کمال کی تلافی خیال کرنا چاہیے۔

اس کے باوجود ہمارے امتحانی نتائج کی داستان بدستور افسوسناک ہے اور ہمیں اس صورت حال کے اسباب ڈھونڈنے چاہئیں۔ ذیل میں ان اسباب پر مختصر بحث کی جاتی ہے۔

اساتذہ

دنیا بھر کے ماہرین تعلیم اس بات پر یک زبان ہیں کہ تدریس کو موثر بنانے والے عوامل میں استاد سرفہرست ہے۔ مدرسے کی عمارت، اس کا سازوسامان اور دوسرے لوازمات بے شک ضروری ہیں مگر ان تمام عناصر کو زندگی بخشنے والی شے استاد کی شخصیت ہے۔ اگر استاد نفس مضمون پر پوری طرح حاوی ہے اور اپنے علم کو ہمیشہ تازہ رکھتا ہے۔ اگر وہ طلبہ کا دل سے بہی خواہ ہے اور ان کے انفرادی مسائل کا ہمدردی سے مطالعہ کرتا ہے۔ اگر وہ اپنا روزمرہ کا کام ایک اجیر کی طرح نہیں بلکہ ایک بلندتر مقصد کے تحت انجام دیتا ہے، اگر اس میں یہ خوبیاں موجود ہیں تو اس کی شخصیت کی تاثیر مادی سازوسامان کی بیشتر کمیوں کو پورا کر لے گی۔ غرض درس و تدریس کے عمل میں استاد کو ایسی مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ جہاں تعلیمی معیاروں کے لگاتار گرنے کی حقیقی شکایت موجود ہو وہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مدرسوں کو موزوں قسم کے استاد کافی تعداد میں نہیں مل رہے۔

جب ہم اپنے تعلیمی اداروں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت بہت جلد عیاں ہو جاتی ہے کہ خواہ کالج ہو یا مدرسے، پیشہ معلمی میں نئے بھرتی ہونے والے لوگ پہلے کے مقابلے میں عموماً کمتر استعداد اور فروتر علمیت کے مالک ہیں۔ آزادی کی آمد سے پہلے محکمہ تعلیم کے تقریباً تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کے پاس تھے اور قابل سے قابل ہندوستانیوں کو بھی نچلے عہدوں پر قانع رہنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھانے والے استاد عموماً غیر معمولی استعداد کے لوگ ہوتے تھے۔ ان فاضل استادوں سے پڑھے ہوئے گریجوایٹ

ہائی سکولوں میں آتے تھے اور اپنے ساتھ علمی پیاس کا ایک سرگرم جذبہ لاتے تھے۔ جو ثانوی مدرسوں کے طلبہ کو بھی ان کے مقدور کے برابر مل جاتا تھا۔ آزادی کی آمد سے پہلے ہی محکمہ تعلیم کے اعلیٰ انتظامی عہدے ہندوستانیوں کو ملنے لگے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے قابل استاد انتظامی عہدوں پر فائز ہونے لگے اور ان کی جگہ کمتر درجے کے لوگوں نے سنبھالی۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد یہ عمل بے حد تیز ہوگیا۔ آزاد زندگی کے ساتھ دوسرے محکموں کی طرح محکمہ تعلیم میں بھی تیزی سے توسیع ہوئی۔ نئے نئے انتظامی عہدے وجود میں آنے لگے۔ ہندو استادوں کے انخلا سے تعلیمی اداروں میں پہلے ہی بہت بڑا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ جو گنتی کے قابل استاد باقی رہ گئے تھے۔ وہ انتظامی عہدوں کے پیچھے بھاگے۔ دوسرے لوگوں کی طرح محکمہ تعلیم کے لوگ بھی اقتدار کے متوالے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ اس محکمہ کے کئی ایک نامور اشخاص اس محکمہ کو خیرباد کہہ کر وزارتوں، سفارتوں اور اس قسم کے دوسرے حکومتی منصبوں پر فائز نظر آنے لگے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دوم درجے کی استعداد رکھنے والوں کو بھرتی کیا جائے۔ اس پر طرہ یہ کہ آزادی کی آمد کے بعد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ پروفیسری اور لیکچراری کے دروازے ہر کس و ناکس پر کھل گئے وہ لوگ جنھیں ۱۹۴۷ء سے پہلے ثانوی مدارس میں بھی مدرسی نہ ملتی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے لگے۔

جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اکثریت ایسے استادوں کی ہو تو ان کے فارغ التحصیل گریجوایٹوں کے علمی ذوق اور ذہانت نگاہ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہی گریجوایٹ استادوں کی تربیت گاہوں میں فنی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ تربیت کا عرصہ کوئی چھے ماہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ تربیت گاہیں اپنی بہترین کوششوں کے باوجود زیرِ تربیت استادوں کے عام ذہنی افق میں کوئی قابل ذکر کشادگی پیدا نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا یہ نیم پختہ استاد اپنی ساری علمی بے بضاعتی اور ذہنی بے مائیگی کے ساتھ سال بسال ثانوی مدرسوں میں بھرتی ہوتے جاتے ہیں اور تعلیمی معیاروں کو نیچے کھینچنے کا ایک اہم سبب بنتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ثانوی اساتذہ تمام کے تمام صرف آرٹس

کالجوں کی پیداوار نہیں بلکہ ان کا ایک خاصہ معقول تناسب ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے منشی فاضل یا ادیب فاضل وغیرہ کے ذریعے بی اے پاس کیا ہوتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اس قسم کے گریجوایٹوں پر ٹریننگ کالجوں کے دروازے بند تھے۔ مگر آزادی کی آمد کے ساتھ ان پر یہ دروازے چوپٹ کھل گئے اس میں کلام نہیں کہ منشی فاضل وغیرہ کے امتحانات ایسے نادار نوجوانوں کو زندگی میں کچھ آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں جو مالی مجبوریوں کے باعث سکول اور کالج کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ اصولاً یہ ایک اچھی بات ہے جس معاشرے نے اعلیٰ ذہانت کی تلاش کا کوئی انتظام نہ کر رکھا ہو اور جہاں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کافی گراں ہو وہاں اس قسم کی سہولت موجود رہنی چاہیے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ منشی فاضل وغیرہ امتحانوں کا نصاب از حد ناقص ہے۔ یہ نصاب تمام تر زمانہ وسطیٰ کی چند کتابوں پر مشتمل ہے جنھیں عہد حاضر سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس نصاب میں نہ جدید سائنس کی مبادیات کو داخل کیا گیا ہے نہ جدید معاشرتی علوم کی ابجد کو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جنھوں نے عمر بھر مدرسے کی شکل نہیں دیکھی ہوتی چند فرسودہ قسم کی فارسی کتابوں کو رٹ کر منشی فاضل پاس کر لیتے ہیں۔ پھر انگریزی کی چند کتابیں رٹ رٹا کر بی اے میں نکل جاتے ہیں اور ازاں بعد چند ماہ ٹریننگ کالج میں گذار کر ثانوی تعلیم کے ماہر اور ثانوی مدرسوں کی کشتی کے ناخدا بن جاتے ہیں ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

جن لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا کی زمین کی وسعت کیا ہے اور اس پر کون کون سی قومیں بستی ہیں جن کو اس امر کا ذرا سا فہم نہیں کہ جدید سائنس زندگی کے لیے کیا امکانات رکھتی ہے وہ اس ایٹمی دور میں نئی پود کی تربیت کرنے والے بن جاتے ہیں! غرض ہمارے ثانوی مدارس میں جن دو سرچشموں سے نئے استاد بھرتی کیے جا رہے ہیں وہ دونوں ہی ناقص ہیں۔ یہ استاد نہ صرف ثانوی تعلیم کا کام انجام دیتے ہیں بلکہ ابتدائی اور مڈل جماعتوں کے لیے استاد بھی تیار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا ذہنی افلاس نیچے کی طرف چھنتا ہوا پوری قوم کو متاثر کر رہا ہے۔

ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو خرابی کی ساری ذمہ داری ابتدائی مدرسوں پر ڈالتے ہیں۔ ان کا استدلال

یہ ہے کہ اگر ابتدائی مدرسے اپنا کام اچھی طرح انجام دیں تو ثانوی مدرسوں میں داخل ہونے والے بچے قابلِ اعتماد تعلیمی بنیاد ساتھ لے کر آئیں اور یوں ثانوی تعلیم کی ساری خامیاں رفع ہو جائیں اور آگے چل کر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم از خود صحت مند بن جائے۔ یہ استدلال دیکھنے میں خوب معقول معلوم دیتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر ابتدائی تعلیم کی خوبی میں فرق کیوں آیا۔ اس کا جواب ضرور یہ ملے گا، کہ ابتدائی مدرسوں میں پڑھانے والے استاد پہلے سے نہیں رہے۔ اس بات کی ذمہ داری بدیہی طور پر ان اداروں پر ہے جنہوں نے ابتدائی اساتذہ کو پڑھایا اور تربیت دی۔ چناں چہ خرابی کی ذمہ داری فوراً ثانوی اساتذہ کے کندھوں پر آن ٹکتی ہے۔ مگر ثانوی اساتذہ صحیح قسم کے کیوں نہیں؟ اس لیے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انہیں صحیح زول قسم کی تعلیم و تربیت نہیں دی گئی۔ اس طرح آخری ذمہ داری ان پروفیسروں اور لیکچراروں پر عاید ہوتی نظر آتی ہے جو علم و دانش کے سرچشمے ہونے کے دعویدار ہیں۔ مگر فی الحقیقت ان میں وہ علمی ذوق اور وہ وقت نگاہ نہیں جو ان کے پیش روؤں میں ہوا کرتی تھی۔

بھاری جماعتیں

تعلیمی معیاروں کے گرنے کی ایک اور بڑی وجہ پُرہجوم جماعتیں ہیں۔ ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ موثر تدریس کے لیے مدرسے کی کوئی جماعت پچیس تیس طلبہ سے زیادہ پر مشتمل نہ ہونی چاہیے۔ ہمارے ضابطۂ تعلیم نے فی جماعت تعداد کی آخری حد ۴۵ قرار دے رکھی ہے۔ مگر طلبہ کی بے پناہ بھیڑ کا حال یہ ہے کہ لاہور میں سو سو بلکہ اس سے زیادہ کی جماعتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ آزادی کی آمد کے ساتھ تعلیم کی پیاس جس تیزی سے بڑھی ہے اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں یعنی تقسیمِ ملک سے دو سال پہلے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میٹرک میں ۲۴ ہزار امیدوار شریک ہوئے تھے۔ اب اگرچہ مشرقی پنجاب کے اضلاع ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ لیکن امتحان میٹرک میں شریک ہونے والوں کی تعداد تقریباً ڈیوڑھی ہو گئی ہے۔ اگر نئے مدرسے بھی اسی رفتار سے تعمیر ہوتے تو آج خوفناک طور پر پُرہجوم جماعتیں دیکھنے میں نہ آتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ صرف یہی نہیں تقسیمِ ملک سے پہلے جو عمارتیں سکولوں اور کالجوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ان میں سے کئی آج تک غیر تعلیمی کاموں کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں طلبہ کی تعداد

بے حد بڑھ گئی ہے وہاں تعلیمی اداروں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ بات ذیل کے نقشہ سے واضح ہو جائیگی۔

کالجوں کی تعداد

	قبل از تقسیم	اس وقت
گورنمنٹ کالج	۱۶	۲۱
غیر سرکاری کالج	۴۰	۱۲
پیشہ ورانہ کالج	۲۲	۱۲
کل	۸۱	۴۸

مدرسوں کی تعداد

گورنمنٹ سکول	۱۶۶	۱۴۸
غیر سرکاری مدرسے	۵۵۰	۳۷۴
کل	۷۱۶	۵۲۲

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل افسوس امر ہمارے صاحب ثروت طبقے کی بے حسی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ملک کی تجارتی اور صنعتی زندگی میں جو بھاری خلا پیدا ہو گیا تھا اسے کامیابی کے ساتھ پُر کیا جا چکا ہے، اس کے نتیجہ کے طور پر ملک میں امیر تاجروں اور صنعت کاروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کی خوش حالی کی دلیل وہ بلند و بالا کوٹھیاں اور کارخانے ہیں جو کراچی۔ لاہور۔ لائل پور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ۔ ملتان راولپنڈی۔ پشاور۔ نوشہرہ اور دوسرے اہم شہروں میں سر اٹھائے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان نئے دولت مندوں نے اپنے ذاتی نفع اور آسائش کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے۔ مگر نئی پود کی تعلیم و تربیت پر اب تک تقریباً کچھ خرچ نہیں کیا۔ دنیا کی ہر صاحب بصیرت قوم اس بات میں یقین رکھتی ہے کہ جو روپیہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر لگایا جائے وہ روپے کا سب سے زیادہ نفع بخش مصرف ہے۔ مگر ہمارے تاجروں اور صنعت کاروں کو ابھی اس بات کا یقین نہیں ہوا۔ وہ ذاتی املاک میں یقین رکھتے ہیں۔ قومی بہبود میں یقین نہیں رکھتے۔

طلبہ کی بھیڑ تدریس کے کام کو پوری طرح بے اثر بنا کر رکھ دیتی ہے تعلیم کی بنیاد بچے کی انفرادیت کا احترام ہے۔ پُر ہجوم جماعتوں میں انفرادیت کے بڑھنے پھولنے کے بیشتر مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ استاد کے لیے انفرادی توجہ دینا ممکن نہیں رہتا۔ پُر ہجوم جماعتوں کا بوجھ اور دھکا پیل استاد اور طالب علم دونوں کے جذبۂ عمل کو پژمردہ کر کے رکھ دیتے ہیں مدرسے کا ضبط اور اس کا لائحۂ عمل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے غرض طلبہ کے ہجوم کی مثال اس سیلاب کی سی ہے جو پودوں کو ڈبو کر ان کی نشو و نما کے امکانات ختم کر دیتا ہے۔ یہی پانی اگر موزوں مقدار میں ہوتا تو حیات بخش ثابت ہوتا مگر اس کا تند و تیز ریلا پودوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر لے جاتا ہے اور یا انھیں ڈبو کر ان کی زندگی ختم کر دیتا ہے۔

طلبہ کی بھیڑ کا مسئلہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ موجود ہے، مگر جس شدید صورت میں وہ ہمارے یہاں موجود ہے اس کی مثالیں کم ہیں۔ تدریس کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پُر ہجوم جماعتوں کا فوری تدارک کیا جائے۔ تعمیری سامان کی ہوش ربا گرانی کو دیکھتے ہوئے یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہم مستقبل قریب میں اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لیے معیاری عمارتیں اتنی تعداد میں تیار کر سکیں گے کہ موجودہ بھیڑ کا خاتمہ ہو جائے اس مسئلہ کے حل کے لیے ہمیں کوئی ایسی راہ ڈھونڈنی پڑے گی جو ہمارے حالات اور روایات کے حسب حال ہو

اخلاقی قدروں کا انحطاط

مدرسہ بالآخر عظیم تر معاشرے کا ایک جزو ہے۔ لہٰذا جو آندھیاں اور طوفان معاشرے کو جھنجھوڑتے ہیں وہ مدرسے کو بھی پوری طرح متاثر کرتے ہیں۔ مشرقی معاشرے کی بنیادیں خالصتہً اخلاقی اور روحانی رہی ہیں اس کے برعکس مغرب کی مادی تہذیب مسابقت اور ذاتی نفع کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اسی تضاد کی بنا پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی باہم نہیں مل سکتے۔ مگر ایٹمی دور کے قاہر تقاضوں نے دونوں کو ملنے پر مجبور کر دیا ہے تاہم یہ ملاپ زبردست اور زیردست کا ملاپ ہے۔ نتیجہ یہ ہے مغربی بالادستی نے مشرق کی روایتی قدروں کو متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔ مشرق اس قابل تو ہو نہیں سکا کہ مغرب کی صحت مند قدروں کو اپنا لے۔ البتہ اس نے احساس کمتری کے زیر اثر اپنی قدروں کو ٹھکرانا شروع کر دیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس طرح وہ مغرب کا سا عروج حاصل کر لے گا۔

اس صورتِ حال سے ہمارا مدرسہ پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ پہلے دن سے ہمارے استادوں نے اپنے طرزِ عمل کی بنیاد اسوۂ حسنہ کے اس پہلو پر رکھی تھی جس کے لیے قرآن نے "عزیزٌ علیہ ما عنتّم حریصٌ علیکم بالمومنین رؤف الرحیم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چناں چہ صدیوں تک ہمارے اساتذہ کا امتیازی نشان بے لوث جذبۂ خدمت رہا ہے۔ وہ طلبہ کی بالیدگی میں اپنی بلندی اور ان کی بھلائی میں اپنا نفع دیکھا کرتے تھے۔ استاد اور شاگرد کا باہمی رشتہ لطیف قسم کا روحانی رشتہ تھا۔ شاگرد بھی استاد کا مقام باپ سے بڑھ کر خیال کرتے تھے۔ "کان ابی سببًا لحیوٰۃ الفانیہ وکان استاذی سببًا لحیوٰۃ الباقیہ"

مگر استاد شاگرد کے یہ مراسم اب رفت گذشت ہو چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے غالب رنگ نے استاد اور شاگرد دونوں کو متاثر کیا ہے۔ اب ان کا رشتہ روحانی کی بجائے کاروباری قسم کا بنتا چلا جا رہا ہے طلبہ اور ان کے والدین دونوں یہ خیال کرتے ہیں کہ دوسری چیزوں کی طرح علم و عقل بھی متاعِ تجارت ہے یہی یقین استادوں کی اکثریت کا ہے۔

اس افسوس ناک صورتِ حال نے تدریس کی کیفیت کو تبدیل کر دیا ہے۔ بے شک اس صورتِ حال کی ذمہ داری ایک حد تک ضروریاتِ زندگی کی ہوشربا گرانی پر ہے۔ عام حالتوں میں استاد کی تنخواہ کافی نہیں ہوتی ایک ایسے معاشرے میں جہاں اجتماعی زندگی کی باگ ڈور اخلاقی قدروں کے ہاتھ میں ہو، فاقہ مستی میں بھی دل کی امیری قائم رہ سکتی ہے۔ مگر جس معاشرے پر مادی قدروں کا راج ہو وہاں استاد تھوڑی تنخواہ پر قانع نہیں رہ سکتا۔ وہ دوسروں کی طرح سربلند ہونے کے لیے مادی فراوانی کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے اور اس دھن میں اپنے بیشتر لطیف جذبات کو ختم کر بیٹھتا ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ تدریس کے عمل میں اہم ترین کردار استاد کو ادا کرنا ہوتا ہے اور استاد کی شخصیت کا مرکزی نقطہ اس کا فلسفۂ زندگی ہوا کرتا ہے۔ مگر فلسفۂ زندگی عام حالتوں میں گرد و پیش کی معاشرتی زندگی سے اخذ کیا جاتا ہے۔ ایسے فوق العادت انسان بہت کم ملیں گے جن کا فلسفۂ حیات گرد و پیش کی زندگی سے مختلف ہو۔ اگر آج ہمارے بیشتر استادوں کا فلسفۂ زندگی مادی قدروں کے گرد گھومتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کی آمد کے بعد ان قدروں نے بڑی تیزی سے

غلبہ حاصل کیا ہے۔ اگرچہ یہ تدریس مغربی تہذیب کے جلو میں ایک عرصہ سے معروف کار تھیں مگر فرنگی غلامی کے احساس اور ہندوؤں کی عصبیت نے ان قدروں اور ہماری معاشرتی زندگی کے درمیان ایک قسم کا بند باندھ رکھا تھا۔ آزادی کی آمد نے اس بند کو توڑ کر مغربی تہذیب کے بلا روک ٹوک آنے کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد دن بدن کیفیت یہ ہوتی گئی ہے کہ اجتماعی زندگی میں امتیاز حاصل کرنے کا راستہ قومی خدمت اور اخلاقی پاکیزگی کی بجائے نمود کی نمائش قرار پایا ہے۔ اس ہمہ گیر معاشرتی آب و ہوا سے استاد کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے منصب کی روایتی بے نفسی قائم رکھنے کی بجائے حصول زر کو نصب العین قرار دینے لگا ہے۔ اور اس کے کام کی نوعیت کاروباری رنگ اختیار کر گئی ہے۔

اس صورت حال کے خاتمے کے لیے معاشرے کی موجودہ مزاجی ساخت کو تبدیل کرنا ضروری ہے جب تک معاشرہ مادی قدروں کا شیدائی ہے اس وقت تک استاد کو اس بات کا قائل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے منصب کی پرانی روایات کو پھر سے زندہ کرے۔

غیر ملکی زبان

تعلیمی معیاروں کی پستی میں زبان کے مسئلہ کو بھی دخل حاصل ہے۔ ہمارے نصاب تعلیم میں زبانوں کا بوجھ اس قدر بھاری ہے کہ ایک اوسط طالب اس بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں قومی زبان اردو ہے۔ مگر بہت کم بچے ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہو۔ یہ امر پوری طرح مسلمہ ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی غیر ملکی زبان پڑھنا ناگزیر بھی ہو تو یہ زبان نصاب کے کسی بالائی درجے پر پڑھانی چاہیے۔ جب طالب علم مادری زبان کی لسانی مہارتوں پر اچھی طرح قدرت حاصل کر چکا ہو۔

مخصوص تاریخی حالات نے ہمارے لیے زبان کے مسئلہ کو کافی ٹیڑھا بنا رکھا ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے فارسی دفتری اور تعلیمی زبان تھی۔ اس کی یہ حیثیت مدت سے ختم ہو گئی مگر فارسی اب تک نصاب میں داخل چلی آ رہی ہے۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اس لیے اس کا نصاب میں رہنا ضروری ہے انگریزوں کی آمد کے ساتھ انگریزی سرکاری اور تعلیمی زبان قرار پائی۔ انگریزوں کو رخصت ہوئے گیارہ برس

ہو گئے حکمرانوں کی زبان کی گرفت ہمارے نصاب پر بدستور باقی ہے۔ آزادی کی آمد کے فوراً بعد حکومت پنجاب
کے ایک ریلے نے انگریزی کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس طرح کہ مڈل تک جماعتوں میں
تدریس انگریزی کا کچھ وقت گھٹا کر یہ وقت دوسرے ضروری مضامین کو دے دیا گیا تھا۔ مگر اب اس کے خلاف
شدید رد عمل شروع ہو گیا ہے۔ ایسے ابتدائی مدرسوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے جہاں بچوں کو پہلی جماعت
سے انگریزی پڑھاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ ایسے ثانوی مدرسوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے جہاں
تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ غرض ذریعہ تعلیم اور نصاب کے لسانی بوجھ کے متعلق ہم ابھی تک
کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے۔ اس غیر یقینی صورت حال نے تعلیمی معیاروں کو بڑا متاثر کیا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ علوم کا پورا فہم حاصل کرنے کے لیے مادری زبان میں سب سے
موثر ذریعہ ہے۔ مگر ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں مادری زبان اور قومی زبان ایک چیز نہیں ہیں
اس پر مستزاد یہ کہ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوئی پرخلوص کوشش نہیں کی گئی۔ نیم دلانہ کوشش کا
نتیجہ غیر تسلی بخش نکلا کرتا ہے۔ چنانچہ اردو کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ ثانوی مدرسوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم
ضرور بنایا گیا مگر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم بدستور انگریزی میں رہی۔ ہمارے مدرسوں کا سارا نصاب کلیتہً
یونیورسٹی مطالبوں کے تحت ہے۔ جب ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی نہ رہی تو لا محالہ اردو کے خلاف آوازیں
اٹھنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صاحب ثروت لوگوں نے اپنے بچوں کو عام مدرسوں کی بجائے انگریزی مدرسوں میں
بھیجنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان مدرسوں کی چہل پہل اور ان کی تعداد میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ہوا
انگریزی زبان میں الٹے سیدھے جملے بول لینے کی قابلیت کو تعلیمی معراج قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ عام ثانوی مدرسوں
میں بھی انگریزی کو از سر نو توجہ کا مرکز بنا دیا گیا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر مختلف مضامین کا بہتر فہم پیدا کرنے کی
جو کوشش کی گئی تھی اس کا سارا نکھار تقریباً ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خواص کے بچے طوطے کی طرح انگریزی بولنے
اور پڑھنے سے آگے نہ جا سکے اور عوام کے بچے بیک وقت اردو اور انگریزی کی کشتیوں میں سوار ہونے کے باعث دونوں
زبانوں پر عبور حاصل کرنے کی بجائے [illegible] اس صورت حال سے تعلیمی معیاروں کا متاثر ہونا ضروری تھا لیکن
[illegible] اس وقت تک یہ ہے کہ تعلیمی معیاروں کو بچانے کی [illegible]

مسائلی طریقہ

محمد عبدالعزیز

بے خلش با زیستن، نازیستن
باید آتش در تہہ پا زیستن (اقبال)

خلش ایک وجدانی کیفیت ہے جو زندگی کو نشاطِ رحیل کا خوگر بناتی ہے۔ انسان خود نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتا ہے اور جب ایک مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے مقصد کے حصول کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس کا یہی اضطرابِ مسلسل اسے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا سکھاتا ہے، جس سے اس میں جہد و عمل کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں اس کا نام زندگی ہے۔ ایسی زندگی اسے کہتا ہے جو ہر لحظہ نئے مسائل سے دوچار ہو۔ خواہش اور آرزو سے ترقی کے بغیر زندہ رہنا نیم مردہ زندگی بسر کرنے کے مترادف ہے۔ رومی نے اسی کو

گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

سے تعبیر کیا ہے۔

ان دو تین مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی فی الحقیقت مسائل کا مجموعہ ہے۔ اگر یہ مسائل نہ ہوں تو شاید یہ سوز و ساز بھی باقی نہ رہے۔ نہ حلِ مشکلات کا سوال پیدا ہو اور نہ فضاؤں میں پرواز کی خواہش۔ نہ کوہ پیمائی کی تمنا اور نہ شناوری بحر کی آرزو۔ زندگی مضمحل اور معطل ہو جائے۔ اس کے برعکس زندگی کے مسائل انسان کو زندہ رکھتے ہیں۔ آگے بڑھنے کا ولولہ اور مقاصد آفرینی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے اس کی زندگی میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جو نہ صرف یہ کہ مادی قوتوں پر حاوی ہو جاتی ہے بلکہ ذہنی اور قلبی طمانیت کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

مسائل سے دوچار ہونا زندگی کی علامت ہے۔ حیوانات کے سامنے تلاشِ خوراک اور کم نموں کا

دودآوروں سے بچنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس دلی اطمینان کے لیے انھیں محتاط ہونا پڑتا ہے اور تجربہ انھیں دشمن اور دوست میں تمیز کرنا سکھا دیتا ہے۔ لیکن چوں کہ ان کے مسائل ذہنی کم، جسمانی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انکی یہ کاوش بھی میکانکی یا نیم میکانکی ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کے مسائل پیچیدہ اور قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے خوراک کی اسے بھی ضرورت ہے۔ تحفظ کا مسئلہ اس کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے حتیٰ کہ نفسِ اول سے نفسِ آخر تک اس کے مسائل کم نہیں ہوتے، بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ مسائل اور ان کے حل کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ بچپن کے مسائل کچھ اور ہوتے ہیں، جوانی کے کچھ اور، کہولت اور بڑھاپے میں ان کی شکل اور ہو جاتی ہے۔ لیکن زندگی کا لمحہ لمحہ مسائل کے حل کی تلاش میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ مثلاً بچہ رفتہ رفتہ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ بولنا۔ بات چیت کر لینا سیکھ لیتا ہے۔ اور اپنے سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرتا رہتا ہے۔ مطابقت کا یہ عمل دراصل عمر بھر جاری رہتا ہے۔ بلوغت کے بعد اس میں اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچپن میں جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا، ان میں اتنا الجھاؤ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کا حل بھی آسان ہوتا ہے۔ بچہ دوسروں کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے، اسے بھی چلنے پھرنے کی ترغیب ہوتی ہے اور وہ چلنا پھرنا سیکھ لیتا ہے۔ دوسروں کے بولنے کی آواز گونجتی ہے تو ان بولیوں سے اس کے کان بھی آشنا ہو جاتے ہیں اور وہی بولی اس کی زبان پر الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے مدرسہ جانا۔ پیشے کا انتخاب، اس کی تیاری۔ گھریلو زندگی۔ خاندانی، سماجی، سیاسی اور معاشی معاملات اور اس قسم کے بیسیوں مسائل سے ہر شخص کا سابقہ پڑتا ہے اور وہ بقدرِ استطاعت اسے سلجھاتا رہتا ہے۔

ان مسائل کا حل جن کا زندگی کی عمومی ضروریات سے تعلق ہے، بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہ عمومی ضروریات ہی اتنی پیچیدہ ہوتی ہیں کہ ان میں سے ایک ایک صرف ایک جہان الجھ کر رہ جاتی ہے، اس لیے ان کے حل کے لیے کسی اقدام سے پہلے غور و خوض اور تفحص کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدرسوں میں ہمارا کام مستقبل کے مسائل حل کرنے میں طالبوں کی رہنمائی ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں مدرسے نے ہنوز ذہنی اور اخلاقی طور پر اس ذمہ داری کو قبول نہیں کیا اسکی سب سے بڑی وجہ ہماری نظری بے مائگی ہے۔ اگر تعلیم کے اصول متعین نہ ہوں تو اس نہج پر جو تعلیم دی جائے گی اس سے نہ قومی تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ بچوں کی تہذیب و تربیت اس عنوان سے ہو سکتی ہے

وہ خود بھی اپنی زندگی کا حل تلاش کرلیا کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس تلاش و جستجو میں انہیں اطمینان بھی حاصل ہو اور لذت بھی۔

اگر بچے کی تعلیم و تربیت میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا جائے کہ اس میں اپنے مسائل کے تنقیح کی عادت پڑ جائے تو اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ بچہ شعوری طور پر فخر محسوس کرے گا کہ اس کے سامنے یہ مسئلہ ہے اور بہت ہی اہم مسئلہ اور یہ کہ اس کا حل اسے تلاش کرنا ہے اور جب وہ اس کا حل تلاش کرلے گا تو اس میں اسے جو لذت حاصل ہوگی وہ صرف اسے آمادۂ کار ہی نہ رکھے گی۔ بلکہ اس سے اس میں عزت نفس اور خود اعتمادی کے جو جوہر پیدا ہوں گے وہ اس کی آئندہ کامرانیوں کو مستحکم کرتے رہیں گے۔

فکر کی نوعیت

مسائل کے حل کرنے میں غور و فکر ناگزیر ہے۔ بعض اہل فکر کا یہ خیال ہے کہ متوسط ذہن کا آدمی بہت کم غور و فکر کرتا ہے بلکہ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ سرے سے غور و فکر کرتا ہی نہیں۔ یہ ان کی حدود کا تعین متنازعہ فیہ ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر شخص اپنے فہم و فراست کے مطابق اپنے مسائل پر اپنے مسائل پر غور و فکر کرتا ہے تو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔

ایک مشرقی مفکر کا یہ کہنا کہ "سوچا کرو" معمولی بات نہیں۔ کسی نے جارج برناڈ شا سے پوچھا کہ آپ کی اس غیر معمولی شہرت کی کیا وجہ ہے تو موصوف نے جواب دیا کہ "میں ہفتے میں کم سے کم دو مرتبہ ضرور غور و فکر کرتا ہوں" الفاظ سادہ ہیں لیکن بے معنی نہیں۔ فکر کی لذت انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ زمین سے آسمان تک، فرش سے عرش تک۔ دور جدید میں سائنس نے جو ترقی کی ہے اور تسخیر فطرت کی جو مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہ ان کی بینائی پر دال ہے۔ دراصل اس کی تخلیق کی حد بندی ایسی ہے جیسے سمندر میں بند باندھنا۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے   نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

فکر کے چار پہلو

مفکرین نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے فکر کی توضیح کی ہے۔ ڈیوی نے اس پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اور فکر کے چار پہلو قائم کیے ہیں۔ اول ابتدائی فکر۔ اس کا تعلق انسان کی سب سے پست ذہنی سطح سے ہوتا ہے۔ اس کا

بے تُکی باتیں سوچنا۔ خیالی پلاؤ پکانا۔ ہوائی قلعے تعمیر کرنا۔ دن کے خواب وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسے کسی حد تک فضول بے تکی الجھاؤ بھی کہتے ہیں۔ نہ باتوں میں ربط۔ نہ خیال میں ترتیب اور نہ فکر میں ہم آہنگی۔ یہ فکر کی ابتدائی اور بے ہنگم شکل ہے جس میں متوازن قسم کی باتوں کی گنجائش نہیں۔

دوم فکر کا غیر پختہ پہلو۔ اس میں فکر صورت پذیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں رچاؤ نہیں ہوتا۔ مثلاً اس میں تخیلی کہانیاں۔ پریوں کی داستانیں۔ تصوراتی حادثے وغیرہ شامل ہیں۔ فکر کی یہ صورت ابتدائی فکر سے قدرے مختلف ہے اور اس میں تسلسل اور ربط بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اساس حقائق اور صحیح واقعات پر قائم نہیں ہوتی۔

سوم فکری یقین۔ فکر کا یہ پہلو اول الذکر دونوں سے مختلف ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم تسلیم کر لیتے ہیں اور ذہنی طور پر یہ خلش محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے ثبوت کی بھی ضرورت ہے۔ یا بعض اوقات اگر ذہن ثبوت چاہتا بھی ہے تو اس کا امکان نہیں ہوتا۔ اس کی تہ میں بعض ذہنی عقائد آجاتے ہیں جن کے لیے ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یا مثلاً جب جمہور ایک بات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس میں تنقید و تجزیہ کم ہوتا ہے۔ عقائدی اور اتفاقی پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً اشتراکیت انیسویں صدی میں یورپ کے نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک تحریک تھی جو مخصوص تاریخی، سماجی اور معاشی ضروریات کی تخلیق تھی لیکن انقلاب روس کے بعد وہی اشتراکیت ایک عقیدہ بن گئی اور اب جمہور کے سامنے ایک عقیدے ہی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو زندگی کے اس فلسفے پر جس کا تمام تر انحصار مادی ترقی پر ہے غور و فکر کرتے ہیں، اگرچہ مادی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ ذہنی اور قلبی طمانیت کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

چہارم تخیلی فکر۔ انسانی زندگی میں فکر کا یہ پہلو سب سے اہم ہے۔ اب فکر سے مراد نہ تو وہ ابتدائی فکر ہے جس میں ربط و تسلسل ہی نہ تھا۔ نہ اس سے مراد وہ دلچسپ کہانیاں ہیں جن کا حقائق سے سروکار نہیں۔ اور نہ اس کا مقصد عقائدی فکر ہے جس میں تنقید و تجربے کے بغیر ایک بات تسلیم کر لی جائے۔ بلکہ اس کا مقصد ایک چیز کا تجزیہ کرنا۔ اس کی ماہیت معلوم کرنا اور پھر اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنا ہے۔ فکر کا یہ سب سے اونچا درجہ ہے۔ ڈیوی نے اس کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے۔

تخیلی فکر کسی عقیدے یا علمی مفروضے کے فعال، مسلسل اور محتاط تفحص پر مشتمل ہے جو اس کے

ثبوت اور جواز کی روشنی میں اور اس سے جو مزید نتائج اخذ ہوتے ہیں ان کی ترتیب میں ہوتی ہے۔

تخیلی فکر کی خصوصیات

فکر کی تخلیق کسی ذہنی خلا میں نہیں ہوتی۔ اس کی تشکیل کے لیے کسی محرک کا ہونا ضروری ہے۔ اب یہ محرک کس قسم کا ہو۔ اس کی نوعیت کیا ہو۔ اس کا انحصار وقت، موقع اور انسان کے عمومی رجحانات پر ہے۔ حیرت زائی کوئی حادثہ، یا کوئی ایسا واقعہ جو فکر کی خلش پیدا کردے ایسے محرکات کا موجب بن سکتے ہیں۔ اس طرح فکر گویا انسان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے عبارت ہے۔ بچے کو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی فکری تحریک کے لیے بھی اس قسم کے محرکات کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے اگر بچے کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش کیا جائے جس کا تعلق اس کے اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں سے نہ ہو تو اس کا حل تلاش کرنے میں اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی اور بالفرض وہ اس میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ کاوش اس میں زندگی کی توانائی نہیں پیدا کر سکے گی۔

فکر کی تحریک انسان کو آمادہ کار کرتی ہے اور پھر وہ از خود مسئلے کا تجزیہ کرتا ہے اور اپنے یا سماج کے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا حل تلاش کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس قسم کے تجربات سے نا آشنا ہو تو اس سے مفید مطلب نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس مقام پر اس کے ایک پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ مسئلے کے حل کے لیے بچہ جو منصوبہ تیار کرتا ہے۔ اس نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے یا محض یوں ہی سرسری طور پر قبول کر لیا ہے۔ اول الذکر صورت میں نہ صرف یہ کہ مسئلے کا حل صحیح نہیں ہوگا۔ اس میں مشکلات بھی پیش آئیں گی۔ لیکن اگر غور و فکر کی دوسری صورت پیدا ہوگی تو تنقید و تنقیح کے بعد اثبات و نفی کے مزید شواہد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح یا تو مسئلے کی وضاحت ہو جائے گی یا اس کے نقائص ایک ایک کرکے سامنے آجائیں گے۔

تخیلی فکر میں صبر و تحمل اور خاصے برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی چیز کا فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک اس کے ایک ایک پہلو کا تجزیہ نہ کر لیا جائے۔ یہ اضطراب اور تذبذب کی کیفیت قدرے تکلیف دہ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ذوق و جستجو اسے کیف آور بنا دیتا ہے اور صبر آزما کام میں جو لذت ہوتی ہے

وہ آگے بڑھنے کا ولولہ اور تیز کر دیتی ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسائل کے حل کی صحیح صورت تخیلی فکر ہے۔ جو انسان کو آمادۂ کار کرتی رہتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر تخیلی فکر کے عناصر کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے کہ یہی عناصر مسائل کے حل کی بنیاد بن جاتے ہیں ـــــ پہلا عنصر مقصد مشاہدہ، دوسرا تجزیہ اور تکوین۔ تیسرا انتخابی اعادہ، چوتھا تنقیح۔ پانچواں دلیل اور چھٹا فیصلہ ہے۔ اگر فکر کی اساس ان بنیادوں پر قائم کی جائے تو نازک سے نازک مسائل کا حل ہونا اتنا دشوار نہیں۔ اور اگر مدرسے ہی میں تفکر کی یہ عادت بچے میں ڈال دی جائے تو آگے چل کر وہ اتنے محتاط بن جائیں گے کہ زندگی کے کسی مرحلے میں دھوکہ نہیں کھائیں گے۔

تخیلی فکر اور مسائل کا حل

تخیلی فکر اور مسائل کا حل دو متضاد کیفیتوں کا نام نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کا تمام تر انحصار دوسرے پر ہے۔ تخیلی فکر دراصل مسائل کے مالہٗ و ما علیہ کا تجزیہ کر کے منطقی انداز میں ایک حل تلاش کرتی ہے لیکن اگر مسئلہ نہ ہو تو حل کی جستجو بے سود اور اگر تجسس نہ ہو تو مسئلے کا حل ناممکن۔ تلاشِ حل کے محرکات کے تعامل سے مقصد کی تخلیق ہوتی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ تخیلی فکر پیدا ہوتی ہے بلکہ تفکر بھی اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ اب سوچنے والا جو کچھ سوچے گا اس مقصد کے حصول کے لیے سوچے گا۔ دوسرے مسائل کی طرف اس کی توجہ منعطف نہ ہوگی۔

کسی مسئلے کے حل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسے مسائل کا حل جو بالعموم سادہ ہوتے ہیں۔ حالات کے مطابق اس کا تجزیہ کر کے اس کے حل کے لیے ایک طریقہ وضع کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اجتماعی طور پر کوئی اصول مرتب نہیں کیا جاتا کہ وہ اس قسم کے حل میں رہنمائی کر سکے۔ دوسرے ایسے مسائل جو قدرے پیچیدہ ہوتے لیکن ایک ہی قسم کے چند مسائل کے تحلیل و تجزیے سے ایک اصول مرتب کر لیا جاتا ہے جو اس قسم کے دوسرے مسائل کے حل میں کام آتا ہے۔

مسائل کے حل کا دوسرا پہلو اس لحاظ سے زیادہ متنوع ہے۔ ایک ہی قسم کے چند مسائل کے تحلیل و تجزیے کے بعد جو اصول مرتب ہوتا ہے، اس کی مدد سے اس طرح کے دوسرے مسائل باسانی حل کیے جا سکتے ہیں۔

کلاس میں ان دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کرنا ممکن ہے اور ضروری بھی ہے کہ دونوں کو بوقتِ ضرورت اس طرح استعمال کیا جائے کہ بچہ زیادہ سے زیادہ سیکھ سکے

مسائلی طریقے کی تعریف

مسائلی طریقے کی ایک واضح تعریف بظاہر مشکل ہے۔ لیکن اس کی تعیین کے لیے ضروری ہے کہ یہ باتیں کی تشریح کر دی جائے۔ مسائل کا حل در اصل تخیل، فکر، احساس کے تابع جو کوششیں کی جائیں اس سے عبارت ہے۔ اور اس وقت تدریس میں جو طریقے مستعمل ہیں ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں تخیل، فکر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر غور کیا جائے تو پرانے طریقوں میں بھی غور و فکر کا عنصر موجود ہے۔ پھر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو مسائلی طریقے کی مابہ الامتیاز خصوصیت کیا ہو گی۔ یہ دوسرے طریقوں سے کس طرح مختلف ہے یا کس مقام پر حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔

جدید تدریس کے مروجہ طریقوں میں ذہنی اور فکری لحاظ سے بچوں کو تفکر اور خودکاری کی ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسائل کا حل خود تلاش کریں اور یہ کہ اس تلاش میں یک گونہ لذت بھی محسوس کریں۔ اس طرح بچوں کے سامنے مسائل بھی مسائل ہوتے ہیں جنھیں علاحدہ علاحدہ ذہنی خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے اس کی حد بندی آمرانہ طور پر کرنی پڑے گی تاکہ مسائلی طریقے اور دوسرے تدریسی طریقوں میں مسائل کے حل کے جو اصول ہیں ان میں امتیاز قائم کیا جا سکے۔ اس کی یہ آمرانہ حد بندی اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو مسائل اہم اور پیچیدہ ہوں اور جن کے حل کرنے میں پیریڈ کا بیشتر وقت صرف ہو جائے۔ اور جن میں ایک مخصوص تکنیک کی ضرورت ہو انھیں مسائلی طریقے کے تابع لایا جا سکتا ہے۔

مسائلی طریقے کی اس حد بندی کے بعد ایک سوال اور باقی رہ جاتا ہے۔ کیا مسائلی طریقہ آگے چل کر منصوبی طریقہ بن جاتا ہے۔ یا دونوں مخصوص صفات کے حامل ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ لیکن دونوں کی نوعیت کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ دونوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔ مسائلی طریقے میں مسائل کا حل ذہنی اور فکری ہوتا ہے جس کا تعلق مجرد اصولوں سے ہوتا ہے لیکن منصوبی طریقے میں مسائل کے حل کی اساس مقررہ منصوبے ہوتے ہیں۔ دکان چلانا۔ باغ آراستہ کرنا۔ نہر کھودنا۔ آب پاشی کا اہتمام کرنا۔ ڈاک خانے کی تنظیم [illegible]

کھیل نہیں اور بچے انھیں کی مدد سے مسائل حل کر لیتے ہیں لیکن مسائلی طریقے میں ایسی منفرد مثالیں نہیں ہوتیں

اس بحث کے پیش نظر مسائلی طریقے کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔

مسائلی طریقہ اسکول کے کام کی ایسی تربیت پر مشتمل ہے جو سیکھنے والے کے سامنے ایک ایسا مسئلہ پیش کرے جو مسلسل محنت اور صبر آزما کاوشوں کے بعد ذہنی سطح پر اس کا حل تلاش کرنے میں اس کی امداد کرے۔

اس تعریف سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں اسے ذہنی اور فکری لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

انفرادی اور گروہی طریقہ

مسائلی طریقے کے تحت کسی مسئلے کا حل انفرادی یا گروہی طریقے سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک فرد اپنی نجی کوششوں سے اپنا مسئلہ حل کرے اور محنت کش غیر مدد ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے حل نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں دوسروں کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے اس امداد کے حصول کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ متعلم اپنے استاد سے مشکل کشائی کی درخواست کرے یا اپنے کسی بزرگ سے پوچھ لے یا اپنے ساتھی سے۔ اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ عمر اور ذہنی سطح کے مطابق اس کا حل انفرادی اعتبار سے ممکن ہی نہ ہو۔ اس طرح اس کے حل کی صورت، مباحثہ، مشورہ اور اشتراک عمل ہو سکتا ہے۔ یعنی طلبہ کا ایک گروہ مل جل کر آپس کے صلاح و مشورہ اور تعاون سے اپنا مسئلہ حل کر لے۔ جدید تدریسی طریقوں میں گروہی یا اجتماعی طریقہ زیادہ موزوں ہے۔ (باقی آئندہ)

بچوں کی جسمانی اور جذباتی نشوونما

ڈاکٹر عبدالرؤف

بیسویں صدی میں بچوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت پر بہت مفید اور ٹھوس تحقیق ہوئی ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے اس سمت میں اس قدر بیداری اور نشر و اشاعت پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

بچوں کی صدی

بچوں میں اس بڑھتے ہوئے مذاق اور دلچسپی کی وجہ سے بیسویں صدی کو "بچوں کی صدی" کے نام سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ بچوں کی نشوونما اب ایک دلچسپ اور مقبول عام موضوع مطالعہ بن گیا ہے۔ اب اس حقیقت کو بخوبی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بالغ کی شخصیت کی مکمل سمجھ بوجھ کے لیے اس کے بچپن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ بچوں کی نشوونما کا مطالعہ معلم کے لیے تو خصوصاً انتہا مفید ثابت ہوتا ہے۔ بچوں کی نشوونما کے مختلف مدارج اور ان مدارج کے مختلف تقاضوں کا علم بچوں کی شخصیت اور ان کی ذہنی استعداد سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ اس سے معلم بچوں کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے فرائض کو بہتر سرانجام دے سکتا ہے۔

نشوونما

بچوں کی نشوونما کا سلسلہ پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور بلوغت تک جاری رہتا ہے نشوونما کا مطلب وہ تمام تغیرات ہیں جو کسی فرد میں اس عرصہ کے دوران میں رونما ہوتے رہتے ہیں یعنی نشوونما ان تمام جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور جذباتی تبدیلیوں کا باضابطہ مطالعہ ہے۔ جو بچوں میں تجربوں، عادتوں تعلیم و تربیت کے نتیجہ کے طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ بچوں کا تخیل، کردار اور شخصیت ان تبدیلیوں سے مختلف طریقوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ والدین اور معلمین کے لیے ان سب تبدیلیوں کا علم مفید بھی

ہے اور ضروری بھی۔

ابتدائی بچپن کی اہمیت

انسانی زندگی ابتدائی بچپن کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ابتدائی عمر میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ آئندہ زندگی کی مسرت اور کامیابی کا انحصار بیشتر اسی ابتدائی زندگی پر ہے۔ اگر اوائل عمر میں بہتر تعلیم و تربیت میسر آجائے اور سیر و تفریح اور فرحت انگیز سرگرمیوں میں جی بھر کے شامل ہونے کے مواقع ملتے رہیں تو آئندہ زندگی میں مسرت اور کامرانی قدم چومتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ابتدائی سالوں میں بچوں کو ناقص تعلیم و تربیت اور غیر مناسب مشاغل میں شمولیت کے مواقع مل جائیں تو آئندہ زندگی میں مسرت اور کامیابی کے امکان کم ہو جاتے ہیں۔

ماحول کے علم کا بیشتر حصہ، حرکی صلاحیت اور لسانی عادات بچپن ہی میں سیکھی جاتی ہیں۔ انسان کی زندگی پر ابتدائی عادتوں، رجحانوں اور تجربوں کا اثر اس قدر گہرا اور مستقل ہوتا ہے کہ بعد میں انھیں مٹانا یا بدلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ابتدائی جذباتی تجربوں کو تو ہماری زندگی میں خصوصی اہمیت حاصل ہے محرومیت، ناکامی، غمی، خوشی اور کامیابی وغیرہ سے متعلق کسی فرد کے موجودہ ردِ عمل اور زاویہ نگاہوں کو سمجھنے کے لیے اس کی ابتدائی جذباتی زندگی کا مطالعہ بے انتہا مفید مواد مہیا کر سکتی ہے۔ اسی طرح زندگی کے معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں کی اساس ابتدائی بچپن کے متعلقہ تجربوں اور عادتوں پر رکھی گئی ہے، جنھیں سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

فرائیڈ کی تحقیقات

بچپن کی اہمیت اور عظمت کے سائنسی مطالعوں کی ابتداء سگمنڈ فرائیڈ سے شروع ہوتی ہے فرائیڈ نے ثابت کیا کہ بالغ انسان کی بیشتر ذہنی تکالیف اور بیماریوں کی اصل جڑ بچپن کے ناگوار حوادث میں موجود ہوتی ہے۔ فرائیڈ نے مسلسل تحقیقوں اور تجربوں سے یہ بات واضح کی کہ حال میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ماضی کی زندگی کا علم بہت ضروری ہے۔ فرائیڈ سے پہلے بھی بچپن کی عظمت کو تسلیم کیا جاتا تھا اور اس زندگی سے متعلق مشاہدے اور مطالعے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ مطالعے اور مشاہدے

باضابطہ اور سائنسی نوعیت کے نہیں تھے۔ فرائیڈ کی تحریروں اور تحقیقوں نے اس موضوع کو سائنسی رنگ دے کر اسے ایک مستند مقام بخشا۔

نشوونما کے علم کی اہمیت

معلم کے لیے بچوں کی زندگی کا علم بہت منفعت بخش ثابت ہوتا ہے۔ مگر محض کتابی اور کچا پکا علم کوئی مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ معلم کو چاہیے کہ وہ نشوونما سے متعلق مستند کتابیں اور رسالے پڑھے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی جماعت کے طلبہ پر مشاہدے، تجربے اور تحقیقیں کرے۔ تاکہ بچوں سے متعلق اس کا علم مستند بھی ہو اور عملی بھی۔

ابتدائی عمر کا ٹھوس علم مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر معلم کے لیے تقریباً لازمی ہے۔

(۱) معلم کا بچوں کے ساتھ مستقل طور پر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس لیے اسے اُن کی زندگی کے مختلف مدارج اور ان کے نشیب و فراز کا علم ہونا چاہیے۔

(۲) بچپن کے ٹھوس علم کی بنا پر معلم بچوں کی اچھی اور بُری حرکات کے بنیادی اسباب سمجھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

(۳) بچوں کی زندگی کی سمجھ بوجھ کی بنا پر معلم تعلیم و تدریس کے فرائض کو بہتر اور خوشگوار طریقے سے سرانجام دے سکتا ہے۔ مختلف عمروں میں بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کے علم کی بنا پر معلم اپنے معیار اور طریق تدریس کو ایسے انہج پر رکھ سکتا ہے جو بچوں کے فہم و ادراک کے عین مطابق ہو۔

(۴) بچپن کی زندگی کے علم سے معلم کو اپنے آپ کو پہچاننے میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو معلم اپنے آپ اور اپنی خوبیوں اور خامیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو وہ بچوں کے لیے بہتر انسان، بہتر رفیق، بہتر رہنما اور بہتر مدرس ثابت ہوسکتا ہے۔

بچپن کی زندگی کا علم معلم کے لیے مفید ہی نہیں بلکہ کامیاب درس و تدریس اور بچوں کی سائنسی رہنمائی کے لیے لازمی بھی ہے۔

جسمانی نشوونما | انسانی زندگی میں جسمانی نشوونما کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لوگ بچوں کی عمر کا اندازہ

عموماً ان کی شکل وصورت اور جسمانی کیفیات سے لگاتے ہیں۔ اس اندازے کی بنا پر وہ بچوں سے نرم یا سخت سلوک روا رکھتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ بچے جس عمر کے دکھائی دیتے ہوں ان کا روز مرہ کردار اُس عمر کے متوقع معیار کے مطابق ہو۔

جسمانی نشوونما متعدد عناصر پر مبنی ہے اس میں موروثی اور نسلی عناصر کو بہت دخل ہے۔ کسی فرد کی جسمانی ساخت، قدوقامت اور وزن وغیرہ کی نشوونما میں اس کے آباؤ اجداد اور نسل کی عام جسمانی کیفیتیں اور معیار بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ماحولی عناصر کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ طبعی ماحول کی نفاست یا غلاظت۔ موافقت یا غیر موافقت سے انسان کی صحت اور جسمانی نشوونما پر ہر طرح کا اثر پڑتا ہے۔ غذا۔ آب وہوا۔ مالی حالت وغیرہ کے علاوہ ذہنی کیفیات مثلاً خوشی یا غمی بھی جسمانی نشوونما پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

بالک پن کا دور

زندگی کا ابتدائی دور بالک پن، شیر خوارگی یا ابتدائی بچپن کا دور کہلاتا ہے، یہ دور پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور کوئی پانچ چھے برس تک رہتا ہے۔ گویا ماں کے پیٹ سے باہر نکلنے پر اس دور کی ابتدا ہوتی ہے اور مدرسہ میں داخل ہونے پر انتہا ہو جاتی ہے۔

اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچہ نہایت تیزی کے ساتھ جسمانی ترقی کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت عام بچے کا وزن کوئی ساڑھے تین سیر اور قد ڈھائی فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ پہلے سال کے اندر اندر ہی وزن تین گنا ہو جاتا ہے اور قد میں تقریباً چالیس فی صد ترقی ہو جاتی ہے۔ اگلے دو تین سالوں میں جسمانی نشوونما کی رفتار قدرے ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

بالک پن میں بچوں کی جسمانی نشوونما پر ان کی غذائیت خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کے وزن اور ظاہری شکل وصورت سے بھی اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ امیر گھرانوں کے بچوں کی نسبت غریب بچوں کی صحت، وزن اور قدوقامت عام معیاروں سے بہت پیچھے ہوتی ہے۔ جنسی اختلافات بھی بالک پن ہی سے جسمانی نشوونما پر اثر اندازی شروع کر دیتے ہیں۔ چناں چہ اس عمر میں بچے عموماً بچیوں سے

جسیم اور توانا دکھائی دیتے ہیں ۔

بچپن اور جسمانی نشو ونما

بچپن کا دور مدرسہ داخل ہونے کی عمر یعنی پانچ چھے سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور بلوغت کی ابتدا یعنی بارہ چودہ برس کے درمیان ختم ہو جاتا ہے ۔

اس دور میں تو برابر بڑھتا رہتا ہے۔ مگر قد کی نسبت وزن میں زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی ہوتی ہے اعضا کی حرکی نشو ونما، ان میں باہمی ربط وغیرہ کا سلیقہ بچپن میں بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔

بچپن میں تمام بچے یکساں طور پر ترقی نہیں کرتے۔ بعض بچے سرعت سے بڑھتے ہیں، بعض متوسط رفتار سے اور بعض بہت مدھم رفتار سے۔ کئی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بچپن کے ایک دور میں سرعت رفتار سے جسمانی ترقی کرتے ہیں اور دوسرے میں مدھم پڑ جاتے ہیں۔ بہرکیف مجموعی طور پر اس دور میں تمام بچے جسمانی نشو ونما کے میدان میں کافی کچھ حاصل کر لیتے ہیں ۔

کوئی دس برس تک تو لڑکیوں کی نسبت لڑکے قدرے لحیم و جسیم دکھائی دیتے ہیں، مگر اس کے بعد جسمانی نشو ونما کی دوڑ میں لڑکیاں عموماً لڑکوں سے آگے بڑھنے لگتی ہیں ۔

بلوغت کا دور

بلوغت کا دور انتہائی ہیجان انگیز دور ہے۔ لڑکیاں عموماً ۱۲ سے ۱۸ برس اور لڑکے ۱۳ سے ۲۵ برس کی عمر کے درمیان اس ہنگامی دور سے گذرتے ہیں۔ بلوغت کا سفر خار دار صحراؤں اور پیچ و خم کھاتے ہوئے راستوں سے ہوتا ہے۔ اس میں قدم قدم پر ہنگاموں، حادثوں، معرکوں، صدموں، تجربوں، تلخیوں، آندھیوں، طوفانوں اور گردابوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

دور بلوغت میں جسمانی نشو ونما میں قدرے حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ہاتھ، پاؤں، بازو، کمر اور مختلف اعضا میں پختگی آنے لگتی ہے۔ لمبا او قامت یہ جسمانی ترقی اس قدر سرعت رفتار سے ہوتی ہے کہ بالغ بچے بچیاں بے ڈھنگا پن سا محسوس کرنے لگتے ہیں

اس دور میں جسمانی نشو ونما میں جنسی اختلافات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ لڑکوں کے جنسی غدود

اعضا میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ جنسی اعضا کے گرد بال اُگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یوں کی چھاتی ابھرنے لگتی ہے اور جنسی اعضا میں پختگی آنے لگتی ہے۔ اس دور میں لڑکے لڑکیوں میں جنسی ازدواجی فرائض ادا کرنے کی جسمانی قابلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

سرعت رفتار جسمانی نشوونما اور جنسی بیداری کی وجہ سے بلوغت سے گذرتے ہوئے بچے بچیاں نائی کے چھلکتے ہوئے ساغر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی اجاگر ہونے لگتی ہے۔ وہ مجسم حرکت ن جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔ مناسب تفریحوں اور سرگرمیوں کے میسر نہ آنے سے ان کا طرح طرح کی گمراہیوں میں پھیل جانے کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے احتیاط کرنی چاہیے اس دور میں بچوں کو طرح طرح کی دل چسپ تفریحوں میں خوب مصروف رکھا جائے، تاکہ ان کی بڑھی ہوئی جسمانی توانائی ان کے فکر و عمل کو بھٹکانے میں ناکام رہے۔

جسمانی صحت کی تعلیمی اہمیت

ہماری زندگی میں جسمانی صحت کو بہت مقدم مقام حاصل ہے۔ اگر بچے جسمانی طور پر صحت مند اور تندرست و توانا ہوں تو وہ کسی قسم کی تعلیم و تربیت سے اچھی طرح مستفیض نہیں ہو سکتے۔ اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ عمر کے مختلف مدارج میں بچوں کی نشوونما کی خاطر خواہ دیکھ بھال کرتے رہیں۔

مدرسہ میں جسمانی نشوونما کے ہر طرح کے اہتمام ہونے چاہئیں۔ بچوں کو کھیلوں اور ورزشی مشاغل میں جی بھر کے حصہ لینے دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے مدرسہ سے باہر سیر و تفریح کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ جسمانی بیماریوں اور چھوٹی موٹی تکلیفوں کے علاج کے لیے مدرسہ میں ایک سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہونا چاہیے۔ ہر طالب کا باقاعدہ طبی معائنہ ہونا چاہیے۔ مدرسہ کے ڈاکٹر اور سائنس کے اساتذہ کو باہمی تعاون سے خوراک، صحت، صفائی اور حفظان صحت کے معاملوں میں طلبہ کو مفید معلومات بہم پہنچانی چاہئیں۔

جسمانی نشوونما کا علم اساتذہ اور والدین کو بچوں سے مناسب سلوک روا رکھنے اور انھیں موزوں تعلیم و تربیت دینے میں بہت مدد دیتا ہے۔ بالک پن میں بچے جسمانی طور پر بہت نرم و نازک ہوتے ہیں اس عمر میں ان کی تعلیم و تربیت خصوصی تحمل اور فراست سے ہونی چاہیے۔ اس ننھی عمر میں ان پر کتابوں

اور ضابطوں کی بے جا بوچھار کی بجائے انھیں نرمی اور شفقت سے اس طرح تربیت دینی چاہیے کہ ان کا ناتواں جسم کوئی بوجھ محسوس نہ کرے۔

بچپن میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ ایسا دلچسپ ہونا چاہیے کہ بچے اس کے لیے طبعی طور پر کشش محسوس کریں۔ درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ دلچسپ تفریحوں اور مشغلوں کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیے۔ بچپن کے لیے بہترین نظامِ تعلیم وہ ہے جو بچوں کو کھیل ہی کھیل میں زندگی کے سنجیدہ مسائل سے بخوبی روشناس کرا دیتا ہے

بلوغت میں تعلیم کے ساتھ رہنمائی کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس دور میں بچوں کے اندر قوت اور توانائی کی ایک نئی لہر چلنے لگتی ہے۔ ان کی امنگیں اور ولولے نئی کروٹیں بدلتے ہیں۔ اگر بلوغت میں بچوں کی مناسب رہنمائی نہ کی جائے تو اُن کے بھٹکنے کے احتمال بہت بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے اساتذہ اور والدین کا فرض ہے کہ بلوغت سے گذرتے ہوئے بچوں کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی روزمرّہ زندگی کی الجھنوں میں ان کی مناسب رہنمائی کے فریضہ سے بھی کوتاہی نہ کریں۔

جذباتی نشو ونما

کسی احساس کی شدت، حرارت اور تلاطم کا نام جذبہ ہے۔ جذبات جب جوش میں آتے ہیں تو فرد اپنے اندر ایک عجیب کہرام محسوس کرتا ہے۔ دیکھنے والے اس کے جسمانی تغیر و تبدل سے بھانپ لیتے ہیں کہ اس پر کوئی مخصوص جذبہ چھایا ہوا ہے۔ خوف غصہ حقارت اور محبت کے جذبات ہم اپنی روزمرہ زندگی میں عام محسوس کرتے رہتے ہیں۔ ہماری زندگی میں حصول مقصد کے لیے تڑپ۔ حرکت۔ جدوجہد اور انقلاب بہت حد تک ہمارے جذبات ہی کی بدولت رونما ہوتے ہیں۔ مگر جذبات کو زیادہ ڈھیل دیدی جائے تو زندگی میں طوفان بے تمیزی برپا ہو جاتا ہے جس سے شخصیت کی بے باک نشو ونما کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔

جذبات کی خصوصیات

جذبات کی چند موٹی موٹی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جذبہ اچانک اور یک دم پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا اثر بہت دیر تک رہتا ہے اور آہستہ آہستہ زائل ہوتا ہے۔ پروفیسر کانٹ نے جذبے کو ایک ایسے سیلاب زدہ دریا سے تشبیہ دی ہے جو اپنا

جذبہ تک برقرار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر غصہ ہی کو لے لیجیے۔ ہم غصہ میں فوراً لال پیلے ہو جاتے ہیں، لیکن ٹھنڈا ہونے میں دیر لگتی ہے۔

(۲) جذبات میں جسمانی تغیرات کو بہت دخل ہے۔ جذبے اور ان جسمانی تغیرات کا آپس میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ان کے بغیر جذبہ، جذبہ ہی نہیں رہتا۔ غصہ میں ہم انتہائی برانگیختگی کے عالم میں ہوتے ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، دانت پس جاتے ہیں، مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں، بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر جسمانی تغیرات موجود نہ ہوں تو غصہ غصہ نہیں رہتا۔

بعض جسمانی کیفیتیں جذبات پیدا کرنے کی ذمہ دار بھی ہیں۔ موٹے آدمی عموماً ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتے ہیں۔ بیماری سے اکثر لوگوں میں غصہ اور چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ جذبات میں جسمانی تغیرات اور کیفیات کی اہمیت سے انکار محال ہے۔ مگر جیمز لانگے کا نظریہ جذبات اس پہلو کو بہت مبالغہ آمیز اہمیت دیتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق فقط انہی جسمانی تغیرات کا نام جذبہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان جسمانی تبدیلیوں کے بغیر جذبے کا وجود ناممکن ہے۔ مگر جذبے کو محض جسمانی تغیر ہی قرار دے دینا بہت زیادتی ہے۔ جذبہ کا غالب عنصر اس کا ذہنی پہلو ہے۔

(۳) ہر جذبہ میں الم یا لذت کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ الم یا لذت کے پہلو سے خالی جذبہ ناممکن ہے۔

(۴) جذبہ نہایت پیچیدہ اور شعوری فعل ہے۔ جذباتی ہیجان کسی ایک ہی ہیج سے پیدا نہیں ہوتا۔ صحیح جذباتی ہیجان پیدا ہونے کے لیے ماحول کے متعدد عناصر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جنگل میں ریچھ دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ مگر سدھایا ہوا ریچھ جس کے ناک میں نکیل پڑی ہو اور جو مداری کے اشاروں پر ناچ رہا ہو ہم میں ڈر پیدا کرنے کی بجائے ہمارے لیے باعث فرحت ثابت ہوتا ہے کیونکہ ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس مخصوص ماحول کا ریچھ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(۵) کسی خارجی واقعہ یا چیز سے تعلق ہونا جذبے کا ضروری عنصر ہے۔ مثلاً ڈر یوں ہی ہوا میں پیدا نہیں ہو جاتا۔ ہم کسی جانور یا کسی بھیانک جگہ سے ڈر محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح غصہ، نفرت اور حقارت کے جذبات ہمیشہ کسی نہ کسی چیز یا واقعہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

(۶) جذبے کی شدت سے جسم کے اندر ایک برقی قوت سی پیدا ہو جاتی ہے جو ہمیں اپنے روز مرہ مشاغل میں زیادہ سرگرم عمل کر دیتی ہے۔ مگر جذبات ہمارے فکر اور کردار میں تعطل بھی لا سکتے ہیں۔ زیادہ خوف طاری ہو جانے سے مقرر پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے اور وہ بولنے سے عاجز آ جاتا ہے۔ زیادہ غصے میں بسا اوقات ہمارا جسم کچھ اس طرح مفلوج سا ہو جاتا ہے کہ ہم کچھ کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔

(۷) اگر کوئی جذبہ ہم پر بہت شدت سے چھا جائے تو پھر ہم کافی دیر تک اس کے اثر تلے دبے رہتے ہیں اور اس کے اظہار کے لیے مناسب موقعوں کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ایک افلاس زدہ معلم بیوی سے جھگڑ کر سخت غصہ کی حالت میں مدرسے پہنچتا ہے تو بیچارے چپراسی کو بے جا ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگتا ہے شاگردوں کو بات بات پر جھڑکتا ہے اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔

(۸) متعدی ہونے کی وجہ سے جذبات ایک شخص سے دوسرے شخص میں سرایت کر جاتے ہیں۔ غصیلے منتری کی وجہ سے ماتحت ماری گروں کا مزاج بھی غیر متوازن رہتا ہے۔ بد مزاج معلم کے زیر اثر طلبہ بھی آپس میں لڑنے بھڑنے کی طرف مائل رہتے ہیں۔ جھگڑالو والدین کے بچے بھی عموماً گرم مزاج ثابت ہوتے ہیں۔

(۹) جذبات ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر مسلط ہیں۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑے کشت و خون۔ حادثے ہڑتالیں، گھریلو تنازعے اور طلاق وغیرہ کے المیئے گرمی جذبات ہی کے کرشمے ہیں۔ خوش مزاجی۔ بذلہ سنجی لطیفہ گوئی وغیرہ کامیاب اور متوازن جذباتی زندگی کی علامتیں ہیں۔

بالک پن اور جذباتی نشوونما

نوزائیدہ بچے کی جذباتی کیفیات سے متعلق مختلف ماہر نفسیات میں اختلاف ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دکھ، درد، اضطراب، خوف وغیرہ کے جذبے بچوں میں ابتدا ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ کئی ایک ماہرین کا نظریہ ہے کہ یہ جذبے تجربہ اور تربیت کی بنا پر محسوس ہونا شروع ہوتے ہیں۔ بہرکیف نوزائیدہ بچوں کی جسمانی حرکات، ان کی چیخ پکار وغیرہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں بھی ان میں کچھ نہ کچھ جذباتی محسوسات ضرور موجود ہوتے ہیں۔

نو عمر بچوں کی جذباتی زندگی پر سب سے پہلے امریکی ماہر نفسیات واٹسن نے تجربے اور تحقیق شروع

گیں۔ چند ننھے بچوں پرمسلسل تجربوں کے بعد واٹسن اس نتیجے پر پہنچا کہ بچوں کو جذبات وراثت میں نہیں ملتے بلکہ ماحول اور تربیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ بچوں میں اندھیرے، آگ سانپ وغیرہ کا خوف تربیت سے پیدا ہوتا اور مٹایا بھی جا سکتا ہے۔

بالک پن میں بچوں کی جذباتی زندگی میں کوئی خاص نظم و نسق رونما نہیں ہوا ہوتا۔ ننھے بچے جب جی چاہے ہنس دیتے ہیں، رو دیتے ہیں، روٹھ جاتے ہیں۔ پھر مان جاتے ہیں۔ وہ جلد دوست بھی بن جاتے ہیں اور پھر سرد مہری اور غصہ اور نفرت کا اظہار بھی کرنے لگتے ہیں۔ جذباتی تلون اور غیر مستقل مزاجی اس دور کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

بچپن اور جذباتی نشوونما

بچپن کے آغاز اور مدرسہ میں داخلہ سے بچوں کی جذباتی زندگی میں خاطر خواہ تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جذبات پر قابو پانے اور انھیں بہتر سمتوں میں بیان کرنے کی شدھ بدھ پیدا ہونے لگتی ہے۔ لڑنے مرنے اور گالیاں بکنے کے رجحان میں تنزل واقع ہونے لگتا ہے اس دور میں جذباتی اختیار اور نظم و نسق پیدا کرنے میں مندرجہ ذیل عناصر بہت ممد ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) **جسمانی صحت:** — جسمانی بیماریاں یا کمزوریاں وغیرہ غصہ اور چڑچڑاپن کو ترویج دیتی ہیں۔ اس سے برعکس بہتر جسمانی حالت جذبوں میں توازن اور تنظیم پیدا کرتی ہے۔

(۲) **والدین کی جذباتی زندگی:** — والدین کی عمومی جذباتی زندگی اور بچوں کے روزمرہ سلوک بھی بچوں کی جذباتی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ والدین کی خوش مزاجی۔ اولاد سے مناسب پیار اور نگہداشت بچوں کی جذباتی صحت کو خوش گوار سانچوں میں ڈھالنے کا ذمہ دار بنتی ہے۔ ماں باپ کی بد مزاجی۔ جذباتی تلون اور اولاد سے سرد مہری یا غیر مناسب تربیت بچوں کی جذباتی صحت بگاڑنے کا سبب بنتی ہے۔

(۳) **اشتعال انگیز افراد اور حوادث:** — اشتعال انگیز افراد اور حوادث بھی بچوں کا

جذباتی نشوونما پر بے حد ناگوار اثر ڈالتے ہیں۔

(۴) غیر مناسب نظم و نسق :- مدرسہ اور گھر کا غیر مناسب نظم و نسق بچوں کی جذباتی صحت برباد کر دیتا ہے۔ بچوں پر حد سے زیادہ قید و بند لگا دینا یا انہیں حد سے زیادہ ڈھیل دے دینے کی پالیسی مدرسہ اور گھر دونوں جگہ بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ بہترین نظم و نسق ایسا ضابطہ ہے جو بچوں کو معقول آزادی اور اختیار بھی دیتا ہے اور ان کی نگرانی کے مناسب سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اساتذہ اور والدین کا ایک ایسا متوازن رویہ جس میں اختیار اور نگرانی کا متوازن امتزاج موجود ہو۔ بچوں کی جذباتی صحت کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

بلوغت اور جذباتی نشوونما ارتقاء

بلوغت میں سرعت رفتار جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جذباتی زندگی میں بھی ایک مزید ہیجان رونما ہونے لگتا ہے۔ اکثر بالغ اپنے اندر تناؤ اور کھچاؤ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کا مزاج چڑچڑا رہنے لگتا ہے۔ وہ ہر ایک سے الجھتے نظر آتے ہیں۔ بسا اوقات یہ جذباتی کشیدگی ان میں اپنے ماحول سے متعلق حد درجہ بے اعتنائی اور عدم دلچسپی بھی پیدا کر دیتی ہے۔

اس دور میں بعض بیجا وہم اور خوف بڑی شدت سے ذہن پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ جسم اور ذہن میں ایک کھلبلی مچی ہوتی ہے اس لیے خوف وہم اور اضطراب کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا ہے بالغ اپنے جسم کے بعض تغیرات سے یوں ہی ہراساں رہنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ان خوفوں اور وہموں میں اس درجہ شدت واقع ہو جاتی ہے کہ بالغ شب بیداری، نیند میں بڑبڑانے اور چلنے پھرنے کی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان خفیف ذہنی تکالیف کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو یہ دیوانگی کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔

بسا اوقات بلوغت کی ابتدا گھریلو زندگی میں طرح طرح کے ہنگاموں کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ بالغ لڑکے لڑکیاں گھر میں والدین، بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے یونہی الجھنے لگتے ہیں۔ بالغوں کے جذباتی ہنگامے کئی دفعہ گھر کے افراد، مدرسہ کے بچوں اور معاشرہ کے لیے باعث زحمت بن جاتے ہیں۔

بلوغت میں جنسی کشش بھی بہت شدت پکڑ جاتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں بڑی شدومد سے ایک دوسرے کی طرف فطری رغبت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اگر اس دور میں مناسب جنسی رہ نمائی میسر نہ آئے تو بالغوں کے جنسی گمراہیوں میں بھٹک جانے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔

گھر اور مدرسے کی مناسب رہ نمائی۔ کام اور کھیل کے متوازن امتزاج اور آزادی اور نگرانی کے ملے جلے ماحول سے بالغوں کے جذباتی تلاطم میں سکون آنے لگتا ہے۔ مناسب تفریحوں۔ معاشرتی اور مذہبی تعلیم اور نفسیاتی رہ نمائی سے بالغ جذباتی طفولیت اور کہرام کے عالم سے نکلنے اور جذباتی بلوغت اور سلجھاؤ کے مقام کی طرف بڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

جذباتی تربیت کے اصول

بچوں کی جذباتی تربیت والدین اور اساتذہ کا اہم ترین فریضہ ہے۔ ماہرین نفسیات نے سائنسی انداز میں جذبات کی عمومی تربیت کے لیے مندرجہ ذیل طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔

(۱) تصعید :۔ کسی فطری رجحان کو اس کی فوری اور فطری غرض سے ہٹا کر اسے کسی بہتر اور بلند نصب العین کے تابع کرنے کو تصعید کہتے ہیں۔ اپنے شہوانی جذبات کو حزب اخلاق مشاغل میں صرف کرنے کی بجائے بہن بھائیوں۔ والدین۔ قوم، وطن اور مذہب سے لگاؤ کی صورت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تصعیدی تربیت بچوں کی جذباتی تربیت میں سنگ میل کا مقام رکھتی ہے۔

(۲) تنقیہ :۔ جذبات کا اندر ہی اندر کھولنا بچوں کی ذہنی اور جسمانی زندگی کے لیے مضر ہے۔ اس لیے ڈرامہ رقص، موسیقی، مصوری، سینما، لطیفہ گوئی، جنسی مذاق اور دیگر تفریحی مشاغل کے ذریعے سے مسدود جذبات کی بھڑاس نکالنے کی تربیت بچوں کو بہت آڑے آتی ہے۔ گھٹے ہوئے جذبات کو اس طرح باہر نکال کر دل ہلکا کرنے کو تنقیہ کہتے ہیں۔

(۳) ضبط جذبات :۔ اگرچہ کسی نہ کسی انداز میں جذبات کی تنقیہ ضروری ہے۔ تاہم متمدن معاشرت کے لیے ہمیں اکثر جذبات دبانے بھی پڑتے ہیں۔ اس لیے کامیاب اور متوازن زندگی کے لیے بچوں کو مناسب موقعوں پر جذبات کو ضبط کرنے کی تربیت دینا بھی بہت ضروری ہے۔

(۴) مشاغل میں مصروفیت :- "بے کار آدمی کا دماغ شیطان کی آماجگاہ ہوتا ہے" جذبات کو ہماری شخصیت کے اندر شور و غوغا برپا کرنے کا موقع عموماً اس وقت ہاتھ آتا ہے جب ہم بالکل فارغ ہوں۔ اس لیے سن کی دنیا کو جذباتی فساد کی لپیٹ سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں کو ہر لمحہ کسی نہ کسی مشغلہ میں مصروف رکھنا چاہیے۔ انھیں اپنے آپ کو اچھے اچھے اور دلچسپ مشاغل میں مصروف رکھ کر اپنے جذبات میں توازن رکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

(۵) انحراف :- جذبات برانگیختہ کرنے والے افراد، اشیا، ماحول اور حوادث سے بچوں کو حتی الوسع دور رکھا جائے تو بھی ان کی جذباتی صحت کو بہتر طور پر پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آجاتے ہیں۔

جذباتی صحت کی تعلیمی اہمیت

کامیاب زندگی میں جذباتی صحت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر بچپن میں متوازن جذباتی زندگی بسر کرنے کی مناسب تربیت میسر آجائے تو بچے کے ہنس مکھ اور کامیاب بالغ شہری بننے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔

اساتذہ اور والدین کا فرض ہے کہ بچوں کی جذباتی تعلیم و تربیت کے فریضہ کو نہایت فہم و فراست سے سرانجام دیں۔ گھر پر بچوں کے لیے بہتر نگہداشت اور معقول شفقت کا ماحول مہیا کیا جائے۔ ان کی ضد، آڑی لڑائی جھگڑوں، رنجشوں اور الجھنوں کا حل ڈھونڈنے کی پوری پوری کوشش کی جائے اور ان کی تربیت کے ضابطوں میں آزادی اور نگرانی کے اصولوں کا نہایت خوش گوار تناسب رکھا جائے۔

مدرسہ میں معلم کو طلبہ کے سامنے اپنے تئیں ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خوش مزاج، باہمت اور پر امید معلم بچوں میں بہتر جذباتی اوصاف پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے، اس کے برعکس ایک ایسا معلم جو خود جذباتی صحت سے محروم ہو بچوں کی جذباتی نشوونما کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مدرسہ میں مناسب تفریحوں کا اہتمام بچوں کی جذباتی صحت کو ترقی دینے میں بہت مد ثابت ہوتا ہے اس اعتبار سے کھیلوں اور معاشرتی سرگرمیوں کو ذہنی اہمیت دینی چاہیے جو عموماً درسی تعلیم کو دی جاتی ہے۔ بچوں کی چھوٹی موٹی جذباتی الجھنوں کا حل تو مدرس خود بھی کرسکتا ہے، مگر ذرا پیچیدہ قسم کی جذباتی تکالیف

لیے معلم کو بچوں کی نفسیات کے ماہرین سے مشورہ طلب کرنا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو ہر مدرسہ میں ایک چھوٹا سا نفسیاتی کلینک قائم کرنا چاہیے جس میں ان بچوں کا باقاعدہ تجزیہ اور علاج ہو جو طرح طرح کی جذباتی الجھنوں اور بیماریوں کا شکار ہو کر مدرسہ کے ساتھیوں اور سارے معاشرے کی ذہنی صحت کو خطروں میں ڈالنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

اندلس کا ایک رومانی گوشہ

فضل الرحمان ناصر

اندلس کا مشہور دریا گوادل کویور جب چار سو میل کی مسافت طے کر کے جنوب مغرب میں خلیج کاڈز کا رُخ کرتا ہے تو اس کی رفتار بے حد سست ہو جاتی ہے اور جو مٹی وہ اپنے ساتھ کاٹ کر لاتا ہے وہ تہ نشین ہو کر اس کی گذرگاہ کو ایک وسیع دلدل کی شکل دے دیتی ہے۔ گوادل کویور میں سردیوں کے موسم میں طغیانی آتی ہے۔ اس موسم میں اس کا پانی کناروں کو پھاند کر دُور دُور تک دلدلیں پیدا کر دیتا ہے۔ خشک موسم گرما میں ان دلدلوں کا بیشتر حصہ خشک ہو کر گھاس کے میدانوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہسپانیہ کے کسی بڑے نقشہ پر دیکھیں تو سیویلا کے جنوب میں گوادل کویور کے اس پار ایک تکونی خطہ نظر آتا ہے۔ اس تکون کا رقبہ کوئی ۵۰۰ مربع میل ہے۔ مگر اس میں کسی سڑک یا ریل کا نشان نظر نہیں آتا حقیقت یہ ہے کہ گوادل کویور کی چوڑی اور دلدلی گذرگاہ نے اس تکون کو ہسپانیہ کے باقی حصوں سے کاٹ رکھا ہے۔ یہاں نہ ریل جا سکتی ہے نہ موٹر، نہ گھوڑا گاڑی اور نہ کسی اور قسم کی گاڑی۔ ملک کے اس گوشے میں پہنچنے کے لیے کشتیاں اور سواری کے جانور ہی کام دے سکتے ہیں۔

پچھلی چند صدیوں میں یورپ کی آبادی میں جو بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اس نے اس ترقی یافتہ براعظم میں جنگلی جانوروں اور پرندوں کے لیے کوئی ٹھکانا باقی نہیں چھوڑا۔ اب سارے یورپ میں لے دے کر صرف چند گوشے ایسے رہ گئے ہیں جہاں جنگلی جانور اور پرندے اب بھی ملتے ہیں۔ ان میں ساحل سکاٹ لینڈ پر واقع جزیرہ سینٹ کلڈا۔ ہالینڈ کے دو محفوظ جنگل۔ ہنگری میں دریائے ہارٹوباگی کے کنارے جنوبی فرانس میں دریائے رون کا دہانہ اور ہسپانیہ میں لاس مریمس (دلدلوں) کا علاقہ شامل ہیں۔ ان سب میں سے لاس میریمس جنگلی جانوروں اور پرندوں کی تعداد اور تنوع کے لحاظ سے چوٹی پر ہے۔ جن جنگلی جانوروں اور پرندوں کو یورپ کی پُر ہجوم آبادی نے ہر جگہ سے نکال باہر کیا ہے وہ سمٹ سمٹا کر لاس میریمس میں آ گئے ہیں اور اب

چین کی زندگی گذار رہے ہیں۔ علم الحیات کے عالم جو یوروپی جنگلی جانوروں اور پرندوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ہر سال اس جگہ آتے ہیں۔ لاس میریس شکاریوں کے لیے بھی جنت ہے۔

لاس میریس کو ایک طرف سے دریائے گواڈل کواور نے گھیر رکھا ہے اور دوسری طرف سے سمندر نے۔ سمندر اور دلدلوں کے درمیان ریتیلے ٹیلوں، گھاس کے میدانوں اور کانٹے دار جھاڑیوں کی ایک پٹی پھیلی ہوئی ہے جس کی چوڑائی ایک سے آٹھ میل تک ہے۔ اور لمبائی تقریباً چالیس میل سمندر اور دلدلوں کے درمیان کوٹو کی تاریخی شکارگاہ واقع ہے۔ اس شکارگاہ میں ہسپانیہ کے بادشاہ شکار کھیلتے رہے ہیں۔ یہاں ایک ٹیلے کی چوٹی پر شاہی آرام گاہ تعمیر ہے۔ اس قلعہ نما محل کے اندر جاؤ تو ہال اور کمروں کی دیواریں ان جانوروں کی کھالوں اور کھوپڑیوں سے اٹی پڑی ہیں جنھیں ہسپانوی بادشاہوں، شہزادوں اور امراء نے شکار کیا۔

یوروپی پرندوں کی جنت

لاس میریس پرندوں کے لیے دنیا کی بہترین پناہ گاہوں میں سے ہے۔ یہ ۵۰۰ مربع میل دلدلی رقبہ باقی دنیا سے الگ تھلگ ہے۔ یہاں کوئی دو سو قسم کے یوروپی پرندے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بہت کم یاب ہو چکے ہیں۔

لاس میریس میں پہنچنے کے لیے لوگ جن کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں انھیں گھوڑے کھینچتے ہیں۔ گھوڑے خشک ریتیلے کناروں پر چلتے ہیں اور کشتیاں دلدلوں کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے سینے کو چیرتی جاتی ہیں۔ اب سے چند سال پہلے تک یہاں جنگلی اونٹوں کے ریوڑ بھی گھوما کرتے تھے، مگر اب یہ غائب ہو چکے ہیں۔ البتہ جنگلی گائیں اب بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، ان کے نیز لمبے سینگ اور بھاری کھر باہر سے آنے والے لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیتے ہیں۔

کوٹو کی تاریخی شکارگاہ میں پہنچتے ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ آج سے چار سو سال پہلے سرزمین یورپ کی عام کیفیت کس قسم کی تھی۔ یہ شکارگاہ طرح طرح کے جنگلی درختوں جنگلی جانوروں اور پرندوں کا گھر ہے علم الحیات کے ایک برطانوی عالم نے اس جگہ پہنچ کر کہا تھا:-

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاہ ہنری ہشتم ابھی اپنے گھوڑسوار مصاحبوں کے ساتھ ادھر سے شکار

گذرے گا۔ بے شک مہری کے زمانے کا انگلستان بالکل اسی قسم کا تھا"

یہاں پرندوں کی بہتات کا یہ عالم ہے کہ پچھلے سال علم الحیات کے عالموں کی ایک جماعت کوٹو میں پہنچی تو پرندوں کی کل دو سو اقسام میں سے ان لوگوں نے ایک ہی دن میں ایک سو پندرہ اقسام کے نوٹ لیے۔ دلدلوں میں سب سے زیادہ افراط بگلوں کی ہے۔ یورپ میں کل نو قسم کے بگلے ملتے ہیں۔ ان میں آٹھ اقسام کوٹو میں موجود ہیں۔ انگلستان میں اب صرف دو ہی قسم کے بگلے رہ گئے ہیں۔ تاہم کوٹو میں بھی پرندوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً چار سال پہلے یہاں صرف کوئی چار ہزار بگلے رہ گئے تھے۔ شکارگاہ کے محافظوں کو حکم ملا کہ بگلوں کے انڈوں اور بچوں کی حفاظت کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب ان کی کل تعداد چودہ ہزار سے بڑھ گئی ہے۔

یہاں پرندوں کی نقل و حرکت کے متعلق چند دلچسپ حقائق بیان دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا علم الحیات کے چند ماہر کوٹو میں مطالعہ کے لیے گئے ہوئے تھے اور شاہی آرام گاہ میں مقیم تھے۔ ایک صبح انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فضا ہزاروں پرندوں کے سریلے نغموں سے گونج رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ کئی ہزار پرندے جو نقل مکانی کے سلسلے میں بحیرہ روم کے اوپر پرواز کر رہے تھے راستے سے بھٹک گئے۔ ان کی جبلی بصیرت نے انھیں خبر دی کہ کوٹو کے اس پار بحر اوقیانوس موجیں مار رہا ہے۔ چنانچہ رات کو انھوں نے آبسیرا کیا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اپریل ۱۹۵۱ء سے پہلے شمالی امریکہ میں بگلوں کی وہ مخصوص قسم نا پید تھی جو مویشیوں کے ریوڑوں کے ساتھ ساتھ رہا کرتے ہیں۔ یہ بگلے افریقہ کے رہنے والے ہیں یہ ایشیا اور جنوبی یورپ میں بھی پائے جاتے ہیں مگر امریکہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ اچانک ان بگلوں نے برٹش گی آنا (جنوبی امریکہ) میں نوآبادیاں قائم کرلیں اور اپریل ۱۹۵۲ء میں یہ نوآبادیاں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی جنوب مشرقی ریاستوں میں بھی قائم ہوگئیں۔ اس وقت سے امریکہ میں ان پرندوں کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پرندوں کے ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں خود بخود آنے کی یہ واحد مثال ہے جس کا تاریخ کو علم ہے۔ یورپ سے دوسرے پرندے انسان خود لایا تھا۔ مگر ان بگلوں نے از خود افریقہ اور جنوبی امریکہ کے درمیان ۰۰ ۷ میل چوڑے سمندر کو پار کیا اور نئی دنیا میں آن بسے۔

کوٹو کے رومانی جنگلوں میں جو دو سو قسم کے پرندے آباد ہیں۔ وہ سارا سال اس جگہ نہیں فی الحقیقت

کوٹو پرندوں کے لیے یورپ اور افریقہ کے درمیان ایک اہم پڑاؤ ہے۔ کئی پرندے یہاں صرف انڈے دینے اور بچے نکالنے کے لیے آتے ہیں۔ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو یہ انھیں ساتھ لے کر کسی اور جگہ کا رُخ کرتے ہیں۔ بعض پرندے ایسے ہیں جو سال کا کچھ حصہ جنوبی افریقہ میں گذارتے ہیں اور کچھ سکینڈے نیویا کے ملکوں میں۔ یہ پرندے آبنائے جبرالٹر کے اوپر سے گذر کر آتے ہیں اور ستانے کے لیے کچھ عرصے کے لیے کوٹو میں رُک جاتے ہیں۔

میرسمس کا تغیر پذیر چہرہ

پانی، کیچڑ، سبزہ اور پھول اور آخر میں اڑتی ہوئی دھول یہ ہیں وہ مختلف روپ جو میرسمس کا چہرہ اختیار کرتا رہتا ہے۔ ہسپانیہ بحیرۂ روم کے خطّے میں واقع ہے۔ اس لیے بارشیں سردیوں میں ہوتی ہیں جو نہ صرف بارش کا پانی میرسمس کے خشک چہرے کو دھوتا ہے بلکہ گواڈل کوار اپنے کناروں سے اچھل کر اسے عالم آب کی شکل دے دیتا ہے۔ جہاں کل تک دھول اڑتی تھی وہاں پانی اور کیچڑ کا عالم نظر آنے لگتا۔ کیچڑ اور پانی کی اس دنیا میں جگہ جگہ کائیاں اور پھولدار گھاس اُگ آتے ہیں۔ سردیوں کا سارا موسم اسی گذر جاتا ہے۔

بہار کی آمد کے ساتھ اس جگہ ایک نئی زندگی کی چہل پہل نظر آنے لگتی ہے۔ میرسمس کے دلدے کنا سکڑنے لگتے ہیں۔ ان کناروں پر قسم قسم کے آبی پرندے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ ادھر درختوں کی شاخوں جو شیوں پہنے نئے جہان فروکش ہونے لگتے ہیں۔ یہ پرندوں کے انڈے دینے اور بچے نکالنے کا زمانہ گھونسلے بنائے جاتے ہیں۔ تنکوں اور خشک ٹہنیوں کی تلاش ہے۔ چھوٹے بڑے پرندے چونچوں میں تنکے لکڑیاں پکڑے مختلف سمتوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں توتکار، ہاتھاپائی اور چوری کے منظر بھی عام دیکھے جا سکتے ہیں۔ تنکوں اور خشک ٹہنیوں کی مانگ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ صارف ایک ہی تنکے کو مختلف سمتوں میں کھینچنے لگتے ہیں۔ غصّے کے عالم میں ان کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ معاملہ اس سے بڑھ جائے تو کھلم کھلا جھڑپ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

اس زمانے میں پرندے اپنے بہترین لباس میں نظر آتے ہیں۔ ان کے سردیوں کے بے

یک دم بھڑکیلے رنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں نر و مادہ باری باری انڈے سیتے ہیں بعض پرندے باری تبدیل کرنے کی رسم بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ایک کا پہرہ ختم ہوا تو وہ گھونسلے کے کنارے پر کھڑا ہو کر بڑی رعنائی کے ساتھ بال و پر کو سنوار کر ناچنے لگتا ہے۔ مگر یہ شوقِ رقص بعض اوقات چوروں کو ایک اچھا موقع عطا کر دیتی ہے جو آس پاس پہلے سے تاک میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ جونہی ناچنے والے پرندے نے ناز و انداز سے ناچتے ہوئے گھونسلے کی طرف پیٹھ موڑی۔ چور پرندے نے جھٹ سے ایک تنکا یا خشک ٹہنی سرکالی۔

بہار کی سہانی رُت رفتہ رفتہ موسم گرما میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ دھوپ کی تیزی بڑھتی جاتی ہے اور جہاں کل تک پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہاں کیچڑ نمودار ہونے لگتا ہے۔ فوراً اس کیچڑ پر سارس، لم ڈھینگ اور اس قسم کے دوسرے نیم آبی پرندے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال جون کے مہینے تک باقی رہتی ہے جون کے وسط تک کیچڑ سوکھ جاتا ہے۔ صرف بہت گہرے نشیبوں اور نالوں میں پانی باقی رہ جاتا ہے اور باقی زمین ہر جگہ خشک ہو جاتی ہے۔ کیچڑ کے غائب ہوتے ہی زمین پر سبز گھاس اور رنگا رنگ پھولوں کی چادر بچھ جاتی ہے۔ جنگلی گائیوں کے ریوڑ اور دوسرے جانور اس گھاس کو کھاتے پھرتے ہیں۔ بالآخر یہ گھاس سوکھ کر بھوری رنگت اختیار کر لیتی ہے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ گھاس کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ جنگلی مویشیوں کے ریوڑ ادھر ادھر بھاگے پھرتے ہیں۔ اور نرم چکنی مٹی کو اپنے بھاری سموں سے پیس کر اسے دھول کے بادلوں کی شکل دینے لگتے ہیں۔

میرسس کے رومانی حسن کو جنگلی اونٹوں نے عجب بہار عطا کر رکھی تھی۔ جنگلی اونٹوں کے ان ریوڑوں کا علم پہلی بار ۱۸۸۳ء میں ہوا، جب ایک سیاح نے انھیں نیم آبی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ یہ اونٹ ۱۸۲۹ء میں جزائر کناری سے بار برداری کے لیے لائے گئے تھے، جب وہ کام ختم ہو گیا تو انھیں کھلا چھوڑ دیا گیا چنانچہ وہ سالہا سال تک جنگلی زندگی میں بڑھتے پھولتے رہے۔ بالآخر دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے قریب ہسپانوی کسانوں کو خیال آیا کہ ان اونٹوں سے مفید زرعی خدمت لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء تک انھوں نے تمام اونٹ پکڑ کر کام پر لگائے۔ جنگلی اونٹوں کے ختم ہو جانے سے میرسس کے رومانی حسن میں

نمایاں کمی آگئی ہے۔ تاہم جنگلی مویشیوں کے ریوڑ ابھی باقی ہیں۔

سہ روزہ جشن

پیرسس اور کوٹو کا تمام تر رقبہ ہموار میدان ہے۔ البتہ سمندری ساحل کے ساتھ ریتیلے ٹیلوں کی ایک پٹی موجود ہے۔ اس تمام رقبے میں آبادی خاصی چھدری ہے۔ عام کسان خاصے غریب ہیں۔ جو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ یہ جھونپڑیاں بسا اوقات ایک دوسرے سے الگ تھلگ واقع ہیں۔ جھونپڑیاں پھوس کی چھت رکھتی ہیں۔ ان کے فرش کچے ہیں۔ ہر کسان چند مرغیاں بھی پال لیتا ہے۔ مرغیاں اور ان کے چوزے کھلے دروازوں میں سے جھونپڑی کے اندر باہر پھرتے رہتے ہیں۔

اس سادہ اور عسرت کی زندگی میں ہر سال ایک مختصر سی بہار آتی ہے۔ ال روکیو کے چھوٹے سے قصبے میں ایک مذہبی تہوار منایا جاتا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے پیرسس کے کونے کونے سے اس میلے میں امڈ پڑتے ہیں۔ سیولا سے ال روکیو تک بیل گاڑی کے ذریعے آنے میں پورے پانچ دن صرف ہوتے ہیں، مگر گروہوں کے گروہ یہ لمبا فاصلہ طے کر کے ال روکیو پہنچتے ہیں۔ اور تین رات دن لگاتار گانے ناچنے میں گذارتے ہیں۔

ال روکیو کا یہ میلہ حضرت مریم کے ایک بت کا احترام کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ ال روکیو ایک چھوٹا قصبہ ہے جس کی آبادی چنداں زیادہ نہیں۔ اس قصبے میں ایک گرجا ہے جس میں حضرت مریم کا ایک مجسمہ رکھا ہے۔ اس مجسمے کے متعلق یہ مشہور ہے کہ بت شکن عربوں کے آٹھ سو سالہ غلبے کے دوران میں وہ معجزانہ طور پر ایک کھوکھلے درخت میں چھپا رہا۔ بالآخر مسیحیت کی متحدہ قوت نے عربوں کو ہسپانیہ سے دیس نکالا دیدیا تو یہ بت اپنی جائے پناہ سے باہر نکل آیا۔

اس مجسمے کے متعلق عجیب و غریب قصہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے کوئی پانچ سو برس پہلے جب عربوں کو سرزمین اندلس سے مار بھگایا گیا تو ایک روز ایک چرواہا دلدل کے کنارے بکریاں چرا رہا تھا۔ اتنے میں اس کا کتا ایک درخت کی طرف سے دوڑا دوڑا آیا اور چرواہے کو بھونک بھونک کر بلانے لگا۔ چرواہا کتے کے پیچھے ہو لیا۔ کتے نے درخت کے کھوکھلے تنے کے اندر کی طرف جھانک کر چرواہے کو اندر جھانکنے کی دعوت دی۔ چرواہے نے دیکھا کہ وہاں حضرت مریم کا ایک نہایت حسین و جمیل مجسمہ پڑا ہے۔ اس نے اس

واقعہ کی اطلاع لوگوں کو دی. چناں چہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک گرجا بنا کر یہ مجسمہ اس میں رکھ دیا جائے. ہسپانیہ کے لوگ اس مجسے کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتے ہیں. ان کا کہنا ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں طاعون کی جو ہولناک وبا پھیلی تھی اس مجسے نے ال مونٹے کے باشندوں کو اس سے بچائے رکھا. اس واقعہ کے بعد اس مجسے کے بہت سے نمونے تیار کیے گئے. اس وقت سے ان تمام قصبوں اور بستیوں کے لوگ وفدوں کی شکل میں میلے کے موقع پر ہر سال روکیو میں حاضر ہوتے ہیں. ہر وفد اپنے بت کو ساتھ اٹھائے لاتا ہے تاکہ یہ تمام بیٹیاں اپنی ماں کی آستانہ بوسی کر سکیں۔

ال روکیو کے میلے کی تیاریاں ہفتوں پہلے شروع ہو جاتی ہیں. یہ میلہ صرف مذہبی عقیدت کا مرکز ہی نہیں، بلکہ رقص و نغمہ اور جشن و نمائش کا بھی سالانہ موقع ہے. عورتیں اور مرد اس میلے کے لیے خاص کپڑے تیار کرتے ہیں. وہ سارا سال خواہ کسی قسم کا لباس پہنیں، لیکن میلے کے موقع پر ان کا لباس پورے ٹھاٹھ کا ہونا چاہیے.. پھیر دار اندلسی لہنگے اور رنگ برنگ انگیاں تیار ہونے لگتے ہیں. میلے سے ایک دن پہلے چاروں سمتوں سے لوگ گھوڑوں، خچروں، گدھوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ال روکیو میں وارد ہونے لگتے ہیں۔

ال روکیو کی چھوٹی سی بستی اس جم غفیر کے لیے رہائش کی سہولتیں بہم نہیں پہنچا سکتی. مگر ان لوگوں کو ان سہولتوں کی مطلقاً ضرورت نہیں. وہ تین دن رات ال روکیو میں ٹھہرتے ہیں اور یہ ۷۲ گھنٹے گانے اور ناچنے میں صرف کر دیتے ہیں. یہ لوگ تمام راستہ گانے بجاتے آتے ہیں. ہر قافلے میں گویوں اور ساز بجانے والوں کی ایک جماعت موجود ہوتی ہے. جو لوگ اب اکیلے ہوتے ہیں وہ بھی گانے بجانے کے ساز ساتھ اٹھائے لاتے ہیں. میلے میں آتے ہی ہر گھوڑ سوار اپنی شاہ سواری کے کرتب دکھانے لگتا ہے. گرجے کے قریب سفیدے کے درختوں کا ایک بڑا جھنڈ ہے. جوں جوں مختلف قصبوں کے وفد آتے جاتے ہیں وہ ان درختوں کے سائے میں مقررہ ترتیب سے کھڑے ہوتے جاتے ہیں. ہر وفد کے ہمراہ ایک بے حد آراستہ بیل گاڑی ہوتی ہے جس میں ال روکیو کے مجسمے کی نقل رکھی ہوتی ہے۔

دن کے ٹھیک چار بجے گرجے کے گھڑیال بجنے لگتے ہیں. ان کی آواز سنتے ہی یاتریوں کے وفد قطار در قطار گرجے کی طرف حرکت کرنے لگتے ہیں. مجسمہ بردار بیل گاڑی ہوتی ہے. جس میں ال روکیو کے

مجسمے کی نقل رکھی ہوتی ہے۔

دن کے ٹھیک چار بجے گرجے کے گھڑیال بجنے لگتے ہیں۔ ان کی آواز سنتے ہی یاتریوں کے وفد قطار در قطار گرجے کی طرف حرکت کرنے لگتے ہیں۔ مجسمہ بردار بیل گاڑی ہر وفد کے آگے آگے چلتی ہے۔ یاتریوں کا یہ جلوس پورے تین گھنٹے تک آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے۔ مجسمہ بردار بیل گاڑیاں گرجے کی سیڑھیوں پر آکر رکتی ہیں۔ کوچوان بیلوں کو گھٹنے ٹیک کر احترام بجالانے پر مجبور کرتے ہیں۔ جلوس کے خاتمے پر ناچ اور راگ کی محفلیں جگہ جگہ گرم ہو جاتی ہیں۔

ال روکیو کے گلی کوچوں، سڑکوں اور کھلے میدانوں میں جگہ جگہ رقص و نغمہ کی داد دی جاتی ہے۔ ڈھول گٹار اور بانسری کے نغمے ہوا میں لگاتار ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ تالیوں اور چٹکیوں کی آواز سازوں کے نغموں کا ترنم قائم رکھتی ہے۔ سازوں کے ترنم کے ساتھ ناچنے والے جوڑے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنا شروع کرتے ہیں۔ پھیردار لہنگا بار بار ہوا کے سینے کو چیرتا ہے اور پاؤں کی تھاپ سے ال روکیو کے در و دیوار گونجنے لگتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شیری کا جام چلتا ہے۔ ناچنے اور گانے والے خواہ کوئی گیت گا رہے ہوں ٹیپ کا بند ہر صورت میں اولے! اولے!! اولے!!! ہوتا ہے۔ رات کے سناٹے میں جب بیرسس کی دنیا آپ وگل میں زندگی کی دھڑکن باقی ہر جگہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔ ال روکیو سے بار بار اولے! اولے!! اولے!!! کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور وہ بیرسس کے آخری گوشوں تک ہوا میں ایک عجیب قسم کی تھرتھراہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔

استادوں کی دوران ملازمت بالیدگی

انور علی قریشی

نصاب کی ضرورت

تعلیمی ورک شاپ اصل میں ایک جدید نصاب ہے۔ مگر ہمارے اکثر استادوں کا خیال ہے کہ جو استاد ایک دفعہ ٹریننگ حاصل کرلے انہیں دوبارہ طریقہ ہائے تدریس کے متعلق اور کچھ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ٹریننگ کالج یا نارمل سکول میں پورا سال گذار لینا اور گیدڑ پروانہ حاصل کر لینا اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے۔ کہ اس شخص کے طریقہ ہائے تدریس پر نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی مزید تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں یہ اصول پوری طرح تسلیم کیا جا چکا ہے کہ قبل از ملازمت تعلیم استاد کو محض اس کے آئندہ پیشہ کے عام اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔ مگر استاد کی عملی تربیت دراصل اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد مدرسہ کی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور تعلیمی اصولوں کی کارروائیوں اور اپنے مدرسہ کے ماحول اور کمرۂ جماعت کی مشکلات کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ خواہ ٹریننگ کالج میں بتلائے ہوئے اصولوں میں اس کا یقین کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ اس کے دل میں بعض ایسی الجھنیں ضرور پیدا ہو جاتی ہیں جن کے متعلق اسے دوسروں سے تبادلۂ خیالات کرنا پڑتا ہے۔ اگر استاد ذاتی مطالعہ کی بنا پر ان نئی پیشہ ورانہ راہوں سے باخبر بھی رہیں تب بھی یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کہ استادوں کی جماعت باہم بیٹھ کر نئے تعلیمی افکار اور نئے طریقہ ہائے تدریس کو اپنی مخصوص ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ مگر جدید نصابوں کا اہتمام کیے بغیر یہ اہم ضرورت کبھی بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اکثر استاد ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جامد ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پیشہ ورانہ کمال میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور تعلیم دینے والے پر بالیدگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک درخت تو سالہا سال تک ساکن

اور جامد کھڑا رہنے سے اپنی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر استاد جامد ہو جانے کی وجہ سے خسارہ میں رہ جاتا ہے اور اپنی قیمت نہیں بڑھا سکتا۔ حالاں کہ استاد کو ترقی کرتے رہنا چاہیے اور اسے پیشہ ورانہ کمال میں مسلسل بڑھتے رہنا چاہیے۔ کیوں کہ لگاتار بالیدگی استاد کے لیے پہلی شرط ہے اور اسے آگے بڑھنے کا بننے کے لیے پیشہ ورانہ بالیدگی کا ثبوت دینا چاہیے۔ جدید نصاب استادوں کو اس بالیدگی کا بہت اچھے موقع دیتے ہیں۔

مغربی ممالک میں تو تمام یونیورسٹیاں ایسے نصابوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں یونی کے صدر مقام گرمائی نصاب جاری کر دیتے ہیں۔ تاکہ جو استاد لمبی تعطیلات تعلیمی قابلیت بڑھانے کے وقف کرنا چاہیں، کر سکیں جس میں استاد اور استانیاں کافی تعداد میں ان میں شرکت کرتے ہیں۔ مسلسل کئی سالوں تک گرمائی نصابوں میں شریک ہو کر ایم۔ اے یا دوسری ڈگریاں حاصل کر لیتے ہ ان کے سامنے ترقی کی یہی ایک راہ ہے جس کی وجہ سے انھیں تنخواہ میں اضافہ اور مقام کی بلندی ہوتی ہے۔ چوں کہ وہاں پیشہ ورانہ بالیدگی کو اس طور پر وابستہ کر دیا گیا ہے کہ استاد خواہ مخواہ اپنی قابلیت بڑھانے پر مجبور رہیں جو گرمائی نصابوں میں اپنے خرچ پہ شریک ہوتے ہیں۔ انھیں کچھ بھی مل جاتی ہیں، جو گرمی کی چھٹیاں اپنی تعلیم پر صرف کر دیتے ہیں۔

مگر افسوس کہ ہمارے ہاں ایسا اہتمام نہیں اگر کبھی ہوا بھی تو اس کے متعلق سب سے بڑی تر بد دلی ہے اور ان میں کم و بیش شریک ہونے والے مجبوری کی حالت میں نصاب کے مقررہ دن پو کرتے ہیں جو عرصہ ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اپنے دلوں میں بھیجنے اور پڑھا دونوں کو کوستے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے ہاں مغربی ممالک کی سی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے نه کے ساتھ کوئی انعام وابستہ نہیں۔ افسروں کو خوش کر کے ترقی حاصل کرنے کی راہیں اور ہیں، تو کسی استاد کا دماغ پھرا ہوا ہے کہ جیب سے خرچ بھی کرے اور ملے بھی کچھ نہیں۔ استاد نصابوں میں شرکت کرنا وقت اور آرام کو ضائع کرنا سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ہر استاد اس ت بے گار سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور عملہ میں سے صرف اسی آدمی کو دھکیلا جاتا ہے جو ہر علم پر د با

اگر گرمائی نصابوں کے ساتھ محکمہ تعلیم کوئی معقول انعام وابستہ کردے ۔ یا بالیدگی کو قسط وار حاصل کرنے کے لیے محکمہ کی طرف سے کوئی معقول بندوبست ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ استاد جوق در جوق گرمائی نصابوں میں شریک نہ ہوں کیوں کہ استاد دوسروں کو تو تعلیم دے کر بام ثریا تک پہنچا سکتے ہیں ۔ مگر خود جامد و ساکن رہیں ۔ یا کولہو والے بیل کی طرح اسی جگہ پر رہیں اور اپنی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہ کر سکیں ۔

تجرباتی لحاظ سے بھی اکثر مدارس میں دیکھا گیا ہے کہ ہر جماعت میں کچھ بچے ذہین ہوتے ہیں کچھ درمیانی حالت کے اور کچھ غبی ۔ مگر جب ہائی سکولوں میں قدم رکھتے ہیں اور انہیں کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے کہا جاتا ہے تاکہ وہ کھیلوں میں شرکت کر کے اپنی صحت کو اچھا بنائیں تو وہ کسی روز اچھے کھلاڑی تو بن جاتے ہیں مگر تعلیمی حالت میں بہت کورے ہو جاتے ہیں ، تو استاد ان کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے طرح طرح کے حل تلاش کرنے لگ جاتا ہے ۔ بعض طلبہ ایک مضمون میں کمزور بعض دو میں بعض تین میں اور بعض تمام مضامین کمزور ہوتے ہیں تو استاد ان کی تعلیمی حالت کو سنوارنے کے لیے اپنے سر کی کھوپڑی کی تمام کوشش ایسے کمزور بچوں پر صرف کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور انہیں تعلیمی امور میں کامیاب بنانے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکثر بچے ہوشیار ہو جاتے ہیں ۔ اگر کوئی بچہ اس درجہ تک کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا تو درمیانی حالت پر ضرور آ جاتا ہے اور وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ کالج میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج درس گاہوں کی عمارتیں بچوں کی تعداد کے لحاظ سے ناکافی ہیں ۔ طلبہ کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ سکول میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ۔ یہ استادوں کی محنت کی کوشش کا نتیجہ ہے ۔

جب استادوں کی جماعت بعض اوقات باہم بیٹھ کر نصاب اور بچوں کی مشکلات کا حل ڈھونڈنے لگتی ہے تو کیا استاد اپنی ترقی کے لیے کوئی حل تلاش نہیں کر سکتے ۔ وجہ بالکل عیاں ہے کہ انہیں مغربی ممالک سے ڈگری حاصل کرنے پر بھی کچھ نہیں ملتا ۔ سکول و کالج میں جامد و ساکن ہیں اور ورنیکلر اساتذہ کی تنخواہیں اب بھی اس قدر قلیل اور محدود ہیں کہ ان کے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے

اپنی ترقی کا حل کیا تلاش کریں۔ بعض خواندہ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ ہر ایک پڑھا لکھا آدمی اپنے بچوں کو خود تعلیم دے سکتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو سکول اور کالج قائم کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔ پڑھا لکھا آدمی اپنے بچوں کو گھر پر تعلیم دے کر ان میں علم کی ایک ہلکی سی کرن تو ضرور پیدا کر لے گا۔ مگر دیتے وقت اپنے بچوں میں بہت سی تعلیمی خامیاں بھی پیدا کر لے گا۔ جو ان کے لیے دشواریوں اور رشتہ کا باعث ہوں گی۔ کیونکہ ہر پڑھا لکھا آدمی بغیر تربیت کے اس کام کو نہیں چلا سکتا کہ وہ اپنے بچوں کو صحیح طور پر تعلیم دے سکے۔

اگر تعلیم دینا اتنا ہی آسان ہوتا تو فیلقوس کو سکندر کے لیے اتالیق مقرر نہ کرنا پڑتا۔ اکبر کو بیرم رہنمائی کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہر محکمہ کا ملازم اپنے بچوں کو خود تعلیم دے لیتا۔ یوں تو بڑے بڑے شہروں ایسی درس گاہیں بھی موجود ہیں کہ جو طلبہ میٹرک میں تعلیم حاصل کر لیتے ہیں کوئی ملازمت نہ ملنے کے با پرائیویٹ پرائمری سکول کھول لیتے ہیں اور دو دو، تین تین روپے ماہوار فیس وصول کر کے بچوں کی زندگ تباہ و برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے والدین بھی اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کا خیال نہیں کرتے یہی سمجھتے ہیں کہ استاد میٹرک پاس ہے۔ بچوں کو تعلیم دے سکتا ہے۔ میٹرک تو درکنار اگر کوئی بی اے بھی تعلیم نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ تربیت حاصل نہ کر لے۔ تعلیم دینا صرف استاد کا ہی کام ہے جو باقاعدہ تربیت یافتہ ہو۔ خواہ اس کے شاگرد تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت میں داخل ہو کر اپنے استاد کو خاطر میں یا نہ لائیں۔ استاد بچوں کو حیوانی زندگی سے نجات دلا کر تسکین اور راحت کی زندگی گذارنے کے قابل بنا

ہمارا تعلیمی ماحول

محمد حسین

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس اثنا میں ہندوستان علم و فن تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا۔ روحانیت کی لاشوں نے جن کے بڑے بڑے مبدا، داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا، حضرت میاں میر، فرید الدین گنج شکر جیسی باکمال ہستیاں تھیں ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ کر ذرہ ذرہ کو چمکا دیا تھا۔

ہندوستان میں علم کی اشاعت ان بزرگان دین ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھی۔ کیوں کہ اسلام نے حصولِ علم کی سخت تاکید کی ہے۔ بلکہ یہاں تک بھی حکم دیا گیا ہے کہ اگر علم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جانا پڑے تو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام کے احیاء سے پہلے ہندومت نے علم اور تعلیم کو صرف برہمن کی ذات تک محدود کر رکھا تھا ہندومت کے بنیادی عقیدوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ صرف برہمن ذات ہی مقدس انسانوں پر مشتمل ہے اور علم و فنون حاصل کرنا اسی کا فریضہ ہے۔ یہ دراصل برہمن کی اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کی کھوکھلی چالیں تھیں اور زمانے کی افتاد کے ساتھ اس کی ساری عیاریاں اور چالاکیاں روز روشن کی طرح دنیا پر عیاں ہو گئیں۔ ورنہ کہاں وہ وقت جب ایک شودر یا اپند کو اگر ہاتھ لگا دیتا تو اس جرم میں اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ اگر شامت کا مارا کہیں بھول کر مندر کے پاس سے گزر جاتا اور برہمن کے شلوک پڑھنے کی آواز اس کے کان تک پہنچ جاتی تو پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں ڈال دیا جاتا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ جب اسلام کی شمع نے اپنے علم کی روشنی بکھیری تو ایک اچھوت بھی اس سے اتنا ہی مستفید ہوا جتنا کہ ایک مسلمان۔

علم حاصل کرنے کا شوق اور جستجو انسانی فطرت میں روزِ ازل سے ہی شامل ہے۔ جب اسلام نے

اپنے علم و فضل کے خزینوں کے منہ کھولے تو اسلام کی اس سادہ تی و علمی پیش کش کو انھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ چناں چہ مسلمانوں نے بھی ان کی خوب سرپرستی کی۔ اپنے مکتبوں میں اپنے برابر بیٹھنے کو جگہ دی اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے تمام اخراجات بشمول کتابیں، کپڑے، رہائش اور کھانا وغیرہ مفت بہم پہنچانے کے علاوہ وظیفے بھی مقرر کیے۔

انگریزوں کی آمد سے جہاں حکومت میں تبدیلی واقع ہوئی وہاں نظامِ تعلیم میں بھی تغیر رونما ہوا۔ مسلمان چوں کہ انگریزوں کو کافر گردانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی قوم کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی قطعی ممانعت کر دی جس کا نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ مسلمان تعلیمی میدان میں ہندو سے بہت پیچھے رہ گیا ہندو ایک ہزار سال کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے شوق میں تن من دھن کی بازی لگا کر انگریزی علم حاصل کرنے میں منہمک تھے۔ اور اس طرح ملازمتوں اور حکومت کے دیگر شعبوں میں چھائے جا رہے تھے۔

مسلمان ابھی گو مگوں کی حالت میں یہ سوچ رہا تھا کہ آیا انگریزی تعلیم حاصل کرنی چاہیے یا نہیں۔

مسلمانوں کے ایک گروہ نے جسے سرسید سکول بھی کہتے ہیں اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ مسلمان جب تک انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے علم اور تعلیم کو نہیں اپنائیں گے اس وقت تک مسلمان یونہی خوار ہوتے رہیں گے۔ بلکہ ایک دن ایسا آنا جب کہ وہ انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی میں ہوتے۔"

سرسید مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی زبوں حالی دیکھ کر کڑھتے تھے جس سے ان کے دل میں مسلمانوں کو جدید اور مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کا بے پناہ جذبہ سا گیا تھا۔ جو آخر کار ان کی اور ان کے ساتھیوں کی صبر آزما اور کٹھن کوششوں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں نمودار ہوا۔ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان بھی انگریزوں کی طرح بے دین ہو جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں کو جدید سائنسی تعلیمات سے بھی نوازنا چاہتے تھے۔

سرسید سکول کی جدوجہد سے مسلمانوں میں مغربی علوم حاصل کرنے کی تحریک تو بیدار ہو گئی تھی لیکن ابھی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ ہندو سے مقابلہ کر کے شانہ بشانہ کھڑے ہوتے۔

پاکستان کے قیام تک یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور انگریزی تعلیم حاصل کرنا کوئی عیب

فعل خیال نہیں کیا جاتا تھا لیکن ابھی تک صرف امرا اور رؤسا کے لڑکے ہی انگریزی تعلیم سے آراستہ ہو رہے تھے۔ خال خال اوسط طبقے کے لوگ بھی اپنے بچوں کو سکول بھیجنے لگے تھے۔ غریب لوگوں پر ابھی تک تعلیم کے دروازے بند ہی تھے۔ پاکستان کے قیام سے ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد سرکاری مشینری میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پورا کرنے کے لیے پاکستان کے ہر پڑھے لکھے آدمی کو ملازمت حاصل کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ معمولی پڑھے لکھوں کی بھی یہ خواہش ہونے لگی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کر کے اچھی ملازمتوں پر فائز ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکول میں تلامذہ کی تعداد دونی اور رات چوگنی ترقی کر گئی۔

پاکستان کے ہر طبقہ کا نصب العین تعلیم حاصل کرنا بن گیا۔ انقلاب تقسیم برصغیر پاک و ہند کے سبب سے جو جاہل اور ان پڑھ نودولتے پیدا ہو گئے تھے ان کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اگر وہ اپنے کو زیور علم سے آراستہ نہیں کرتے تو ان کی دولت جلد ہی ان کے ہاتھوں سے چھین لی جائے گی۔ غریب اور متوسط طبقہ کا نصب العین پڑھ لکھ کر صرف ملازمت حاصل کرنا تھا۔ ملک میں بے کاری کے جراثیم ابھرنے شروع ہو چکے تھے۔ گو ابھی مایوسی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے حصول کی رفتار میں انحطاط ضرور آ گیا تھا۔

۵۵-۱۹۵۷ء کے دوران ہر طبقہ کے نظریہ حصول تعلیم میں ایک انقلابی فرق رونما ہوا۔ امیر لوگ اب صرف اس لیے تعلیم حاصل کرنے لگے کہ ان کے پاس کثیر دولت ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے نہیں بلکہ تعلیم خریدنے اور اپنی دولت کے خرچ کرنے کی ایک نئی راہ نکالنے آتے تھے۔ وہ شہزادوں کی طرح کلاس میں آتے ہیں کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ کچھ نئی گپیں ہانکیں اور چل دیے۔ معاشرہ میں امیری اور غریبی کا بُعد تو ضرور تھا لیکن اس کو پروان چڑھانے کے لیے انھوں نے تعلیمی اداروں کو پلیٹ فارموں کے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہی صرف ایک ایسا طبقہ ہے جو دولت کے نشے میں سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

یہ جانتے ہوئے کہ ملازمت کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایک کلرک کا اپنے بچے کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس کو کلرک بنانے کے لیے نہیں پڑھانا چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ صرف ملازمت ہی ایک ایسی گنجائش نہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے اندر رکھپا سکے۔ بلکہ

کردار کی ساخت اور تربیت کی نشوونما کے لیے کتنی ضروری ہے۔ صحیح طور پر تعلیم حاصل کرنے والا انسان
دل کی تاریکی کے باوجود اپنے لیے نئی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ ایک دوکاندار صرف اس لیے اپنے لڑکے
سکول بھیجتا ہے کہ یہ جو روز روز انکم ٹیکس والے آکر حساب کتاب نہ رکھنے کے بارے میں تنگ کرتے ہیں
از کم ان سے تو نجات مل جائے گی۔

بعض والدین تو صرف اس غرض سے اپنے بچوں کو سکول بھیجتے ہیں کہ وہ اپنے لاڈلوں کی دن بھر کی
ما چوکڑی اور شرارتوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ ملازمت کے حصول کی خاطر اب جو لوگ تعلیم حاصل
ر رہے ہیں وہ غربت زدہ ہیں۔ اور جب ملازمت حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو وہ اپنی زندگی
قیمتی سال گنوانے پر پشیمان ہوتے ہیں اور ملک میں بیروزگاری میں بڑا اضافہ کا باعث بنتے ہیں
مندرجہ بالا حالات نے سکولوں کے ماحول میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ اس سے
مدہ برا ہونا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ طلبہ کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ نئے سکول کھولے گئے
لیکن بڑھتی ہوئی تعداد کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے کیونکہ شتاقان علم کا سو فیصد سے بھی زیادہ اضافہ
وا، اور نئے سکول صرف چند فی صد جاری ہوئے۔ کلاس میں اسی، سو طلبہ کی تعداد کوئی معمولی تعداد
ہیں ہے جسے معلم درخور اعتنا سمجھے۔ ایسے ماحول میں تو نظم و نسق کا برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور
س پر طرہ یہ کہ آج کے نوجوان طبقہ میں آزادی کی جو نئی لہر سرایت کر رہی ہے اس سے نپٹنا اساتذہ کے لیے
ستقل دردِ سر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جمہوریت کے دور میں اور عصری تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر
علم بیچارہ بدنی سزا بھی نہیں دے سکتا۔ اس جمہوری نظامِ تعلیم نے شاگرد کو بادشاہ کے تخت پر متمکن کیا ہے
ور مختلف قوانین کی مدد سے اس کے ہاتھوں اور بھی مضبوط کر دیا گیا ہے۔ معاشرہ بھی آج استاد کو ہی لعن طعن
نانے پر آیا ہے۔ کسی محفل میں چلے جائیے۔ مثلاً مولود شریف۔ کوئی سماجی جلسہ یا پھر کوئی میچ۔ چند بچے
ئی شرارت کر دیتے ہیں تو سب چھوٹے بڑوں کے اعتراض معلم پر شروع ہو جاتے ہیں۔ سکولوں میں خاک
پڑھائی بھی نہیں کرائی جاتی۔ کوئی تمیز و ادب تو سکھایا ہی نہیں جاتا۔ معلم مفت کی تنخواہ لیتا ہے۔ والدین میں
بھی اب وہ زمانہ سلف کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے جس میں بچے کو معلم کے سپرد کر کے پورا اختیار سونپ دیا جاتا ہے،

بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ اگر معلم صاحب کسی لڑکے کو آخری حربے کے طور پر سزا بھی دیں تو فوراً معلم کا پرچہ کٹوانے کی کوشش ہوتی ہے۔

دراصل ہم نے طریقہ ہائے تعلیم میں تو جمہوریت کے اصولوں کو اپنا لیا ہے لیکن معاشرہ کو ابھی تک جمہوری قدروں سے روشناس بھی نہیں کرایا۔ سوسائٹی جس طرح ایک دوسرے کے جمہوری حقوق کو پامال کر رہی ہے۔ اس سے قانون بھی اپنی جمہوری کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ سکول، سوسائٹی اور معاشرہ کا آپس میں گہرا تعلق ہے تو پھر سکول کی فضا کیوں نہ مکدر ہو۔

آج کل تعلیم کو دراصل ایک تجارتی کاروبار کی حیثیت دے دی گئی ہے جس میں اساتذہ، حکومت اور طلبا کے والدین برابر کے شریک ہیں۔ اساتذہ اس لیے کہ ان کی تنخواہیں ان کی محنت کے مقابلے میں بہت قلیل ہیں۔ وہ گھر کا خرچ نہیں چلا سکتے اور مجبور ہو کر ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ بعض تو گھر پر بلا کر بھی پڑھاتے ہیں، اور یوں اساتذہ نے اپنے وقار کے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔ اگر معلم اپنے گھر میں دال روٹی سے گذارہ کر لیتا تو اس کا معیار ڈھکا چھپا رہتا۔ اور کسی کو اس کی طرف انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی لیکن گھر سے نکلتے ہی اس کا معیار پہلے سے زیادہ نیچے گر گیا۔ سوسائٹی میں اس کا کوئی درجہ نہ رہا۔ ہر جگہ ہدف تنقید بن رہا ہے۔

وہ دراصل جانتا ہی نہیں کہ اپنے پیشے کی قدر کس طرح کرائے۔ وکیل اور ڈاکٹر کے پیشے بہت معزز اور عزت والے مانے جاتے ہیں اور پبلک ان کا احترام بھی کرتی ہے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے وہ یہ کہ یہ لوگ اپنے ایک ثانیہ کو بھی قیمتی خیال کرتے ہیں۔ ذرہ سے مشورہ کے لیے بھی فیس مقرر کی ہوتی ہے برعکس اس کے اساتذہ کے تو پورے دن خالی ہوتے ہیں۔ ٹیوشن ملنے سے پہلے تین دن تک اپنے شاگرد کے ان پڑھ والدین کو امتحان بھی دینا پڑتا ہے۔ اگر والدین کی تسلی ہو گئی تو ٹیوشن مل جائے گی ورنہ نہیں۔ پھر پھر اس پر طرہ یہ کہ مزدور تک کو اُجرت نقد مل جاتی ہے۔ لیکن معلم صاحب ایک ماہ تک ادھار پڑھاتے ہیں پھر کہیں پیسے کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو اس کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔

حکومت کو اس بے قصور وار گردانا گیا ہے کہ اساتذہ کے گریڈ ابھی تک نہیں بڑھائے گئے۔ اُن پر

نظرثانی بھی نہیں کی گئی۔ آخر اساتذہ کو معمار قوم کہا گیا ہے۔ جب ان کی اپنی بنیادیں ہل رہی ہوں گی تو وہ قوم کی بنیادوں کو کیسے مضبوط بنا سکیں گے۔

والدین کے رویہ میں تو تجارتی خودغرضی بھی شامل ہوتی ہے۔ ایک معلم کو یوں کہنا "آپ ذرا برخوردار کو سبق کے دو حرف دے دیا کریں"۔ ان کے لیے شرم کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ معلم کا اس میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ کیا کوئی کسان کی طرح ہل تو چلانا ہی نہیں پڑتا، بلکہ الٹا اس کو مجبور کرنے کے لیے یہ کہا جاتا ہے "حضرت آپ کا بھی اعادہ ہو جائے گا"۔

آج جتنا بے قدر ایک استاد ہو چکا ہے۔ اتنا شاید ایک بھنگی بھی نہیں۔ اگر بھنگی دو دن نہ آئے تو گھر والوں کو اس کی قدر معلوم ہو جاتی ہے۔

بہرحال یوں کڑھنے اور سر دردی کرنے سے تو معلم کا معیار بلند ہونے سے رہا۔ بلکہ اس کے لیے وسیع غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو اس کا معیار گرانے کا باعث ہو رہے ہیں۔ جہاں تک میرے مشاہدے میں آیا ہے تو میں مندرجہ ذیل وجوہات کو ہی ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہوں۔ (۱) قلیل تنخواہ (۲) طلبہ کی اکثریت (۳) تعلیمی معیار کی گراوٹ (۴) عام ڈسپلن اور نظم و نسق کی کمزوری (۵) سہل انگاری اساتذہ۔

ایک معمولی حیثیت کا معلم جس کا ذریعہ آمدنی ہی صرف اس کا پیشہ ہو۔ اپنا معیار بلند کرنے میں سخت دشواریوں کو حائل پاتا ہے۔ اس کے شاگردوں کا معیار اس کے اپنے معیار سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس سے بعض اساتذہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو سوسائٹی میں بلند کرنے کے لیے ٹیوشن کا آخری داؤ لگاتے ہیں۔ لیکن جب امتحانات کے بعد نتیجہ نکلتا ہے تو معلم صاحب ہفتہ بھر کے لیے چھپتے پھرتے ہیں۔ سکول میں طلبہ کی کثرت نہ صرف معلم پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ اس سے دوسری بہت سی خرابیاں مثلاً نتائج کا بری طرح سے خراب ہونا۔ عام نظم و نسق میں کمزوری آنا وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

معلومات عامہ

پارلیمانی طرز حکومت

دارالعوام کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ نئی پارلیمنٹ کے لیے اپنے ممبروں میں سے ایک کو اسپیکر منتخب کرے۔ مختلف پارٹیوں کی روایت یہ ہے کہ وہ کسی ممبر پہ متفق ہو جاتی ہیں لیکن انتخاب کے بعد وہ ممبر کسی بھی پارٹی سے متعلق نہیں رہتا۔ ایسا ممبر نہ صرف پارلیمنٹ کا بیئر مین بلکہ پارلیمنٹ کے اختیارات۔ آزادیوں۔ وقار اور مراعات کا بھی محافظ ہوتا ہے۔ وہ سختی کے ساتھ غیر جانبدار رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور کارروائی کے معاملات میں اس کے فیصلے نہ صرف قابل قبول کیے جاتے ہیں بلکہ انھیں قلم بند بھی کیا جاتا ہے تاکہ انھیں آئندہ بطور مثال پیش کیا جا سکے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ایوان میں ہونے والی کارروائی میں اس کی رہنمائی کرے۔ اجلاس میں امن قائم رکھے اور اس امر کی حفاظت کرے کہ حکومت کے کام میں غیر مناسب طور پر رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ہر زاویہ نگاہ خصوصاً قلیل ترین اقلیت کو بھی پوری طرح اظہار خیال کا موقع مل سکے۔ اس کے اقتدار کا نشان ایک شاہی عصا ہوتا ہے جو اسے ملکہ کی طرف سے مرحمت کیا جاتا ہے۔ ایوان کے ہر اجلاس سے قبل دعا کی جاتی ہے۔ دعا کرنے سے پہلے جب اسپیکر داخل ہوتا ہے تو اس کے آگے آگے یہ عصائے شاہی لے جایا جاتا ہے۔ اور پارلیمنٹ کے اجلاسوں کے دوران یہ عصائے شاہی ایک میز پر رکھا رہتا ہے۔

دارالعوام ایک مستطیل شکل کا ایوان ہے۔ اس میں ہر ممبر یا تو حکومت کی بنچوں پر بیٹھ سکتا ہے یا حزب اختلاف میں چھوٹی پارٹیاں یا تو حزب اختلاف کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں اور یا اگر وہ حکومت سے ہمدردی رکھتی ہوں تو وہ ایوان میں برسر اقتدار جماعت کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دوسری پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے باقاعدہ اطلاع دے کر "فرش" کو پار کرنا ہوگا۔

وہ ممبر جو حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھتے ہیں ان کا کام اتنا واضح نہیں ہے۔ انھیں ملکہ معظمہ کے حزب اختلاف کے نام سے پکارا جاتا ہے اور ان کا قائد (جو ممکنہ متبادل وزیراعظم ہوتا ہے) بھی تنخواہ کا حق دار ہوتا ہے۔ غیر متنازعہ فیہ قانون سازی کے دوران میں حزب اختلاف خود کو اکثر تعمیری تنقید تک محدود رکھتی ہے۔ اور اس کی بعض باتیں برسر اقتدار حکومت تسلیم بھی کر لیتی ہے۔ لیکن متنازعہ فیہ مسائل پر حزب اختلاف ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ ووٹ کے ذریعے حکومت کو شکست دے کر اسے اقتدار سے محروم کر دے۔ مزید برآں حکومت پر لازم ہے کہ وہ حزب اختلاف سے اچھا سلوک کرے اور کسی پالیسی اور دفاعی امور ایسے اہم مسائل کے بارے میں وزیراعظم بعض اوقات حزب اختلاف کے قائد سے مشورہ بھی کرتا ہے۔ یہ طرز عمل ان ملکوں کے بالکل متضاد ہے۔ جہاں آمریت کا دور دورہ ہے اور جہاں حکومت کی مخالفت بلکہ نیم دلانہ موافقت بھی غداری کے مترادف ہے۔

پارلیمانی قانون سازی تین قسم کی ہوتی ہے (۱) سرکاری بل (۲) غیر سرکاری بل اور (۳) ممبروں کے غیر سرکاری بل۔ سرکاری مسودہ ہائے قانون ایسے امور کے بارے میں ہوتے ہیں جن کا تعلق تمام ممالک سے ہوتا ہے اور یہ حکومت کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ غیر سرکاری مسودہ ہائے قانون کا تعلق مقامی یا ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ممبروں کے غیر سرکاری بل وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق اگرچہ سارے ملک سے ہوتا ہے لیکن حکومت کے بجائے اسے عام ممبر پیش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم ایک سرکاری مسودہ قانون کو لیتے ہیں کہ وہ قانون سازی کے کن مراحل سے گذرتا ہے۔

پارلیمنٹ کے ایکٹ جب مسودہ کی شکل میں ہوتے ہیں تو بل کہلاتے ہیں خواہ یہ کسی بھی ایوان کی طرف سے پیش کیے جائیں۔ لیکن ایسے مسودات جو مالی اخراجات کی منظوری یا ٹیکس عائد کرنے کے متعلق ہوتے ہیں، وہ (مالیاتی مسودات) ہمیشہ دارالعوام کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ وزرا کی ہدایت پر ماہرین قانون انھیں طے کرتے ہیں اور ایوان کے سامنے پیش کرنے سے قبل کابینہ انھیں منظور کرتی ہے۔ مسودہ کی پہلی خواندگی ایک ضابطہ کی کارروائی ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ مسودہ شائع کیا جاتا ہے

اور اسے متعلقہ محکمے کا وزیر ایوان میں پیش کرتا ہے۔ دوسری خواندگی کے دوران میں مسودہ کے عام اصولوں پر بحث کی جاتی ہے۔ اگر حزب اختلاف مسودے کے مقصد کی توثیق کرے لیکن ساتھ ہی اس میں بعض باتیں اسے پسند نہ ہوں تو وہ اپنی تنقید کو آئندہ ان مراحل کے لیے محفوظ کرلیتی ہے۔ جب مسودہ میں تغیر و تبدل پیش نظر ہوتا ہے۔ اگر حزب اختلاف بحیثیت مجموعی مسودہ کی مخالف ہے تو وہ اسے مسترد کرنے کی غرض سے ایک ترمیم پیش کرتی ہے جس پر ایوان میں رائے شماری کی جاتی ہے۔

دوسری خواندگی کے بعد زیادہ اہمیت کے مسودہ ہائے قانون کو سارے ایوان کی کمیٹی یا ان چھے کمیٹیوں میں سے کسی ایک میں بھیج دیا جاتا ہے جو اس مقصد کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔

اس کے بعد رپورٹ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس وقت کمیٹی ایوان کے سامنے وہ ترمیمیں پیش کرتی ہے جو مسودہ میں تجویز کی گئی ہیں۔ مزید ترمیمات ایوان میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد مسودہ تیسری خواندگی کے لیے مکمل ہو جاتا ہے۔

تیسری خواندگی کے موقع پر یہ مسودہ قانون ایک بار پھر زیر بحث آتا ہے۔ تمام ایوان اس کے عام اصولوں پر غور کرتا ہے اور زبانی ترمیمیں پیش کی جاتی ہیں۔ اگر مسئلہ متنازعہ فیہ ہے تو ایوان کے ووٹ کے بعد بحث جاری رہ سکتی ہے۔ اگر مسودہ کی یہ خواندگی ہو جائے تو ایوان کا کلرک اس مسودہ قانون کو دارالامرا میں لے جاتا ہے۔ جہاں ان سب مراحل سے اس قانون کو از سر نو گزرنا پڑتا ہے۔

دارالامرا اگر اس میں کوئی ترمیم منظور کرتا ہے تو مسودہ قانون دارالعوام میں لوٹا دیا جاتا ہے جو اسے جزوی طور پر منظور یا مسترد کرسکتا ہے۔ آخری فیصلے پر پہنچنے سے قبل دونوں ایوانوں کے مابین تھوڑی بہت قیل و قال ہوتی ہے۔ اگر دارالامرا اس مسودہ کو بالکل ہی مسترد کردے تو پارلیمنٹ کا ایکٹ مجریہ ۱۹۴۹ء نافذ العمل ہو جاتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے دارالعوام جس مسودہ کو دو مسلسل اجلاسوں میں منظور کر دے وہ قانون بن سکتا ہے۔ مالیاتی بل دو اجلاسوں کی تاخیر کے بغیر بھی قانون بن جاتا ہے۔

ان مراحل کے بعد مسوّدہ کے لیے شاہی منظوری حاصل ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ مسودہ فوراً پارلیمنٹ کا ایکٹ بن جاتا ہے اور اس کی دفعات ملک کا قانون قرار پاتی ہیں۔

دارالعوام میں ووٹنگ کو "ڈویژن" (رائے شماری) کہا جاتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ رائے دہندگی کے لیے
ان میں پیش ہو جاتا ہے تو ایوان کی عمارت میں انتہائی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں اور رائے شماری کی
سنائی دیتی ہے۔ اسوقت ایوان واقعی تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور اراکین ایوان میں سے ہوکر گذرتے
ں اور جنھیں اقرار کے ووٹ دینے ہوتے ہیں۔ وہ اسپیکر کی دائیں طرف کی لابی میں چلے جاتے ہیں
رجنھیں مخالفت میں رائے دینی ہوتی ہے وہ بائیں جانب کی لابی میں چلے جاتے ہیں۔

جب حکومت کی کوئی قرارداد زیر بحث آتی ہے تو اس کو ذمہ دار وزیر یا اس کا نائب پیش
یتاہے۔ اس پر حزب اختلاف کا کوئی اہم ممبر اس قرارداد پر اپنی پارٹی کا زاویہ نگاہ پیش کرتا ہے
س کے بعد عام ممبروں کو اس پر بولنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

جو ممبر تقریر کرنا چاہتا ہے۔ اکثر اسے کئی کئی گھنٹے دوسروں کی تقاریر سننا پڑتی ہیں۔ ممبر پلیٹ فارم
اکر تقریر نہیں کرتے بلکہ اپنی نشست پر کھڑے ہوکر اپنی بات کہتے ہیں۔ جونہی کوئی تقریر ختم کرکے بیٹھنے
ماتاہے تو بیسیوں کی تعداد میں دوسرے ممبر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ اسپیکر انھیں دیکھ لے اور ان سے
ے چُنے وہ تقریر کرنے کی اجازت دے۔ تقریر کرنے والے کا نام پکارا جاتا ہے اور باقی ماندہ اراکین بیٹھ جاتے
یں۔ تقریر کرنے کی اجازت کا فیصلہ کرتے وقت وہ کئی باتوں کا دھیان رکھتا ہے: تاکہ مختلف قسم کی آرا
یوان کے سامنے آسکیں۔ اور وہ ممبر جو اس موضوع پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں (مثلاً سابق وزراء) ان کی
ت سنی جاسکے۔ نئی پارلیمنٹ میں ایسے ممبروں کو اسپیکر بولنے کا موقع دیتا ہے جو پہلی بار آئے ہوں
ن کی یہ تقاریر بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور روایت یہ ہے کہ ان سے ہمدردانہ سلوک کیا جائے۔

مباحثات میں صرف طویل تقاریر ہی نہیں ہوتیں۔ کوئی ممبر اسپیکر کو اعتراضات کی طرف بھی
وجہ دلاسکتا ہے۔ یعنی ایسی باتوں کی طرف جو پارلیمانی رواج یا بحث کے قواعد کے خلاف ہوں یا وہ
سی الزام سے انکار کرنا چاہتا ہے۔ کسی بیان کی تردید کرنا ہے یا تقریر کرنے والے ممبر سے کوئی سوال کرتا
ہے۔ اس صورت میں مقرر بیٹھ جائے۔ بحث کے دوران میں دو ممبر ایک وقت میں کھڑے
نہیں رہ سکتے۔

رائے دہندگی کے طریق ہائے کار

برطانیہ کے انتخابات میں ایک بیلٹ میں ایک ووٹ ڈالا جاتا ہے۔ جس امیدوار کے حق میں زیادہ ووٹ ڈالے جائیں اسے حلقۂ نیابت کی طرف سے رکن منتخب سمجھا جاتا ہے۔

بہت سے اور جمہوری ملکوں میں ووٹروں کی رائے کا اظہار بحیثیت مجموعی معلوم کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریق ہائے کار اور برطانوی طریقۂ انتخاب میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ برطانیہ میں ووٹر اپنی رائے کا اظہار ایک نام کے سامنے نشان لگانے سے کرتا ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں میں رائے دہندہ اپنی پہلی پسندیدگی کے نام کے سامنے ایک لکھتا ہے۔ دوسری پسند کے نام کے سامنے "دو" اور اسی طرح تمام امیدواروں کے ناموں کے سامنے ترتیب وار اپنی پسند کے لحاظ سے اندراج کر دیتا ہے دوسرے نمبر پر جو پسندیدگیاں درج کی جاتی ہیں ان کی مختلف طریقوں سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور پھر جن امیدواروں کو تمام ووٹروں کی طرف سے مجموعی طور پر زیادہ حمایت حاصل ہوتی ہے انھیں منتخب سمجھا جاتا ہے۔

ایک طریق کار جسے متبادل ووٹ کہا جاتا ہے ایسے حلقہ ہائے انتخاب کے لیے ہوتا ہے جہاں انتخاب تو ایک ممبر کا ہونا ہوتا ہے۔ لیکن امیدوار دو سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر سب سے زیادہ پہلی پسندیدگی حاصل کرنے والے امیدوار کے حق میں دوسروں کے حق میں ووٹوں کی صریح کثرت نہیں ہے تو ایسی صورت میں سب سے آخری نام خارج کر دیا جاتا ہے اور اس کے حق میں جس قدر دوسری پسندیدگی کی آراء ہیں۔ انھیں باقی امیدواروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس طرح بھی صریح کثرت آراء حاصل نہیں ہوتیں تو اس طریق کار کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ یہ طریق انتخاب آسٹریلیا کے ایوان نمائندگان امیں رائج ہے۔ ایک رکن والے حلقہ ہائے نیابت میں متبادل طریق کار دو سرا بیلٹ ہے جس کی رو سے اگر امیدوار کو نمایاں اکثریت حاصل نہیں ہوتی تو سب سے آخری امیدوار اپنا نام واپس لے لیتے ہیں اور پھر اوپر کے دو امیدواروں میں مقابلہ ہوتا ہے۔

دوسرے طریق ہائے کار کو متناسب نمائندگی کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں ایسے طریقے شامل ہیں

جن میں امیدواروں کے نام کی فہرست عموماً سیاسی پارٹیوں کے ذریعے تیار کی جاتی ہے۔ اور رائے دہندگان ان فہرستوں کے مطابق کسی ایک امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالتے۔ ان میں سے ہر ایک جس قدر ووٹ حاصل کرتا ہے۔ اسی کے مطابق نشستوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کی مختلف صورتیں۔ فرانس ہالینڈ سویڈن، سوئٹزرلینڈ۔ یونان، ڈنمارک اور کئی دوسرے ملکوں میں رائج ہیں۔ تناسب نمائندگی کی ایک اور صورت "ایک قابل منتقل ووٹ" ہے جس میں ہر ایک حلقہ نیابت سے کئی اراکین منتخب ہوتے ہیں۔ نشستوں کی تعداد کے مطابق جس قدر ووٹ ڈالے جاتے ہیں ان کو تقسیم کرکے اور ان میں ایک ووٹ کے اضافے سے تعداد کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ووٹوں کی وہ تعداد پہلی گنتی میں اس مقررہ تعداد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے انتخاب کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر نشستیں خالی رہیں تو کامیاب امیدواروں کے بیلٹ پر دوسری پسندیدگی کا اندراج کیا جاتا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی تمام نشستیں پُر نہ ہوں تو آخری امیدواروں کے نام منسوخ کرکے ان کے ووٹ بھی دوسروں میں تقسیم کردیے جاتے ہیں یہ طریق انتخاب آسٹریلیا (سینٹ) جمہوریہ آئرلینڈ، جنوبی افریقہ، سیلون، مالٹا، کنیڈا کی بعض ریاستوں اور امریکہ کے شہروں میں رائج ہے۔

پاکستان کی پہلی خاتون ماہر آثار قدیمہ

کراچی کے ایک ممتاز اور قدیم پارسی خاندان کے ایک رکن کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ برصغیر کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے آثار قدیمہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ یہ مس دیرا سہراب کٹراک ہیں۔ جو مسٹر سہراب۔ کے۔ ایچ کٹراک اور مسز کٹراک کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔

مشہور خواتین ماہرین آثار قدیمہ چند ہی ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر کٹراک اپنے عزائم میں کامیاب ہوگئیں تو وہ بھی ان میں اپنا مقام پیدا کرلیں گی موصوفہ مسلم ایران سے قبل کے زمانہ کے زرتشتی آرٹ کے مطالعہ اور تحقیقات میں مصروف ہیں۔ دوسری خواتین ان کی طرح کسی مخصوص شعبہ میں منہمک نہیں ہیں۔

۱۹۵۱ء میں بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لینے کے بعد مس کٹراک لندن یونیورسٹی کے ادارہ آثار قدیمہ میں داخل ہوگئیں۔ یہ ادارہ سر مارٹیمر وہیلر نے پچیس سال قبل قائم کیا تھا۔

ہندوستانی آثار قدیمہ میں ڈپلوما حاصل کرنے کے سلسلہ میں موصوفہ کو یہاں ابتدائی تربیت حاصل کرنی پڑی اس ڈپلوما کے ساتھ ساتھ مغربی ایشیائی آثار قدیمہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے انھوں نے پروفیسر ایم۔ ای۔ ایل میلون کے زیر ہدایت مطالعہ اور تحقیقات کا کام جاری رکھا۔ پروفیسر موصوف اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور جاسوسی کہانیوں اور ڈراموں کی مشہور مصنفہ اگیتھا کرسٹی کے شوہر ہیں۔

اپنے کامیاب مقالہ کے لیے مس ویرا کرڑاک نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ ہے "ایکمین فارسی آرٹ اور فن تعمیر چھٹی صدی سے چوتھی صدی قبل مسیح تک۔ اور ان پر خارجی اثرات"۔ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ اس زمانہ کے ایکیمنی آرٹ" عراقی، یونانی اور مصری اثرات پڑے ہیں، تاہم قدیم فارسی آرٹ اپنی جگہ پر انفرادیت اور اصلیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر کرڑاک ماہر آثار قدیمہ سے زیادہ اپنے آپ کو مؤرخ خیال کرتی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قدیم مشرقی آرٹ کے جامع مطالعہ کے لیے آثار قدیمہ کی تربیت ضروری تھی۔ بحیثیت ایک پارسی خاتون کے انھیں زرتشتی کتب سے بے انتہا لگاؤ اور گہری دل چسپی ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہیں کہ اب تک انھوں نے مذہب ادب، اور سیاسیات پر توجہ مرکوز کی ہے اور ابتدائی آرٹ پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ وہ توازن برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ اس بات کی خواہاں ہیں کہ معرکۃ الآرا لیکن بغفلت زدہ فارسی آرٹ کی روایت سے پورا پورا انصاف کیا جائے۔ درحقیقت انھیں یقین ہے کہ زرتشتی فارس کی مادی ثقافت کا مطالعہ بے حد ہمت افزائی کا باعث ہوگا۔

لیکن یہ تحقیقات لندن جیسے دور دراز مقام پر کیوں کی جائیں؟ اس کا جواب ڈاکٹر کرڑاک یہ دیتی ہیں کہ مشرقی علوم و فنون کے مطالعہ کے لیے لندن سے بہتر کوئی مرکز نہیں ہے۔ تعلیمی، تنظیمی، اور ساز و سامان کے لحاظ سے یہاں بہتر سہولتیں ہیں اور فی الحقیقت یورپ بھر میں اس کا مقابلہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں لندن میں ان کی دل چسپی کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ تھیئٹر، حکمت، تاریخ، اور آرٹ اور ادب کے تمام پہلو وہ ہمیسٹڈ کی ایک پہاڑی پر خوشگوار فلیٹ میں قیام پذیر ہیں ؛

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

آموزش

جلد ۱، شمارہ ۳] لاھور [جون ۱۹۵۸

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

جون سنہ ۱۹۵۸ء

جلد ــــــــــ ۱۱

شمارہ ــــــــــ ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

جذبۂ عمل کی ضرورت

ایم۔ اے مخدومی

جون کے پہلے ہفتے میں ہیڈ ماسٹروں کی جو کانفرنس ملتان میں منعقد ہوئی اس کو خطاب کرتے ہوئے وزیر تعلیم مغربی پاکستان نے ماہرین تعلیم کی توجہ بعض بے حد اہم امور کی طرف مبذول کرائی انھوں نے اس بات کو ایک اچھی علامت قرار دیا کہ استاد اور صدر معلم اجتماعی غور و خوض کے مواقع پیدا کرنے لگے ہیں، مگر ان کے خطاب میں سب سے زیادہ معنی خیز مشورہ یہ تھا کہ پاکستانی استادوں کو اپنے جذبۂ عمل کی فکر کرنی چاہیے کیوں کہ ان میں وہ جوش عمل مفقود ہوتا جا رہا ہے جو ان کے پیش روؤں کا امتیازی نشان ہوا کرتا تھا۔

وزیر تعلیم کا یہ مشورہ ایک ایسے مرض کی نشان دہی کرتا ہے جو ہمارے نظام تعلیم کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ تعلیمی معیاروں کی روز افزوں پستی آج ہمارا سب سے مشکل تعلیمی مسئلہ بن رہا ہے۔ امتحانی نتائج اور عام مشاہدہ دونوں اس بات کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے اپنے فرائض بخوبی انجام نہیں دے رہے۔ یہ افسوس ناک صورت حال جو بھاری ضیاع پیدا کر رہی ہے وہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ تعلیمی معیاروں کو بحال کرنا آج ہماری ایک اہم قومی ضرورت ہے وزیر تعلیم نے استادوں کو بجا طور پر مشورہ دیا ہے کہ اس مشکل مسئلہ کے حل کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ استاد اپنی کارکردگی کا محاسبہ کریں اور پوری دیانتداری کے ساتھ اندازہ لگائیں کہ پست معیاروں کے لیے وہ کس حد تک ذمہ دار ہیں۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہر قسم کی تدریس میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوا کرتی ہے نئے نئے آلات لاکھ کارآمد سہی مگر ان کو تاثیر عطا کرنے والی قوت استاد کا اپنا جذبۂ عمل ہی ہوا کرتا ہے۔ جب یہ جذبۂ عمل سرد پڑ جائے تو تدریس از خود بے نتیجہ رہنے لگتی ہے۔ ہمارے تعلیمی معیاروں کی پستی اس بات کا تقاضا

کرتی ہے کہ اساتذہ مل کر اس بات پر غور کریں کہ یہ پستی جن عوامل کی پیداوار ہے آیا ان میں خود اساتذہ بھی تو شامل نہیں اور اگر شامل ہیں تو ان کی ذمہ داری کس حد تک ہے اور وہ اس کوتاہی کا تدارک کس طرح کر سکتے ہیں۔

ہمارے اساتذہ دن بدن منظم ہوتے جا رہے ہیں اور وہ باہم مل کر سوچ بچار کرنے کے عادی بھی بننے لگے ہیں۔ بلاشبہ یہ پسندیدہ چیزیں ہیں۔ مگر اس سلسلے میں اہم سوال یہ ہے کہ اس کاوش کے سامنے مقصد کیا ہے؟

بے شک استاد معاشی ضرورتیں رکھتا ہے اور یہ ضرورتیں آبرومندانہ طور پر پوری ہونی چاہئیں مگر استاد کی امتیازی شان ثروت نہیں بلکہ ایک سرگرم اور پرخلوص جذبۂ عمل ہی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا جذبۂ عمل جو شاگردوں کی بہبود کا حد درجہ حریص ہو۔ ہماری روایات نے اس قسم کے جذبے کو ہمیشہ استاد کی عظمت کا واحد معیار قرار دیا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے استادوں کو یہ روایات پھر سے زندہ کرنی چاہئیں۔ ایسا کرنے سے تعلیمی معیاروں کی پستی بہت کچھ رک جائے گی ۔

روس میں ٹیکنیکل تعلیم

فضل احمد

ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت

آج پسماندہ ملکوں کے سامنے سب سے مشکل سوال تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے روزگار مہیا کرنا اور اس کا پیٹ پالنا ہے. عالمی آبادی میں مجموعی طور پر کوئی ایک فی صد سالانہ اضافہ ہو رہا ہے اضافے کی یہ شرح بذات خود روزگار اور غذا کے کئی مسائل پیدا کرنے کے لیے کافی ہے. مگر اس کا ایک تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ پسماندہ ملکوں میں آبادی نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے. نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر معمولی موانع پیش نہ آ جائیں تو ایشیا کے اکثر ملکوں میں آبادی کوئی چالیس پچاس برس کے عرصے میں دوگنی ہو سکتی ہے۔

افزائش آبادی کی اس شرح نے جن ملکوں ٹیڑھے معاشرتی مسائل پیدا کر رکھے ہیں ان میں پاکستان بھی شامل ہے. مغربی پاکستان کے بعض اضلاع مثلاً سیالکوٹ میں آبادی کا فی مربع میل بوجھ اگر نو سو افراد کے لگ بھگ ہے تو مشرقی پاکستان کے بہت سے حصوں میں فی مربع میل آبادی ہزار نفوس سے بھی زیادہ ہے. آبادی کے اس کمر شکن بوجھ نے ہماری معاشی زندگی کو نیم مفلوج کر رکھا ہے. اکثر تعمیری منصوبے اس لیے پروان نہیں چڑھ سکتے کہ سال بھر میں ہم جو غیر ملکی سکے کماتے ہیں وہ باہر سے اناج منگوانے پر صرف ہو جاتا ہے. لہٰذا باہر سے ضروری مشینیں اور کل پرزے منگوانا محال ہو جاتا ہے. خوراک کے مسئلے نے پاکستان کو جس حد تک پریشان کر رکھا ہے. اس کا اندازہ اس بات سے ہی ہو سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی ایک سے زیادہ وزارتیں اسی مسئلہ کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں. آبادی کی کثرت کے باعث ہماری زرعی معیشت کا دم گھٹتا جا رہا ہے. عوام کی قوت خرید اس حد تک گر چکی ہے کہ لاکھوں انسان دو وقت کا کھانا پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتے. زندگی کا معیار انتہائی پستی کو پہنچ چکا ہے. ان روح کش معاشی حالات میں صحت مند

سیاسی یا اخلاقی قدروں کے بڑھنے پھولنے کے مواقع بڑی حد تک ختم ہو جاتے ہیں۔

آبادی کی بھیڑ نے ایشیا کے سرسبز اور گرم مرطوب ملکوں میں جو مشکل معاشی مسائل پیدا کر رکھے ہیں، دنیا کے سرد ملک اس قسم کے حالات سے صدیوں پہلے دوچار ہو چکے ہیں۔ وسط ایشیا کی زمین آب و ہوا جب اپنے باشندوں کے لیے کافی غذا پیدا نہ کر سکی تو یہ لوگ جنوب کے سرسبز و شاداب علاقوں کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یورپ کی آبادی کو صدیوں تک جہالت، توہم پرستی، غلاظت اور امراض نے مناسب حدود کے اندر رکھا، مگر جب اسلام کی روشن کی ہوئی شمع علم کی کرنیں بالآخر یورپ میں پہنچیں اور اس براعظم کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی تو اس کے جیالے سپوتوں نے سمندر اور خشکی کے سینے چیر کر نئے نئے براعظم اور نئے نئے ملک معلوم کر ڈالے اور یورپی قوموں نے دنیا کے خالی براعظموں اور دور دراز جزیروں میں جا پاؤں پھیلائے اور خدا کی بنائی ہوئی زمین کے وسیع و عریض رقبوں کو ناپنے اور اپنی اولاد کے لیے بلا شرکت غیرے محفوظ بنا لیا۔ نئے براعظموں پر مغربی اقوام کی یہ اجارہ داری اب تک قائم ہے۔ آسٹریلیا کی آبادی دوسری عالمی جنگ کے زمانے تک اس قدر چھدری تھی کہ اس براعظم کے دفاع کا سوال برطانیہ کے لیے ایک حقیقی دردِ سر بن گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر آسٹریلیا میں مزید آبادی کھپانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر آبادی کی شدید ضرورت کے باوجود آسٹریلیا کے دروازے ایشیا والوں پر سختی سے بند ہیں۔ نئی آبادی درآمد کرنے کے لیے اہل آسٹریلیا نے اپنی پسند کو صرف گوری قوموں تک محدود رکھا۔

غرض آبادی کے معاملے میں گوری قوموں نے نہایت عجیب و غریب منطق کو اپنا رکھا ہے۔ ایک طرف انھوں نے اقوام متحدہ کی داغ بیل ڈال رکھی ہے جس کا منشور نوع انسان کی مساوات کا اعلان کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان قوموں نے تمام نئے ملکوں کو اپنی واحد اجارہ داری قرار دے رکھا ہے۔ جو انسان سوئے اتفاق سے ایشیا یا افریقہ کے کسی ملک میں پیدا ہو جائیں ان پر نئے ملکوں کے دروازے کلی طور پر بند ہیں۔ کسی ایسے ملک میں آباد ہو کر ان لامحدود قدرتی وسائل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو دنیا کے وجود میں آنے کے وقت سے انسانی دست برد سے محفوظ چلے آتے تھے۔

اس صورت حال نے پسماندہ ملکوں کے لیے کٹھن معاشی مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ عوام کا

معیار زندگی بلند کیے بغیر وہ اپنے ہاں نہ جمہوری قدروں کو عام کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی صحت مند قومی شعور کی تربیت کر سکتے ہیں۔ ان کی آبادی میں اس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ بعض امیر مغربی ملکوں کی طرف سے انھیں جو تھوڑی بہت امداد ملتی ہے وہ بھی انسانوں کے اس ریگ زار میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے جیسے اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔

تاہم یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے پچھلے بیس پچیس برس میں جو ترقی کی ہے وہ ترقی پچھلی کئی صدیوں میں بھی نہ کی تھی۔ انسان نہ صرف اپنے خاکی تیرہ دان سے باہر فضائے بسیط میں جھانکنے کے قابل ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ اس قابل بھی ہو گیا ہے کہ سائنس کی مدد سے قدرت کے مہیا کردہ عناصر میں اضافہ کرے۔ جوہر کے سینے میں روزِ اول سے جو راز چھپے تھے انسان ان کے چہرے سے نقاب اٹھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ اس کائنات میں تصرّف کرنے پر قادر ہو گیا ہے جو جوہر کے اندر بستی ہے۔ اس قدرت نے انسان کو نئے نئے عناصر اور نئے نئے مرکب تیار کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔

اب انسان اس کوشش میں لگا ہے کہ فطرت کا ایک اور سربستہ راز معلوم کر ڈالے۔ وہ راز ہے غذا کی مصنوعی طور پر تیاری۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی میں پودے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈروجن کو باہم ملا کر ہمارے لیے طرح طرح کی غذائیں تیار کرتے ہیں۔ پودے جس طور پر یہ پُراسرار عمل انجام دیتے ہیں سائنس کا اب اس کی ٹوہ میں ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ اپنی تجربہ گاہ میں پودوں کے توسط کے بغیر کاربن اور ہائیڈروجن کی آمیزش سے غذا تیار کر لیا کریں۔ جس روز سائنس اس تلاش میں کامیاب ہو گئی اس روز دنیا بڑھتی ہوئی آبادی کے فکر سے آزاد ہو جائے گی۔ اس روز وہ اس قابل ہو جائے گی کہ گنجان سے گنجان آباد آباد ملک کو بھی آبرومند معیارِ زندگی عطا کر سکے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ سائنس اس منزل سے ابھی کتنی دور ہے۔ تاہم اس نے انسان کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ سائنس کی بدولت سنسان ویرانے پھیلے ہوئے صحرا اور بنجر بیابان لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا آج

سائنسی امداد کو چھوڑ کر پرانی وضع کی زندگی اختیار کرلے تو زرعی پیداوار میں یک دم اتنی کمی آجائے کہ دنیا کی بیشتر آبادی بھوکوں مر جائے۔ جو لوگ جدید سائنسی تہذیب کے شور و شغب سے اکتا کر پرانے پچھلے زمانوں کو تو سراہتے ہیں انھیں یہ معلوم نہیں کہ اگر آج دنیا پرانے پچھلے زمانوں کی طرف لوٹ جائے تو اسے اس بات کی قیمت کروڑوں جانوں کی قربانی کی شکل میں ادا کرنی پڑے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ محدود قدرتی وسائل سے زیادہ آبادی کے لیے غذا اور دوسری ضروریات پیدا کرے۔ پہلے وقتوں میں زیادہ آبادی کو زندہ رکھنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ نئے ملک دریافت کیے جائیں۔ اب سائنس اور ٹکنالوجی نے نئے ملکوں کا ایک اچھا بدل تیار کرلیا ہے۔ پرانے ملک اپنی روز افزوں آبادی کی ضرورتیں صنعت اور زراعت کو سائنسی بنیادوں پر منظم کرکے پوری کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے پسماندہ ملکوں کے اکثر معاشی مسائل کے حل صرف سائنس اور ٹکنالوجی میں ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ نئے یا غیر ملکوں کے دروازے ان کی فاضل آبادی پر بند سہی مگر سائنس اور ٹکنالوجی نے مادی فراوانی کے دروازے ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک پر یکساں کھول رکھے ہیں۔ ٹیکنیکل تعلیم ایک ایسی شاہراہ ہے جو ہر قوم کو مادی آسائش اور فراوانی کی منزل کی طرف لے جا سکتی ہے۔

نوعِ انسان کا مشترکہ ورثہ

یہاں بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بے شک سائنس اور ٹکنالوجی مادی آسائش اور فراوانی کی کنجیاں ہیں مگر یہ کنجیاں بھی مغربی اقوام کے ہاتھ میں ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام میدانوں میں رہنمائی کا مقام مغرب کو حاصل ہے۔ لہٰذا پسماندہ اقوام اپنے مشکل معاشی مسائل سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے کس طرح حل کر سکتی ہیں؟

اس قسم کا سوال ایک شدید غلط فہمی کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علوم و فنون کسی زمانے میں بھی کسی خاص قوم یا ملک کی میراث نہیں رہے۔ پہلے وقتوں میں گو اشاعتِ علوم کے ذرائع نہایت محدود تھے پھر بھی ہر قسم کے علوم ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتے رہے۔ چینیوں نے بڑے جتن کیے کہ ریشم سازی اور کاغذ سازی کے صنعتی راز انھیں کے پاس رہیں مگر وہ اس کوشش

کامیاب نہ ہوسکے۔ رسل ورسائل اور نشرواشاعت کی ساری دشواریوں کے باوجود یہ راز دوسری قوموں کو بھی معلوم ہوگئے اور کاغذ بنانے اور ریشم بنانے کی صنعتیں دنیا بھر میں عام ہوگئیں۔ یہی حال باقی تمام علوم کا رہا ہے۔ کوئی قوم خود اپنے اوپر علم وحکمت کے دروازے بند کرلے تو الگ بات ہے۔ ورنہ علم وحکمت ہمیشہ نوع انسان کی مشترکہ میراث رہے ہیں۔ جب تک یورپ نے خود اپنے گرد تعصب اور تنگ نظری کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اس وقت تک وہ علوم وفنون کی برکتوں سے محروم رہا۔ مگر جونہی پندرہویں صدی کے نصف آخر میں اس نے تعصب اور تنگ نظری کی دیواروں کو ڈھایا، اسلامی دنیا کے تمام علوم وفنون دیکھتے ہی دیکھتے یورپ میں منتقل ہوگئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یورپ نے ان علمی بنیادوں پر تحقیق وجستجو کی ایک نئی عمارت کھڑی کی جس نے جدید سائنسی تہذیب کو جنم دیا۔

غرض سائنس اور ٹکنالوجی کسی خاص ملک یا قوم کی ملکیت نہیں وہ نوع انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔ مشینی رسل ورسائل اور نشرواشاعت کے موجودہ دور میں علوم وفنون کی کوئی شاخ کسی خاص قوم یا ملک کا واحد اجارہ نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی قوم اپنی پست ہمتی یا کوتاہ بینی کے باعث خود اپنے اوپر سائنس اور ٹکنالوجی کے دروازے بند نہ کرلے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک مختصر سے عرصے میں ترقی یافتہ ملکوں کی ہمدوش نہ بن جائے اس سلسلے میں پہلی قابل ذکر مثال جاپان کی ہے۔ اس ایشیائی ملک نے سائنسی ایجاد واختراع کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ مگر اس کے باوجود اس نے اپنی فرسودہ معیشت کو مغربی سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیادوں پر اس طرح استوار کیا کہ یہ معیشت مغرب کے ساتھ مقابلہ کرلینے کے قابل ہوگئی۔

اس قسم کی دوسری اور تازہ ترین مثال روس کی ہے۔ انقلاب روس کے ہیرو لینن نے ملک کی تعمیر نو کا منصوبہ تیار کرتے وقت یہ بنیادی اصول طے کردیا تھا کہ :-

"ہم ایجاد واختراع سے کام نہیں لیں گے۔ ہم مغرب کی ایجادات واختراعات کو بنیاد بنا کر اسی بنیاد پر قومی ترقی کی عمارت کھڑی کریں گے،" لینن کے اس اصول پر کاربند ہوکر روس نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ دورحاضر کے عجائبات میں سے ہے۔ آج سے کوئی تین چار دہائیاں پہلے روس پر ایک پسماندہ زرعی معیشت مسلط تھی۔ ملک کے دیہات میں رہتے تھے اس کی بکھری ہوئی دیہاتی آبادی

اور اس آبادی کی جہالت اور توہم پرستی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ملک مستقبل قریب میں ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو سکے گا۔ مگر سرخ انقلاب کے بعد روس نے اپنی پسماندہ زرعی معیشت کو جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیادوں پر تعمیر کرنا شروع کیا۔ زراعت اور صنعت دونوں میں مشینوں سے کام لیا جانے لگا۔ نئے نئے ٹیکنیکل پیشے وجود میں آنے لگے۔ فنی ماہروں، سائنس دانوں، انجینیروں اور مشینیں چلانے والوں کی مانگ تیزی سے بڑھنے لگی۔ زراعت، صنعت، عام کاروبار، غرض زندگی کے ہر شعبے میں سائنس اور ٹکنالوجی سے خدمت لی جانے لگی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ملکی پیداوار میں ناقابل یقین تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ صرف دو دہائیوں میں روسی معیشت اس قدر قوی ہو گئی کہ فسطائی عسکریت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ زمانہ مابعد جنگ میں بھی روس نے سائنس اور ٹکنالوجی کو مرکز توجہ بنائے رکھا۔ تاآں کہ وہ اس میدان میں مغرب کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے نہ صرف ہم پلّہ ہو گیا، بلکہ بعض باتوں میں ان سے بھی بازی لے گیا۔

تھوڑے عرصے میں لمبا فاصلہ

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں روس نے نہایت ہی تھوڑے عرصے میں ایک لمبا فاصلہ طے کیا ہے۔ برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور دوسری مغربی قوموں نے ترقی کی جو منزلیں ایک یا ڈیڑھ صدی میں طے کی تھیں، روس نے وہ تمام منزلیں ایک چوتھائی صدی میں طے کر لی ہیں۔ بے شک یہ ایک محیرالعقول کارنامہ ہے۔ مگر یہ کارنامہ ممکن بنانے کے لیے روسی قوم نے بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اس وقت روس سائنس اور ٹکنالوجی کی دوڑ میں عالمی رہنمائی کے مقام تک جا پہنچا ہے۔ مگر ملک میں اشیائے صارفین کی اب تک اتنی کمی ہے کہ غیر ملکیوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔ روزمرہ ضرورت کی جو چیزیں باقی ملکوں میں لازمہ زندگی بن چکی ہیں روس میں ان کا اب تک توڑا ہے۔ رنگ برنگ لیبر کیلئے کپڑے، ٹائر، عینکیں اور اس قسم کی دوسری چیزیں جن سے باقی دنیا کی دکانیں اٹی پڑی ہیں، ماسکو میں بہت شاذ دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کی قیمتیں اتنی گراں ہیں کہ وہ عوامی پہنچ سے باہر ہو کر رہ گئی ہیں۔ وجہ یہ کہ روس اپنی ساری توجہ اشیائے تعیش کی بجائے قومی استحکام پر صرف کر رہا ہے۔ قومی دولت کا بیشتر حصہ اب تک

بھاری صنعتوں پر صرف ہو رہا ہے۔ عام ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزوں کی وسیع پیمانے پر تیار کرنے اور انھیں سستے داموں مہیا کرنے کی ابھی کوشش نہیں کی گئی۔ روسی عوام جن کے نام پر صنوعی چاند فضا بسیط کو کھنگالتے پھرتے ہیں ابھی تک خاصی عسرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انھیں موٹے جھوٹے بے رنگ کپڑے پہننے کو ملتے ہیں۔ انھیں مکانیت کی شدید کمی کا سامنا ہے۔ مشینوں کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں جو دوسرے ملکوں میں عام ہیں۔ روسی عوام ان سے محروم ہیں۔ مگر وہ ان تمام محرومیوں کو خوشی سے قبول کر رہے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ انھی قربانیوں کی بدولت وہ اس قابل ہو سکے ہیں کہ تھوڑے عرصے میں ایک لمبا فاصلہ طے کرلیں۔

صنعتی تربیت

کارخانہ ہو یا کھیتی باڑی یا دفتری کاروبار۔ روس میں ہر جگہ مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کارخانوں، کھیتوں اور دفتروں میں ہر جگہ فنی ماہروں اور تربیت یافتہ کاریگروں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اور روس میں پچھلے کئی سالوں سے فنی ماہروں اور تربیت یافتہ کاریگروں کی مانگ مکمل طور پر پوری نہیں ہو سکی۔ یہ مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر روسی نوجوان صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ پہلے سے ملازم ہیں وہ مزید تربیت حاصل کر کے اپنی فنی قابلیت کو مطلوبہ سطح پر لاتے ہیں۔ صنعتی تعلیم و تربیت کی سہولتیں ایک جامع منصوبہ کے تحت مہیا کی گئی ہیں۔ ان سہولتوں کا مقصد یہ ہے کہ روسی نوجوان مفید مطلب علوم اور مہارتیں حاصل کریں یا حاصل کردہ علوم اور مہارتوں کو بہتر بنائیں۔ نیز وہ اس قسم کے اختراع و اطوار حاصل کریں کہ وہ اشتراکی معیشت کو سہارا دینے والے ثابت ہوں۔

روس میں صنعتی تعلیم و تربیت کی جو وسیع سہولتیں موجود ہیں ان کا مقابلہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے علاوہ شاید دنیا کا اور کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ مگر دونوں ملکوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں امریکہ میں صنعتی تعلیم عام نصاب مدرسہ کا ہی ایک جزو ہے۔ روس میں اس کا علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ روس میں ایسے اداروں کا جال بچھا ہوا ہے جو چودہ برس سے زیادہ عمر کے طلبہ اور طالبات کو صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم

دیتے ہیں نظم ونسق کے اعتبار سے یہ ادارے روس کے نظام مدارس سے بالکل الگ ہیں صنعتی تربیت کے یہ ادارے مرکزی نظامت محنت کی زیر نگرانی چل رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ادارے نوجوانوں کے لیے صنعتی تعلیم کے نصاب پیش کرتے ہیں اور بعض پہلے سے ملازم کاریگروں کو مزید تربیت مہیا کرتے ہیں۔ مختلف سرکاری محکمے اور وزارتیں اپنے ملازموں کی تعلیم وتربیت کو مطلوبہ سطح پر رکھنے کے لیے ذمہ دار ہیں اور وہ ان کی صنعتی اور فنی تعلیم وتربیت کے لیے مستقل تعلیمی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔

صنعتی اور فنی تربیت کے لیے روس میں مندرجہ ذیل ادارے موجود ہیں:-

(۱) بنیادی صنعتی تعلیم کے ابتدائی مدرسے۔

(۲) صنعتی ٹیکنیکل سکول جو دس سالہ نصاب مدرسہ کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ایک یا دو سال تک صنعتی تربیت دے کر انھیں مخصوص فنی مہارتیں سکھاتے ہیں۔

(۳) حکومت یا کارخانہ داروں کے جاری کردہ صنعتی مدرسے جو تین ماہ سے لے کر دو سال تک کے لیے تربیتی نصاب پیش کرتے ہیں۔

(۴) کارخانوں اور دوسرے کاروباری اداروں کے جاری کردہ تربیتی مرکز جہاں متعلقہ صنعت یا کاروبار کی تربیت دی جاتی ہے۔

صنعت کے لیے ابتدائی بنیادی مدرسے

صنعتی تعلیم وتربیت کے جن چار گانہ اداروں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان میں سب سے اہم بنیادی صنعتی تعلیم کے مدرسے ہیں کیونکہ نوجوانوں کو فنی یا نیم فنی تربیت دے کر صنعت کے لیے تیار کرنا ان مدارس کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرف عام میں ان مدرسوں کو محفوظ محنت کے مدرسے بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مدرسے مندرجہ ذیل چار اقسام کے نصاب پیش کرتے ہیں:-

(۱) ۱۲ سے اٹھارہ ماہ کا نصاب جس کا مقصد نوجوانوں کو ہلکی صنعتوں میں کام کرنے کے لیے تیار کرنا ہے یہ مدرسے اگرچہ نظامت محنت کے ماتحت ہیں، مگر ان کی تعلیم وتربیت ان کارخانوں کی زیر نگرانی انجام پاتی ہے جن میں انھیں بعد ازاں کام کرنا ہوتا ہے۔ ان لحاظ سے یہ نصاب "محفوظ محنت" کے

نظام کا حصہ نہیں ہے۔

(ب) چھے سے بارہ مہینے کا صنعتی نصاب جس کا مقصد سولہ سے انیس برس کی عمر کے نوجوانوں کو بنیادی صنعتوں کے کاریگر یا نیم کاریگر بنانا ہے۔ بنیادی صنعتوں میں بھاری سنگ تراشی، مکانوں کی آرائش کرنا، موٹروں اور بسوں کی مرمت کرنا۔ عمارتوں پر پلستر کرنا اور کارخانوں میں انبوہی پیداوار کے لیے کام کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ جو نوجوان یہ نصاب لینا چاہیں ان کے لیے سابقہ تعلیم کی کوئی قید نہیں۔

(ج) تین سالہ صنعتی نصاب جس کا مقصد چودہ سے سترہ برس کے طلبہ اور طالبات کو تربیت دینا ہے۔ تربیت حاصل کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ پہلے سات برس تک مدرسے میں پڑھ چکے ہوں۔ یہ نصاب مختلف قسموں کی صنعتی تربیت دیتا ہے۔ مثلاً دریائی اور سمندری رسل و رسائل۔ طباعت۔ نشر و اشاعت کیمیائی صنعت۔ دھاتوں کی صنعت۔ کان کنی۔ بجلی کے تیل کی صنعت وغیرہ وغیرہ

(د) ریلوے سکول :۔ یہ مدرسے بھی صنعتی مدرسوں سے ملتا جلتا نصاب پیش کرتے ہیں۔ اس نصاب کا مقصد ملکی ریلوے کے لیے طرح طرح کے کاریگر اور فنی ماہر تیار کرنا ہے۔ مثلاً انجنوں اور گاڑیوں کی مرمت کرنے والے مستری۔ ٹریفک کا انتظام کرنے والے لوگ۔ طرح طرح کی مشینیں چلانے والے کاریگر اور دوسرے ماہر۔

صنعتی محنت کی تربیت

صنعتی محنت کی تربیت کا باقاعدہ آغاز روسی انقلاب کے جلد بعد ہی ہو گیا تھا۔ یہ اقدام ہنگامی ضرورتوں کی پیداوار تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ایسے صنعتی مدرسے قائم کیے گئے جن کا مقصد کارخانوں اور فیکٹریوں کے لیے کاریگر مہیا کرنا تھا۔ اوّل اوّل یہ مدرسے صرف کپڑے اور دھات کے کارخانوں کے لیے کاریگر تیار کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسری صنعتوں کے لیے بھی تربیتی نصاب پیش کیے جانے لگے۔ ایک سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۲۱ء تک ان مدرسوں کی تعداد ۲۳ کو جا پہنچی اور ان کی تعداد طلبہ ۵۰ ہزار ہو گئی۔ یہ تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ ۱۹۳۲ء میں اس قسم کی صنعتی تربیت حاصل کرنے والوں کی تعداد اڑھائی لاکھ تھی۔ ۱۹۳۳ء کے بعد ان مدرسوں کے نصاب کی مدت ۱۷ سے ۱۸ ماہ تک ہو گئی۔ صرف بعض

استثنائی حالتوں میں نصاب کی میعاد دو سال رکھی گئی۔

ان مدرسوں کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کے ڈائرکٹر بیک وقت دوہری ذمہ داری رکھتے ہیں طریقہ ہائے تدریس اور طریق کار کے لیے وہ وزارت تعلیم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ مگر فنی مہارت اور ٹیکنیکل معیاروں کے معاملے میں وہ ان کارخانوں کے سامنے جواب دہ ہیں جن کے لیے وہ کاریگر تیار کرتے ہیں۔ نظم ونسق کی ذمہ داری سکول کے ڈائرکٹر پر ہے۔ مگر اس کو مشورہ دینے کے لیے ایک کونسل مقرر ہوتی ہے۔ اس کونسل میں مدرسے کے استاد، مقامی مزدور انجمن کا ایک نمائندہ، متعلقہ کارخانے کا ایک نمائندہ، مدرسے کا ڈائرکٹر اور مجلس طلبہ کا ایک نمائندہ شامل ہوتا ہے۔

۱۹۳۳ء کے بعد ان مدرسوں کے نصاب میں کافی ترمیم ہوئی ہے۔ اب نصاب کا اسی فی صد عملی تربیت پر مشتمل ہے اور صرف بیس فی صد نظری معلومات، سیاسی نظریات اور بدنی تربیت پر مشتمل ہے۔

محفوظ محنت کا نظام

روسی معیشت کو صنعتی شکل دینے کا کام چھوٹے چھوٹے کارخانوں کے قیام سے شروع کیا گیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کارخانے پھیلنے لگے۔ ان کا کاروبار اور نظام کار وسیع تر اور پیچیدہ تر ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ماہر اور نیم ماہر کاریگروں کی رسد کا مسئلہ بہت مشکل بن گیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں سپریم سوویٹ نے اس صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک خاص فرمان جاری کیا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ "ملک صنعت کو وسعت دینے کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ موزوں قابلیت کے کاریگر باقاعدگی کے ساتھ کانوں، نظام رسل ورسائل، کارخانوں اور دوسرے صنعتی اداروں کو مہیا ہوتے رہیں"۔

اس فرمان کی رو سے روس میں فنی کاریگروں کی جبری تربیت کا موجودہ طریق رائج ہوا۔ اس وقت سے یہ طریق اختیار کیا گیا کہ ہر سال شہری علاقوں اور اجتماعی فارموں سے آٹھ سے دس لاکھ لڑکے لیے جائیں اور انہیں صنعتی تربیت دی جائے۔ اصل آرڈی ننس کی رو سے اجتماعی فارم کے صدر کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ سو کی آبادی میں سے ہر سال چودہ سے سترہ برس کی عمر کے چار لڑکے صنعتی تربیت کے لیے مہیا کرے۔ اس کے مقابلے میں شہری آبادی کے لیے لڑکوں کی تعداد کو ضرورت پر موقوف رکھا گیا۔ اس امتیاز کی غایت غالباً یہ تھی کہ دیہاتی

نوجوانوں کی اکثریت صنعتی تعلیم میں پیچھے تھی۔

"محفوظ محنت" کا نظام ایک واضح عملی ضرورت کے ماتحت وضع کیا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد نوجوانوں کو عام فنی تعلیم دینا نہیں بلکہ ملک کی تعمیری ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ روسی معیشت کا سارا تانا بانا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی صحت مند توسیع و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ نئے ماہروں اور کاریگروں کی بہم رسانی کو اتفاقات پر چھوڑنے کی بجائے اسے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت رکھا جائے۔

اس نظام کی ترویج کے جلد بعد ایک ذمہ دار روسی رہنما نے اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:۔

محفوظ محنت کا نظام اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیے رائج کیا گیا ہے کہ روزگار حاصل کرنے کے شہری حق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ملکی مفاد اور ضرورتوں سے قطع نظر انسان جو پیشہ بھی چاہے اختیار کر لے"

ریلوے مدارس :۔ صنعتی مدارس اور "محفوظ محنت" کے مدارس کے نصاب کا فیصلہ محفوظ محنت کی نظامت اعلیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نصاب تعلیم اور طریق کار کا فیصلہ کرنا اور اس کی خامیوں کو دور کرنا اس نظامت کی ذمہ داری ہے۔ لیکن زیر تربیت نوجوانوں کے دلوں میں اشتراکی قدروں کے لیے سرگرمی پیدا کرنے کا کام مقامی مزدور انجمن اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کی ذمہ داری ہے۔ روس کے سرکاری اخبار "پراودا" نے ستمبر ۱۹۵۴ء میں اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:۔ "ان تعلیمی اداروں کے طلبہ کو محنت کش طبقے کی بہترین روایات عطا کرنا۔ ان میں اعلیٰ درجے کا تخلیقی ضبط پیدا کرنا۔ اجتماعی بہبود کی تمنا پیدا کرنا۔ اپنے پیشے کے ساتھ دلی لگاؤ پیدا کرنا۔ پیداوار بڑھانے کا جذبہ پیدا کرنا اور محنت کے نتائج کو لگاتار بہتر بنانے کی آرزو پیدا کرنا۔ یہ تمام کام مقامی مزدور انجمن اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کو انجام دینے چاہئیں"

سپریم سوویٹ نے جون ۱۹۴۰ء میں ایک اور فرمان جاری کیا جس کی رو سے لازمی صنعتی تعلیم لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کے لیے بھی ضروری قرار دی گئی۔ اس وقت سے پندرہ اور سولہ برس کی لڑکیاں ریلوے اور صنعتی مدرسوں میں بھی جا رہی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے فرمان کی رو سے لڑکوں کی جبری صنعتی تعلیم کی عمر کو بھی بقدر دو سال بڑھا دیا گیا چنانچہ انیس سالہ لڑکے بھی کانوں میں زیر زمین کام کرنے کے لیے اور فولادی بھٹیوں میں طرح طرح کے کام کرنے کے لیے تربیت حاصل کرنے لگے ہیں۔

سنہ ۵۶-۱۹۵۵ء تک روس میں جبری صنعتی تعلیم دینے والے کوئی تین ہزار مدرسے تھے ان میں کوئی ساڑھے تین لاکھ طلبہ زیر تربیت تھے "محفوظ محنت" کے نظام نے پہلے پندرہ برسوں میں پچھتر لاکھ سے اوپر کاریگر اور فنی ماہر پیدا کیے جو کم و بیش پانچ سو پیشوں میں فنی تربیت حاصل کر چکے تھے۔

لازمی صنعتی تعلیم حاصل کرنے والوں کو کسی قسم کے امتحان کے بغیر داخل کر لیا جاتا ہے۔ تاہم وہ ناخواندہ نہیں ہوتے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں جن کی عمریں چودہ اور انیس سال کے درمیان ہوتی ہیں مدرسے میں تعلیم پا چکے ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق ان میں سے بیشتر چار یا پانچ سال کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ مگر جو لڑکے اور لڑکیاں سنہ ۱۹۵۲ء میں داخل ہوئے وہ تقریباً سب کے سب سات سال تک تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد سے سات سالہ تعلیم کو داخلے کی ایک شرط قرار دیا گیا ہے۔

"محفوظ محنت" کی جبری بھرتی کے اصول وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں۔ تاہم بھرتی کرتے وقت مندرجہ ذیل ترجیحوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے:-

(۱) ایسے لڑکے اور لڑکیاں جو نہ مدرسے میں داخل ہوں اور نہ کسی جگہ ملازم ہوں۔

(۲) ایسے طلبہ اور طالبات جو سات سالہ مدرسے میں بار بار فیل ہو رہے ہوں۔ خواہ اس کی وجہ انکی پست ذہانت ہو یا علمی مضامین کے لیے ان کی غیر موزونیت۔

(۳) سات سالہ مدرسوں کے دیہاتی طلبہ۔

مفت تعلیم

"محفوظ محنت" کی تعلیم دینے والے مدرسے روس کے دوسرے صنعتی مدرسوں کی طرح بالکل مفت تعلیم دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ کسی قسم کی فیس وصول نہیں کرتے بلکہ وہ مفت رہائش اور خوراک مہیا کرتے ہیں۔ کپڑے اور کتابیں مفت فراہم کرتے ہیں۔ روسی اطلاعات کے مطابق حکومت کو ہر زیر تربیت طالب علم پر اوسطاً آٹھ ہزار روبل خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ تاہم یہ یقین کرنے کے لیے شہادت موجود ہے کہ حکومت یہ سکول خسارے میں نہیں چلا رہی۔ نصاب کا بیشتر حصہ عملی تربیت پر مشتمل ہے۔ یہ تربیت متعلقہ کارخانوں اور صنعتی اداروں میں دی جاتی ہے۔ اس کام کا معاوضہ معیاری اجرتوں کے ۳۳ سے ۸۰ فی صد تک وصول

ہوتا ہے۔ یہ آمدنی تربیت پانے والوں کے ہر طرح کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

"محنتِ محفوظ" کے تمام مدرسے ایک قسم کی تعلیم نہیں دیتے۔ ہر مدرسے کے نصاب کا انحصار اس پیشے پر ہے جس کی مخصوص تربیت اس کے ذمے ہو۔ نصاب کا انحصار ایک حد تک طلبہ کی سابقہ تعلیم پر بھی ہے۔ نصابات کے متعلق اگر کوئی عام بات کہی جا سکتی ہے تو یہی کہ کل تدریسی وقت کا کوئی ۳۹ فی صد عام تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور ۶۱ فی صد عملی صنعتی تربیت پر۔

معمول سے زیادہ محنت

روس کا تعلیمی سال دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ سال میں نسبتاً کم چھٹیاں آتی ہیں۔ پھر ہفتے میں پورے چھے دن سکول لگتا ہے۔ امریکہ میں ہفتہ صرف پانچ دن کا ہے۔ پانچ دن پڑھائی کے بعد ہفتے اور اتوار کی دو چھٹیاں آ جاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی ہر ہفتے میں ڈیڑھ دن کی چھٹی آ جاتی ہے۔ مگر روس میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں سوموار سے ہفتے کے دن تک پورے چھے دن تک پڑھائی ہوتی ہے۔ پھر ہمارے یہاں گرمیوں کے موسم میں پڑھائی کا وقت چھے گھنٹے کی بجائے پانچ گھنٹے کر دیا جاتا ہے۔ روس میں تدریسی وقت کی لمبائی کسی موسم میں کم نہیں کی جاتی۔

روس میں تعلیمی سال یکم ستمبر سے شروع ہو کر وسط جون میں ختم ہو جاتا ہے۔ جو طالب علم نصابِ تعلیم ختم کر رہے ہوں ان کے لیے تعلیمی سال ایک ہفتہ اور لمبا ہو جاتا ہے۔ یہ سال چار چوتھائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ روسی جاڑا اپنی شدت کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مگر جاڑے میں صرف دس دن کی تعطیلات جنوری کے شروع میں ہوتی ہیں۔

"محفوظ محنت" کے مدرسوں کا نصاب عموماً دو سالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے سال ہفتے میں چھے دن چھے گھنٹے روزانہ کام ہوتا ہے۔ دوسرے سال میں ہفتے میں چھے دن سات گھنٹے روزانہ کام ہوتا ہے۔ دن میں نظری تعلیم اور عملی تربیت کے اوقات بدل بدل کر آتے ہیں۔ آخری سال کی تیسری اور چوتھی چوتھائی میں طلبہ کو سات گھنٹے روزانہ عملی کام کرنا پڑتا ہے۔ نصاب کے آخری آٹھ ہفتوں میں روزانہ کام کی لمبائی سات کی بجائے آٹھ گھنٹے ہو جاتی ہے۔ اس عرصے میں طالب علم کے ذمہ کارخانے میں کوئی خاص کام لگا دیا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف

سالوں یہ کام کرنا پڑتا ہے، بلکہ اس کام کے متعلق ایک مفصل مضمون بھی تیار کرنا پڑتا ہے جس میں کام کی نوعیت اور اس کے سائنسی اصولوں پر تفصیلی بحث کرنا ہوتی ہے۔ اس طریق کار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روسی نوجوان پہلے مدرسے کی ورک شاپ میں تربیت حاصل کرتے ہیں اور نصاب کے آخری مرحلے پر کسی قریبی کارخانے میں باقاعدہ کام کرنے لگتے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ اس طریق کار میں بعض کوتاہیاں ابھی ہیں۔ مگر مجموعی طور پر یہ تجربہ کافی کامیاب ثابت ہوا ہے۔ "محفوظ محنت" کا نظام روسی معیشت کو ایسے کارندے اور معمار مہیا کر رہا ہے جو اپنا کام جانتے ہیں اور اسے سرگرمی سے انجام دیتے ہیں۔ دوران تربیت طلبہ کی کارکردگی کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور تربیت کے اختتام پر ان کا آخری امتحان ہوتا ہے۔ جو طلبہ اس امتحان میں ناکام رہیں انھیں کم اجرت پر عام مزدوروں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔

بنیادی صنعتی تعلیم

بنیادی صنعتی تعلیم کا نصاب چھے سے بارہ مہینے لمبا ہوتا ہے۔ نصاب کی لمبائی کا انحصار اس پیشے پر ہے جس کی مخصوص تیاری مطلوب ہو۔ نصاب کا بیشتر حصہ عملی تربیت پر مشتمل ہے اور سو گھنٹے نظری تعلیم پر صرف کیے جاتے ہیں۔ نظری تعلیم مضمون کی اصطلاحات کی تشریح اور صنعتی سلامتی پر مشتمل ہوتی ہے۔

کان کنی کا نصاب ایک سال لمبا ہے۔ ایک طالب علم جس نے یہ نصاب کامیابی سے ختم کیا اپنے ذاتی تجربے یوں بیان کرتا ہے:-

مجھے سرکاری حکم موصول ہوا کہ کان کنی کے فلاں مدرسے میں حاضر ہو جاؤں۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ اپنے ساتھ یہ دستاویزیں لے کر جاؤں:- داخلی پاسپورٹ۔ پیدائش کا سرٹیفکیٹ۔ اپنے مختصر حالات زندگی داخلے کی درخواست۔ تین فوٹوگراف۔ پرائمری تعلیم ختم کرنے کا سرٹیفکیٹ۔ صحت کا سرٹیفکیٹ۔ میں یہ تمام کاغذات لے کر حاضر ہو گیا۔ داخلے کا کوئی امتحان نہیں لیا گیا۔"

میرے ساتھ مقامی علاقے سے ۲۵ سے زیادہ لڑکے داخل ہوئے۔ تربیت کے لیے ہمیں چار گروہوں میں بانٹ دیا گیا (۱) لکڑی کا کام کرنے والے (۲) لادنے والے (۳) کاٹنے والے اور

یہ سود ارغ کرنے والے۔ ہر گروہ کو پندرہ پندرہ بیس بیس کے دستوں میں بانٹ دیا گیا اور ہر دستے پر ایک فورمین مقرر کر دیا گیا جو متعلقہ کام میں ماہر تھا۔ پہلے مہینے ہمیں کوئلے کی اقسام، اس کی نوعیت، ساخت کوئلے کی تہوں کی بناوٹ اور کوئلہ نکالنے کے طریقوں کا حال بتایا گیا۔ اس اثنا میں لیکچر دیے جاتے تھے اور گھر کا کام بھی دیا جاتا تھا۔ ازاں بعد ہمیں ہر روز ایک کوئلے کی کان میں لے جاتا، جہاں ہم اپنے اپنے فورمین کی رہنمائی میں کام کرتے۔ ہمیں دو دو ڈیوٹی فارمیں دی گئیں"۔

ذاتی پسند پر پابندی

"محفوظ محنت" کے نظام کا ذکر کرتے وقت ایک روسی رہنما کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے کہ جبری صنعتی تعلیم کا منشا پیشے کے بارے میں نوجوانوں کی ذاتی پسند پر پابندی لگاتا ہے۔ یہ نظام اس اصول پر مبنی ہے کہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت چلنے والی معیشت میں قومی مفاد اور ضرورت کو پہلا مقام ملنا چاہیے۔ افراد کو بے شک یہ حق حاصل ہے کہ وہ باعزت روزگار کا مطالبہ کریں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی پسند کے پیشے کا بھی مطالبہ کریں۔ پیشے کا فیصلہ منصوبہ بندی کرنے والی مرکزی قیادت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

اس سے ظاہر ہے کہ "محفوظ محنت" کے نظام کے تحت صنعتی تعلیم حاصل کرنے والوں کی حیثیت جبری طور پر فوج میں بھرتی کیے جانے والوں کی سی ہے۔ ملکی اور قومی مفاد ان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فلاں فلاں پیشے کی تربیت حاصل کریں اور اسی پیشے میں کام کریں۔ چنانچہ "محفوظ محنت" کے مدرسوں سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کو چار سال تک اسی کارخانے یا کان میں کام کرنا پڑتا ہے، جہاں انہیں مقرر کر دیا جائے۔ ایک سرکاری محکمہ اس غرض سے قائم ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیتا رہے کہ آیا فارغ التحصیل طلبہ اور طالبات کی خدمات سے پورا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اور آیا وہ اسی جگہ کام کر رہے ہیں جہاں انہیں لگایا گیا تھا۔ ان فارغ التحصیل کاریگروں کو مقررہ شرحوں کے مطابق اجرت ملتی ہے۔ اگر ان کی تقرری گھر سے باہر کر دی جائے تو انہیں سفر خرچ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں گھر آنے جانے کے لیے ½ ۷ روبل روزانہ ملتے ہیں۔ تقرری کے مقام پر انہیں رہنے کو جگہ دی جاتی ہے۔ نیز انہیں تین سو روبل پیشگی کے طور پر دیے جاتے ہیں۔ یہ رقم بعد ازاں پہلے چھ مہینوں کی تنخواہ میں سے کاٹ لی جاتی ہے۔ تین ماہ کی ملازمت کے بعد وہ دو ہزار روبل تک قرض لے سکتے ہیں۔ یہ

دو سال کے اندر اندر یکساں ماہوار قسطوں میں واپس کرنا پڑتا ہے۔ چار سال کے عرصے سے پہلے کوئی فارغ التحصیل نوجوان اپنے کام سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ خود کام چھوڑ کر بھاگ جائے تو اس کے خلاف عدالتی کارروائی ہو سکتی ہے اور اسے نہ صرف قید کی سزا دی جا سکتی ہے بلکہ اسے دوبارہ اسی جگہ مقرر کیا جا سکتا ہے جہاں سے وہ بھاگا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ تک "محفوظ محنت" کا نظام پوری طرح مضبوط ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں یہ نظام اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا کیونکہ اس سال کوئی دس لاکھ طلبہ اور طالبات لازمی صنعتی تعلیم کے لیے داخل کیے گئے مگر اس کے بعد داخل ہونے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سات سالہ ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی جا چکی تھی اور دس سالہ ثانوی تعلیم میں بھی کافی توسیع ہو گئی تھی۔ ثانوی تعلیم کی توسیع نے ان نوجوانوں کی تعداد گھٹا دی ہے جو جبری صنعتی تعلیم کے لیے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

صنعتی استادوں کی تربیت

"محفوظ محنت" کا نظام دوسری عالمی جنگ کی مہیب ضرورتوں کے تحت وضع کیا گیا تھا۔ اچانک نازی حملے نے روسی معیشت کو جو شدید صدمہ پہنچایا تھا اس کے مقابلے کے لیے فنی ماہروں کی شدید ضرورت پیدا ہو گئی تھی مگر نوجوانوں کو صنعتی اور فنی تربیت دینے کے لیے صنعتی استادوں کی ضرورت تھی۔ روسی حکام کو جلد یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ ایک ماہر کاریگر کے لیے اچھا استاد ہونا ضروری نہیں۔ کئی ایک فنی ماہر جو اپنے کام میں چوٹی کی مہارت رکھتے تھے عموماً دوسروں کو اپنے فن کی ماہیت سمجھانے کے نا قابل تھے۔ اچھا استاد بننے کے لیے عملی مہارت اور طریقہ ہائے تدریس کا علم دونوں یکساں ضروری تھے۔ چناں محفوظ محنت کی وزارت نے صنعتی استادوں کی تیاری کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس طرح مختلف فنی ماہروں اور صنعت کاروں کے اساتذہ کی تربیت گاہیں قائم ہو گئیں۔ ان تربیت گاہوں میں صنعتی مدرسوں کے ایسے فارغ التحصیل طلبہ کو داخل کیا گیا جنھوں نے صنعتی تربیت کے زمانے میں غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ صنعتی استادوں کی تربیت کے لیے چار سالہ نصاب مقرر ہے۔ اس چار سالہ تربیتی عرصے میں یہ استاد نہ صرف مزید صنعتی تربیت حاصل کرتے ہیں بلکہ قریبی صنعتی مدرسے میں پڑھانے کی مشق بھی کرتے ہیں۔ چار سالہ نصاب کے خاتمہ تک متعلم اساتذہ مندرجہ ذیل تین میں سے کسی ایک میں مہارت تامہ حاصل کر لیتے ہیں

(۱) مشینوں اور مشینی اوزاروں کی مرمت کا کام (۲) بجلی کا کام (۳) ریڈیو کے متعلق ہر طرح کا کام۔
صنعتی سکولوں میں بالعموم اعلیٰ درجے کی ورکشاپیں موجود ہیں جن میں عملی کام سکھانے کے لیے جدید ترین مشینیں اور اوزار مہیا کیے گئے ہیں۔ استاد ان مشینوں اور اوزاروں سے کام لینا سکھاتے ہیں اور طلبہ اس بات کی مشق کرتے ہیں۔

سیاسی اور ثقافتی تربیت

جس قانون کی رو سے "محفوظ محنت" کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ زیر تربیت نوجوانوں سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے لیے بنیادی ضرورت کی چیزیں تیار کریں۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان ان نوجوانوں نے سرکاری ضرورتوں کے لیے جو سامان تیار کیا اس کی مالیت ۰۰ اور ۸۰ لاکھ روبل کے درمیان تھی۔ ایک سرکاری اطلاع کے مطابق دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک صنعتی مدرسے نے تیس ہزار بارودی سرنگیں تیار کیں اور چھ ہزار رائفلوں ۲۸۰ بندوقوں اور کوئی اڑھائی لاکھ آلات ہوابازی کی مرمت کی۔
"محفوظ محنت" کی کارکردگی کا ذکر کرتے وقت یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ نظام جبری بھرتی کے اصول پر عمل رہا ہے صنعتی مدرسوں میں بھرتی کیے جانے والے لڑکے اور لڑکیاں کئی حالتوں میں جبری صنعتی تربیت کو بخوشی قبول نہیں کرتے اور عام حالتوں میں انھیں وہ پیشہ پسند نہیں ہوتا جس کا سیکھنا ان کے ذمہ لگا دیا جاتا ہے۔ زیر تربیت نوجوانوں کی ناپسندیدگی پر غالب آنے اور ان کے دلوں میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے ان کی سیاسی اور ثقافتی تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ تربیت کے زمانے میں جو چھٹیاں آتی ہیں طلبہ انھیں اپنی پسند کے مطابق نہیں گذار سکتے بلکہ ان چھٹیوں میں حکومت ان کی سیاسی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ انتظام کرتی ہے۔ سیاسی ثقافتی۔ ادبی اور ٹیکنیکل، موضوعوں پر لیکچر دیے جاتے ہیں۔ اور جہاں ممکن ہو سکے طلبہ کو سیر و سیاحت کے لیے لے جایا جاتا ہے۔
اوقات تدریس کے بعد طلبہ کو ان عملی منصوبوں پر کام کرنا پڑتا ہے جو ان کے ذمے لگائے جاتے ہیں۔ ہر طالب علم کو اپنے خصوصی مضمون کی مناسبت سے کئی ایک عملی منصوبے مکمل کرنے پڑتے ہیں۔ اور بعد از مدرسہ اوقات کا ایک بڑا حصہ اس کام کی نذر ہو جاتا ہے۔ جب طلبہ تدریسی کام اور منصوبی کام دونوں سے فارغ ہوں تو انھیں بے کار نہیں رہنے دیا جاتا۔ بلکہ طرح طرح کی غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جاتا ہے "محفوظ محنت" کے ناظم اعلیٰ کے ماتحت

یب نائب ناظم محض اس کام پر مامور ہے کہ غیر نصابی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کرے اور اس بات کا جائزہ لے کہ آیا منصوبے پورے ہو رہے ہیں۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں سیاسی، ثقافتی اور تفریحی مشاغل شامل ہیں۔ غرض روسی ماہرین تعلیم صنعتی تربیت کو محض فنی اور ٹیکنیکل مہارت عطا کرنے کا وسیلہ ہی نہیں سمجھتے وہ اسے کمیونسٹ اعتقادات میں پختہ یقین پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ تاکہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو ٹیکنیکل مہارت حاصل کریں وہ پوری گرمی کے ساتھ اشتراکی نصب العین کی خدمت میں صرف ہو۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بدنی تربیت پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ جو طلبہ ان مقابلوں میں امتیاز حاصل کرتے ہیں انہیں ضلعی، ریاستی، قومی اور بعض اوقات بین الاقوامی مقابلوں میں بھیجا جاتا ہے۔

ٹیکنیکل سکول

اوپر دیکھا جا چکا ہے کہ "محفوظ محنت" کا نظام ان لڑکوں اور لڑکیوں کی صنعتی تربیت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ جو سات سالہ ابتدائی مدرسے سے آگے تعلیم جاری نہیں رکھتے۔ مگر اب ایسے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو ابتدائی مدرسے کے بعد پڑھائی جاری رکھتے ہیں۔ روسی ثانوی مدرسہ دس سالہ ہے۔ ثانوی مدرسوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو صنعتی تعلیم دینے کے لیے روس نے ستمبر ۱۹۵۴ء میں ایک نئے تعلیمی منصوبے پر عمل شروع کیا۔ اس تاریخ سے نئے ٹیکنیکل مدرسے جاری کیے گئے۔ یہ مدرسے دسویں پاس لڑکوں اور لڑکیوں کو صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم دے کر انہیں اونچے ٹیکنیکل آسامیاں پر کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ ٹیکنیکل سکولوں کی نگرانی بھی "محفوظ محنت" کی نظامت اعلیٰ کے سپرد ہے۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان ثانوی تعلیم جس تیزی سے پھیلی اور اس سے جو نتائج پیدا ہوئے ٹیکنیکل مدرسے ان کی پیداوار ہے۔ ملک میں جو اعلیٰ ٹیکنیکل ادارے موجود تھے وہ ثانوی مدرسوں کی ساری پیداوار کو جذب نہیں کر سکتے تھے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ادارے صرف کوئی ۳۰ فی صد دسویں پاس طلبہ کو داخل کر سکتے تھے۔ باقی ۷۰ فی صد لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں پڑے رہتے اور اس کوشش میں رہتے کہ انہیں کوئی علمی قسم کا کام مل جائے۔ وہ کارخانوں یا کانوں میں محنت مزدوری کا کام اختیار کرنا عار سمجھتے۔ سوویٹ حکومت نے بہت کوشش کی کہ نوجوانوں کے نقطہ نگاہ میں تبدیلی پیدا ہو مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ مثلاً ۱۹۵۳ء میں کوئی ۷۵ ہزار طلبہ اور

ت نے لینن گراڈ کے سکولوں سے دسویں جماعت پاس کی مگر ان میں سے صرف ۵۰ ہم نے کارخانوں اور دکانوں میں ملاز
یار کی۔ چوں کہ دسویں جماعت تک ان نوجوانوں کو کوئی ایسی تربیت نہ ملی تھی جو انھیں معیشت میں جذب کر دے۔ لہٰذا
لہ کیا گیا کہ دسویں پاس کرنے کے بعد انھیں ایک یا دو سال تک ٹیکنیکل تربیت دی جائے۔

ٹیکنیکل سکولوں کے نصاب کے متعلق تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نصاب دس قسم کے ٹیکنیکل ماہر
کرتا ہے اور اس کے مضامین کی کل تعداد ۲۴۹ ہے۔ خصوصی فنی مہارت کے یہ دس میدان مندرجہ ذیل ہیں: -
۱) دھاتوں کا کام (۲) کیمیائی صنعت اور تیلوں کا صاف کرنا (۳) فن تعمیر (۴) لکڑی کا کام، کاغذ اور گودا تیار کرنا
) آبی رسل و رسائل (۶) ریلوے (۷) قوت۔ ریڈیو اور رسل و رسائل (۸) کان کنی (۹) زراعت (۱۰) ادنیٰ قسم کا ٹیکنیکل کام۔

ٹیکنیکل سکول میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار نے دسویں جماعت پاس کی ہو اور اس کی عمر ۱۷ اور ۲۵
ل کے درمیان ہو۔ داخلے کے وقت امیدوار کو نہ صرف تین فوٹوگراف اور دوسری ضروری دستاویزی شہادتیں پیش کرنا
تی ہیں، بلکہ اسے داخلے کا امتحان بھی دینا پڑتا ہے۔ امیدواروں کا انتخاب ایک کمیٹی کرتی ہے۔ جو مدرسے کے
ائرکٹر، اساتذہ، ڈاکٹر اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ٹیکنیکل سکولوں میں تعلیم بالکل مفت ہے
و طلبہ باہر سے پڑھنے آئیں انھیں رہنے کی جگہ بھی مفت ملتی ہے۔ لاوارث بچوں اور دوسری عالمی جنگ میں کام آ
و جانے والے فوجیوں کے بچوں کو نہ صرف خوراک اور کپڑے مفت ملتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ۵ روبل ماہوار وظیفہ بھی
لتا ہے۔

ٹیکنیکل مدرسوں کے بیشتر نصاب ایک سال میں ختم ہو جاتے ہیں۔ چند نصاب ایسے بھی ہیں جن کی میعاد
دو سال کی ہے۔ نصاب میں نہ صرف متعلقہ فن کے بنیادی نظریے شامل ہیں، بلکہ ان کے متعلق عملی کام بھی۔ عملی تربیت
اصل کام انجام دیتے دیتے حاصل کی جاتی ہے۔ طلبہ صنعتی اور برقی اوزاروں، خود چلنے والی مشینوں اور کلوں اور
ان کے طریق کار کے متعلق عملی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں اپنے کام کے متعلق تحریری نوٹ تیار کرنے اور
ضروری اشکال بنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ طلبہ کے روزمرہ کام کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس ریکارڈ اور آخری امتحان
کے نتیجے کی روشنی میں ہر فارغ التحصیل طالب علم کی فنی مہارت کا درجہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اس کی آسامی اور اجرت کا
فیصلہ اسی درجہ بندی کی بنا پر ہوتا ہے۔

ٹیکنیکل سکولوں کو ان کارخانوں اور صنعتی اداروں سے بڑی مدد ملتی ہے جن کے لیے وہ کاریگر تیار کرتے ہیں۔ ان کارخانوں کے ماہر کاریگر ٹیکنیکل مدرسوں کی درخواست پر ان کے طلبہ کو پڑھانے آتے ہیں۔ یہ لوگ عملی تعلیم کے مقابلے میں نظری تعلیم زیادہ آسانی سے دے سکتے ہیں۔ طلبہ ان کارخانوں میں عملی تربیت کے لیے بھی جاتے ہیں۔ اگر مدرسے کی اپنی بھی ورکشاپ نہ ہو تو اس کے طلبہ قریب کی اعلیٰ صنعتی تربیت گاہ میں عملی مشق کے لیے چلے جاتے ہیں۔

جو صنعتی مدرسے پرائمری پاس طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں ان کا بڑا مقصد اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان کے مقابلے میں ٹیکنیکل مدرسوں کا نصاب بذات خود کفایت کرتا ہے۔ اس نصاب کا مقصد ایسے نوجوانوں کو صنعت و حرفت کے لیے تیار کرنا ہے جن کے لیے اعلیٰ صنعتی اداروں میں کوئی جگہ نہیں۔ جو طلبہ ٹیکنیکل مدرسے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کریں انھیں یہ اجازت مل جاتی ہے کہ شبینہ جماعتوں میں داخل ہو کر یا خط و کتابتی نصاب پورا کر کے اعلیٰ صنعتی نصاب تیار کریں۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے انھیں داخلے کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔

۴ جولائی ۱۹۵۵ء کو روسی وزیر اعظم مارشل بلگانن نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ روسی معیشت کو اس وقت کم اجرت کے انجینیروں اور ادنیٰ فنی ماہروں کی شدید ضرورت ہے ٹیکنیکل مدرسے یہ ملکی ضرورت بہت اچھی طرح پوری کر رہے ہیں۔ فنی ماہروں اور ٹیکنیکل کاریگروں کی مانگ جس میں جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اسے دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ ٹیکنیکل مدرسے اور ترقی کریں گے اور روسی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کریں گے۔

دوران ملازمت صنعتی تعلیم

سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سابق ملازموں یا نئے ملازموں کو مزید صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چناں چہ بیشتر وزارتیں نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے عملی نصاب پیش کرتی ہیں۔ ان نصابوں کی لمبائی تین ماہ سے لے کر دو سال تک ہے۔ اسی طرح روسی کارخانے اور معاشی ادارے اپنے ملازموں کی تربیت اور دوبارہ تربیت کے لیے مختلف النوع نصابوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس تربیت کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:-

کم از کم انفرادی تربیت:- جو لوگ کسی صنعتی ادارے میں ملازمت اختیار کریں۔ انفرادی تربیت ان کو

صنعتی تعلیم کی طرف پہلا قدم خیال کیا جاتا ہے۔ نئے بھرتی ہونے والے نوجوان کو ایک فورمین کے حوالے کیا جاتا ہے جو اسے مختلف مشینوں پر کام کرنا سکھاتا ہے۔ جب وہ اس بات کا اندازہ کر لیتا ہے کہ نیا آدمی کونسا کام زیادہ سے زیادہ قابلیت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے تو یہ کام اس کے ذمے لگا دیا جاتا ہے بعض اوقات بہت سے نئے ملازموں کو ایک ساتھ اس قسم کی ابتدائی تربیت دے دی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں روسی حکومت نے مختلف صنعتوں کے لیے کم از کم ٹیکنیکل قابلیت کے معیار مقرر کر کے ان کے لیے درسی کتابیں شائع کر دی تھیں۔ یہ کتابیں تین سے چھ ماہ کے عرصے میں ختم کی جا سکتی ہیں۔ یہ نصاب روسی صنعت کا لازمی جزو بن چکے ہیں۔ نئے بھرتی ہونے والے تمام مزدوروں کو یہ نصاب ختم کرنا پڑتا ہے۔ نصاب کا مقصد ہر مزدور کو اپنے متعلقہ پیشے کے سائنسی اصولوں اور متعلقہ مشینوں کے اصول کار سے آگاہ کرنا ہے۔ نصاب کے خاتمے پر امتحان ہوتا ہے۔ اور ترقی کا انحصار اس امتحان کے نتائج پر ہوتا ہے۔ کارخانے کے جو ملازم ان نئے مزدوروں کو تعلیم دیتے ہیں انھیں حکومت کی مقرر کردہ شرحوں پر معاوضہ ملتا ہے۔ یہ معاوضہ ان کی اپنی اجرت کے علاوہ ہوتا ہے۔

اعلیٰ ٹیکنیکل نصاب

کارخانے کے جو نگران یا فورمین اپنے کام میں غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیں ان کے لیے کارخانے میں ہی اعلیٰ تر ٹیکنیکل تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ تربیت اوقات کار کے بعد دی جاتی ہے۔ اس قسم کے نصابوں کی لمبائی مختلف ہے۔ عام طور پر اس کی لمبائی دو سے تین سال تک ہے۔ اس عرصے میں تربیت پانے والے لوگ اپنے کام کے کسی مخصوص پہلو کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے سابقہ ذہنی پس منظر کی روشنی میں اس کام کو بہتر طور پر انجام دینے کے ڈھنگ سوچتے ہیں۔ نصاب کے خاتمے پر طالب علم کو کوئی ایک تحقیقی منصوبہ مکمل کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایسا منصوبہ جو کارخانے کے لیے قیمتی ثابت ہو۔ مثال کے طور پر رسل و رسائل کے میدان میں تحقیقی منصوبے کا موضوع ہو سکتا ہے: "خود بخود کام کرنے والے ٹیلی فون سٹیشن کا نقشہ کیا ہو جسے دس ہزار نمبروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

شاخانو وائٹ سکول:- صنعتی تربیت کا ایک ذریعہ شاخانو وائٹ گروہ کا رکن بن جانا ہے

اس روکینیت کا مطلب یہ ہے کہ کاریگر اپنے کام میں غیر معمولی مہارت اور قابلیت پیدا کرنے کا عہد کر لیتا ہے اور اس دھن میں نئے نئے طریقے آزمانے لگتا ہے۔ تاآں کہ وہ ایسی ترکیبیں نکال لیتا ہے جس سے کام زیادہ جلدی اور پیداوار زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے۔

لیکچر اور سینما:۔ مزدوروں کی جماعتوں کو ان کی مخصوص صنعت کے نظری اصول سمجھانے کے لیے لیکچروں کے سلسلے جاری کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ٹیلی فون کی صنعت میں لیکچروں کا موضوع ہو سکتا ہے۔ "نظام ٹیلی فون میں مستقل مقناطیس کا مقام" یا برقی عریاں کاری اور اس کے اثرات یا ٹیلی فون پیغام کو نشر کرنے کے طریق"

لیکچروں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مزدور اپنے کام کے سائنسی اصول بہتر طریق پر سمجھ جائیں۔ اپنے کام کے دوران میں انھیں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کا گہرا فہم پیدا کر لیں۔ اور انھیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ وہ قومی معیشت میں کس قدر اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکچروں کی ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ مزدوروں کو تازہ ترین سائنسی انکشافات سے کسی حد تک آگاہ رکھا جائے۔

ٹیکنیکل ماہروں اور انجینیروں کے لیے سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ انھیں تازہ سائنسی انکشافات اور تکنیکوں سے آگاہ کیا جائے۔ اور انھیں نئے طریقہ ہائے کار دریافت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

دفتری تربیت :۔ روسی ثانوی مدرسے کی تعلیم زیادہ تر علمی قسم کی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ثانوی مدرسوں کے کم و بیش ۶۰ فی صد طلبہ اور طالبات کوئی ایک کاروباری مضمون ضرور لیتے ہیں مثلاً ٹائپ رائٹنگ۔ شارٹ ہینڈ وغیرہ۔ روسی ثانوی نصاب میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا روسی کاروباری اداروں کو کاروباری مضامین کی تربیت خود دینی پڑتی ہے۔ ایسی تربیت ملازمت سے پہلے بھی دی جاتی ہے اور بعد میں ترقی حاصل کرنے کے وقت بھی۔

حرفِ آخر

روس دورِ حاضر کا وہ ملک ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں اپنی پسماندہ زرعی معیشت کو

جدید صنعتی شکل دی ہے۔ اس عظیم الشان کام کو پورا کرنے کے لیے جن نوجوانوں سے خدمت لی گئی ہے۔ ان کی غالب اکثریت دیہی علاقوں سے آئی ہے۔ قدرتی طور پر یہ نوجوان اپنے ساتھ کوئی صنعتی روایات نہیں لاسکتے روسی رہنماؤں نے صنعتی روایات کی کمی کو تربیت اور دوبارہ تربیت کے طریق سے پورا کیا ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ روس کی صنعتی ترقی کا مدار فنی اور ٹیکنیکل ماہروں کی دستیابی پر رہا ہے۔ روس کے فنی رسالے آج بھی ماہروں کی کمی کے شاکی ہیں۔ قومی معیشت میں جن صنعتوں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے مثلاً ہوا بازی وغیرہ ان کو اب کافی مقدار میں انجینئر اور فنی ماہر ملنے لگے ہیں، مگر ہلکی صنعتوں مثلاً کپڑے کے کارخانوں وغیرہ کو ابھی فنی ماہر کافی تعداد میں نہیں مل رہے۔

روسی ذرائع سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ ٹیکنیکل ماہروں اور انجینئروں کو بھی اکثر تجدیدی نصابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاکہ یہ لوگ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ روسی صنعتی درسگاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ نہ صرف چھوٹی چھوٹی تفصیلوں سے پُر ہے بلکہ اس کا آغاز نہایت ادنیٰ سطح سے ہوتا ہے۔ یہ باتیں اس امر کی شہادت ہیں کہ تعلیم پانے والے طلبہ اپنے ساتھ کوئی صنعتی پس منظر لے کر نہیں آتے

مسائل حل کرنے کی تکنیک

محمد عبد العزیز مسلسل نمبر ۲

عمومی طریقہ

مسائل حل کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک طریقہ معمولی جس میں ذہانت کا اتنا دخل نہیں، دوسرا طریقہ عقلی اور استدلالی۔ اول الذکر طریقے میں مسئلے کے مالۂ وما علیہ پر غور و خوض کرنے کی بجائے اٹکل سے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں کوشش کرنے والا اپنے ذہن سے کم کام لیتا ہے، قرائن سے زیادہ لیکن اس میں کسی کامیاب نتیجے پر پہنچنا یقینی نہیں ہوتا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو سکتا ہے اور ناکام بھی۔ غیر ذی شعور کے لیے یہ طریقہ مستحسن ہے۔ لیکن ذی شعور کا اس ابتدائی طریق فکر سے کام لینا مناسب نہیں انسانی فکر اس وقت تک ارتقا کی سینکڑوں منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس لیے ان طریقوں کا استعمال جو دس ہزار برس یا اس سے قبل ہمارے بزرگوں نے اس دنیا کو اور جو کچھ اس دنیا میں ہے، اس کے سمجھنے کے لیے استعمال کیے تھے، غیر ضروری ہیں۔

منطقی طریقہ

دوسرا طریقہ عقلی اور استدلالی ہے جو زیادہ موزوں اور ارتقائے فکر کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ یہ طریقہ سعی و خطا کے دور از کار طریقہ سے بہتر اور صحیح ہے۔ اس میں طلبہ بالعموم مسائل کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ اس کے ایک ایک پہلو کی وضاحت ہو جائے، اور پھر اسے اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ غلطی کا احتمال باقی نہ رہے۔ ایسے مسائل کے حل میں تخیلی فکر قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن کسی مسئلے کی ماہیت کی تفہیم اور تجزیے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک استخراجی ———— اور دوسرا استقرائی۔

فکر کے دو عملی پہلو

اس موضوع پر مفصل بحث ہو چکی ہے کہ فکر کے لیے کسی محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محرک نہ ہو تو فکر کا

جلوہ معاملات بیان ممکن نہیں۔ یہ مرکب بالعموم مقرون ہوتے ہیں۔ لیکن سرعت فکر کی مفکر کو بہت جلد مقرون سے مجرد کی طرف لے جاتی ہے۔ مقرون سے مجرد کی طرف جانا۔ مثالوں سے اصول مرتب کرنا استقرائی طریقہ کہلاتا ہے۔ مثلاً زبان کے سبق میں ہم پہلے بچوں کو مختلف چیزوں سے روشناس کرتے ہیں۔ یہ کیا ہے میز ہے۔ یہ کیا ہے کرسی ہے یہ کیا ہے کتاب ہے۔ اسی طرح لوگوں کے نام اور جگہوں کے نام بتاتے ہیں اور پھر یہ کلیہ مرتب کرتے ہیں کہ کسی شخص، جگہ، یا چیز کو اسم کہتے ہیں۔

دوسرا طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں مقرون سے مجرد کی بجائے مجرد سے مقرون کی طرف جاتے ہیں۔ استقرائی طریقے میں ایک ہی قسم کی مختلف چیزوں کے مطالعہ سے ایک نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ استخراجی طرز فکر میں مرتب کلیوں کے پیش نظر مماثل حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ قوموں کی سماجی اور سیاسی زندگی۔ اقتصادی خوش حالی کے تابع ہوتی ہے تو اس کے لیے مختلف قوموں کی سماجی زندگی سیاسی تفوق اور اقتصادی خوش حالی کا جائزہ لینا ہوگا۔ اگر متعدد مثالوں سے یہی نتیجہ مرتب ہو تو ہمیں اس کلیے کے تسلیم کرنے میں انکار نہ ہوگا۔

مسائل حل کرنے میں یہ دونوں طریق فکر مستعمل ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سوچنے والا مقرون مثالوں سے اپنا مطالعہ شروع کر کے مجرد اصولوں پر آجائے اور پھر اپنے وضع کردہ کلیے کی صحت کے لیے مقرون مثالوں سے اس کا جائزہ لے۔ اس طرح گویا دونوں کا ملا جلا استعمال کسی مسئلے کی منطقی اور استدلالی توضیح کے لیے مناسب ہوتا ہے۔

بحیثیت مدرس تدریس کے وقت ہم دونوں طریقوں کے استعمال کے مجاز ہیں۔ دونوں کو علاحدہ علاحدہ یا انفرادی طور پر جیسی ضرورت ہو۔ لیکن ایسے بے شمار موقعے آتے ہیں جہاں دونوں کا علاحدہ علاحدہ استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جن میں صرف استخراجی طریقہ ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسے جن میں ہم استقرائی طریقے کے محتاج ہوتے ہیں۔

اس ضرورت کے پیش نظر یہاں دونوں طریقوں کو قدرے وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے

استخراجی طریقہ | کسی مسئلے کی تفہیم کے لیے ذہن بالعموم مقرون مثالوں سے اثبات یا نفی میں ایک کلیہ

مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اگر یہ کوشش بے سوچی سمجھی اور غیر استدلالی ہو گی تو نتائج کا صحیح ہونا یقینی نہیں۔ استخراجی طریقے سے مسائل کے تجزیے کے لیے ترتیب وار اقدام کی ضرورت ہے۔

مسئلے کا عرفان

اس ضمن میں پہلا اقدام خود مسئلے کا عرفان ہے۔ اگر مسئلے کی ماہیت کا صحیح علم نہ ہو تو اس کے حل کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک بات ایک انداز میں کہی جائے تو اس کا مفہوم کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہی بات الفاظ کے ہیر پھیر سے کچھ کی کچھ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فکری لحاظ سے اقدام ہی غلط ہو جائے اور اس سے جو نتیجہ مرتب ہو وہ پھر ایک اختلافیہ مسئلہ بن جائے جو حل ہونے کی بجائے اس طرح الجھ جائے کہ اس کی منطقی توضیحات بے معنی ہو جائیں۔ اس قسم کے احتمالات سے بچنے کے لیے حل تلاش کرنے سے پہلے مسئلے کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ بالفرض ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہو کہ جنگ کے بعد اقتصادی بدحالی ناگزیر ہے تو سب سے پہلے تو مسئلے کی تفہیم کی ضرورت ہے کہ کہنے والے کا مدعا کیا ہے۔ جب مدعا متعین ہو جائے اس وقت صحیح حل تلاش کرنے کے لیے دوسرے اقدام کی ضرورت ہو گی

تجرباتی مفروضے

مسئلہ مذکور دراصل ایک کلیہ ہے۔ یہ کلیہ صحیح ہے یا غلط۔ اس کے اثبات یا نفی کے لیے اسے معروف مثالوں کی کسوٹی پر پرکھنا ہو گا۔ جنگ کے بعد اقتصادی بدحالی ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے لڑائی میں ایک قوم حصول کامرانی کے لیے مال و متاع، پیر و جوان، مرد و زن۔ غرض ہر چیز کی بازی لگا دیتی ہے۔ ناکامی یا کامیابی دونوں صورتوں میں معاشی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ہو جانا یقینی ہے۔ اب اس کلیے کو ثابت کرنے کے لیے چند مثالوں کی ضرورت ہو گی۔ مختلف لڑائیوں کے عواقب کا تجزیہ کرنا ہو گا۔ آیا فی الواقع اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگ اقتصادی بدحالی کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر مختلف مثالوں سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے تو اس کلیے کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہو گا۔

تجرباتی مفروضے کی تعیین

جب مختلف مفروضوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جائے کہ مسئلے کے حل سے ان کا براہ راست یا با

تعلق ہے اور ان کی مدد سے مسئلے کے حل کے امکان زیادہ روشن ہیں تو پھر یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان میں سے کون سا مفروضہ مقصد کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ جو مفروضہ مقصد کے قریب قریب ہوگا۔ اسے اپنی فکر کی اساس بنا کر آگے بڑھنا چاہیے۔

پڑتال

چوتھا اقدام اور ایک اہم اقدام مفروضوں کی جانچ پڑتال ہے۔ آیا جو مواد مسئلے کے حل کرنے کے سلسلے میں جمع کیا گیا ہے۔ یا جو مفروضے مرتب کیے گئے ہیں وہ اپنی ترتیب و تنظیم کے لحاظ سے صحیح اور قرین مطلب ہیں، یا ان سے مقصد برآری نہیں ہو سکتی۔ پڑتال کا کام ذرا مشکل ہوتا ہے۔ ایک ایک بات کے حسن و قبح کا دیکھنا۔ ہر پہلو سے ان کا تجزیہ کرنا، اس کے صحیح یا غلط ہونے کا جائزہ لینا اس تجزیے کے بعد جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کے علاوہ اس کا نتیجہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بات منہ سے نکالی جائے مثلاً جنگ اور اقتصادی بدحالی کے کلیے کی تعیین کے لیے ضروری ہے کہ دو تین لڑائیوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد جو اقتصادی حالت اس ملک کی ہوئی ہو، اس کا احاطہ کیا جائے۔ اس کے بعد اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔

اس صدی میں دو عالمگیر لڑائیاں ہوئیں۔ پہلی لڑائی اتنی عالمگیر نہ تھی جتنی دوسری۔ لیکن اگر دونوں جنگوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کلیہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ پہلی عالمگیر لڑائی میں ترکی جنگ میں شریک ہوا۔ اگرچہ اس وقت دول یورپ اسے یورپ کا مرد بیمار کہتے تھے۔ لیکن ایک سامراجی ساکھ تھی جو اس وقت قائم تھی۔ جنگ نے نہ صرف یہ کہ اس سامراجی ساکھ کو پارہ پارہ کر دیا، بلکہ اقتصادی لحاظ سے اتنا کمزور کر دیا کہ اس وقت ترکیہ کی حالت قابل دید نہیں سامان بردار لشکر لگی ہے۔ دوسری عالمگیر لڑائی میں برطانیہ اور جرمنی براہ راست جنگ آزما ہوئے، رفتہ رفتہ فرانس۔ یو۔ ایس۔ اے اور روس بھی اس کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ جرمنی مفتوح ہوا اور تباہ ہو گیا۔ فرانس بھی پائے مردی ہمسایہ کی بدولت فتوحات کی بہشت میں جیسا کبھی ٹیکتا ہوا پہنچ گیا۔ لیکن اس کی اقتصادی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ اگر آج امریکہ امداد دینا بند کر دے تو نہ صرف یہ کہ الجزائر میں انسانی خون کی ارزانی ختم ہو جائے۔ بلکہ فرانس خود اپنی ضروریات کی کفالت نہ کر سکے۔ روس چونکہ

بہت بڑا ملک ہے۔ اس لیے جنگ نے جو دھکا پہنچایا اور جو بدحالی پیدا ہوئی اس سے نکلنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ یو۔ ایس۔ اے اس سلسلے میں ذرا زیادہ خوش قسمت ہے۔ ایک تو یہ کہ جنگ کی تباہ کاریاں نیویارک یا واشنگٹن تک نہیں پہنچیں وہ ایشیا، یورپ اور افریقہ ہی میں محدود رہیں، اس لیے وہ بھی اس دھکے کو سنبھال لے گیا۔ برطانیہ جو جنگ کی صف اول میں تھا، مابعد جنگ ایسی مالی مشکلات میں پھنس گیا کہ اسے طوعاً و کرہاً امریکہ کی سیاسی اور اقتصادی سیادت کے آگے جھک جانا پڑا۔ رہا سہا بھرم حادثہ سویز نے کھو دیا۔

ان تین چار مثالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جنگ کے بعد اقتصادی بدحالی ناگزیر ہے۔ اس کلیے کو اس طرح پرانی مثالوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح طریق کار کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق تکنیک کی صحت اور مفروضوں اور نتیجوں کے جواز کا بڑی احتیاط سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی پڑتال کے بعد انھیں تسلیم یا ان سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

استقرائی طریقہ

مدرسوں میں استقرائی طریقہ سب سے زیادہ استعمال میں آتا ہے۔ بچہ مقرون مثالوں سے مجرد اصول اخذ کرتا ہے۔ مجرد اصولوں کو مقرون مثالوں سے پرکھنا بعد کی بات ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب طلبہ سوچنا سمجھنا اور تخیلی فکر کو کام میں لانا سیکھ جائیں اور یہ ایک دو دن کا کام نہیں، اس میں مسلسل اور مستقل ریاضت کی ضرورت ہے۔

مسئلے کا عنوان

استخراجی طریقے کی طرح، استقرائی طریقے میں بھی مدرس کے لیے مسئلے کا عنوان ضروری ہے۔ استقرائی طریقے میں دوسرا اقدام مواد کی فراہمی ہے۔ مثلاً اگر یہ پڑھانا ہو کہ پاکستان کے اقتصادی بحران کا سبب کیا ہے تو اس کلیے کی تعیین کے لیے پاکستان کے سیاسی اور سماجی نظام کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ لوگوں کے طرز معیشت شہری، اور دیہاتی آبادی کی تقسیم، پیشوں کی نوعیت۔ زرعی نظام۔ کارخانوں کی کمی۔ لوگوں کا معیار زندگی۔ اور اسی قسم کے دوسرے عوامل کا واضح اور تنقیدی مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس تنقید و تنقیح کے بعد جو خاکہ مرتب ہوگا، اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکے گا کہ جاگیرداری کی وجہ سے ملک میں اقتصادی بحران ہے یا نہیں ہے۔

مواد کا تجزیہ

تیسرا اقدام جمع شدہ مواد کا تجزیہ ہے۔ زیر بحث مسئلے کے حل کرنے میں کس کی ضرورت ہے اور کون غیر ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مواد کی ہیئت ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں۔ احتیاطی موازنے اور تلخیص کی اہمیت پر جتنا زور دیا جائے کم ہے۔ بالخصوص نو عمر طلبہ کے لیے یہ طریق کار اور ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ ان میں اس طرح ذوق تحقیق پیدا ہو جائے گا، اور وہ محنت و کاوش کے ساتھ حقیقت کی تلاش میں لگے رہیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس سے غلطی کا امکان باقی نہیں رہے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ طریق کار کس وقت شروع کیا جائے۔ آیا جب طلبہ کے سامنے معلومات کا سارا ذخیرہ جمع ہو جائے یا ساتھ ہی ساتھ کہ ایک بات معلوم ہوئی۔ اور انھوں نے اس کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل اس کے لیے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ طلبہ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ذہن کے مختلف خانوں میں ایک ایک بات کو ایک خاص انداز میں محفوظ رکھ لیں گے۔ گویا ایک طریق جاری رہے۔ طلبہ حسب ضرورت جمع شدہ مواد پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں اور یہ سلسلہ آغاز سے انجام تک جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق آخری بات شروع یا درمیان میں نہیں کہی جا سکتی اس کے لیے اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا، جب مواد کا انبار سامنے ہو اور اس کے ایک ایک پہلو کا تجزیہ منطقی اور استدلالی لحاظ سے ہو چکا ہو۔ اس لیے مواد جمع کرتے وقت تیز بینی کی ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ اہم اور غیر اہم۔ ضروری اور غیر ضروری۔ مفید اور غیر مفید میں تمیز کر سکیں۔

وضع کلیہ

یہ ذہنی کاوش اب طلبہ کو اس مرحلے پر پہنچا دیتی ہے کہ وہ جمع شدہ مواد کی ترتیب کا کام شروع کر دیں یہاں یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ اول الذکر اقدام میں بھی ترتیب و تنظیم کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ اور پھر یہ کہ ایک ذہین طالب علم اپنی فکری رو میں استخراجی اور استقرائی اقدامات کے علاحدہ علاحدہ درجے قائم نہ کر سکے بلکہ لمحوں میں ان مدارج سے گزرتا ہوا، اپنے فکر عمیق کی بدولت آخری نتیجے پر پہنچ جائے۔ یہ دونوں اعتراضات درست ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اول الذکر اور موخر الذکر اقدام میں فرق ضرور ہے۔ مواد کے تجزیے

کے وقت اگرچہ ذہن آخری نتیجے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر چیزیں بڑا کچھ ایسی گڈمڈ ہوتی ہیں کہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے مزید چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے۔

کلیہ وضع کرنے کے دو پہلو ہوتے ہیں اول یہ کہ مواد کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس کے اہم پہلو اور اس کی متعلقہ کڑیاں نمایاں ہو جائیں۔ دوم یہ کہ اس مواد سے اور ان مفروضات سے آخری نتیجہ نکال لیا جائے۔

جدید تدریس میں استقرائی طریقے کا رواج ہربارٹ کی کاوشوں کا رہین منت ہے۔ ہربارٹ کے وقت سے لے کر اس وقت تک طریق تدریس کے سیکڑوں تجربے ہو چکے ہیں۔ بعض حالات میں پرانے اصولوں کو یک قلم ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں قدیم ڈھانچے پر جدید عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ نفسیات کے ماہروں نے ان نئے پرانے خاکوں میں کچھ اور رنگ بھرا۔ لیکن ان سارے تجربوں کا مقصد تعلیم میں آسانیاں پیدا کرنا رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ کوششیں جاری ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سبق کی تیاری میں ہربارٹ کے رسمی اقدام اپنی ترمیم شدہ شکل میں آج بھی اتنے ہی ضروری ہیں۔

تیاری

تدریس میں ہربارٹ کا پہلا اقدام تیاری ہے جسے جدید نفسیات کی زبان میں تحریک کار کہتے ہیں۔ یہ اقدام نفسیاتی لحاظ سے طریق تعلم میں نہایت ضروری ہے۔ اگر طلبہ میں خود سیکھنے کی تحریک نہ ہوگی تو جو کچھ پڑھایا جائے گا اس سے کسی فائدے کی توقع رکھنا بے سود ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ اقدام تمام تر نفسیاتی ہے۔

استحضار

یہ اقدام دراصل استقرائی طریق تدریس میں مواد کی فراہمی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں مدرس طلبہ کے سامنے موضوع زیر تدریس کے متعلق ضروری مواد فراہم کرتا ہے۔ اس اقدام کی کامیابی کا انحصار تحریک کار پر منحصر ہے اگر مدرس طلبہ کے جذبۂ کار کو متعش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو اب جو کچھ وہ ان کے سامنے پیش کرے گا اس کی معنوی حیثیت واضح ہو جائے گی۔ مدرس اپنے کلیے کی تشریح کے لیے مثالیں دیتا ہے۔ واقعات بیان کرتا ہے اور طلبہ کے تجربوں اور مشاہدوں کے پیش نظر ان کی امداد سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طریق میں ایک نقص یہ ہے کہ طلبہ کی بجائے مدرس کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ لیکن اسے جدید تعلیمی تقاضوں کے

مطابق استعمال کیا جائے تو اس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

موازنہ

ہربارٹ کا تیسرا اقدام مواد کا تجزیہ اور واقعات کے ارتباط میں اس کی تنظیم ہے۔ ہربارٹ کی اسکیم میں طلبہ کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ مدرس نقد و تبصرہ کر کے مسئلے کی توضیح کرتا ہے۔ اور طلبہ مدرس کی پیروی کرتے ہیں۔ مسائلی طریقے میں جب مسئلہ استقرائی طریقے سے حل کیا جاتا ہے تو اس میں متعلم کو پورا پورا حق ہوتا ہے کہ وہ خود ناقد بن کر اس کا صحیح حل تلاش کرے۔ مدرس اس کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن مسئلہ حل کرنا اس کا کام نہیں

کلیہ

ہربارٹ کا چوتھا اقدام کلیے کی ترتیب ہے۔ سبق پڑھانے کے بعد طلبہ کو یہ بتانا کہ جو کچھ پڑھایا گیا ہے اس کا مقصد کیا تھا یا ان سے کونسا کلیہ مرتب ہوتا ہے اور کون سا اصول وضع ہوتا ہے۔ سبق کے اس حصے میں دراصل سارے سبق کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ ہربارٹ کے بعد اس کے مرتب خطوط پر چلنے والے ماہرین نے ان اقدامات میں پانچویں اقدام کا اضافہ کیا ہے۔ کلیے کی ترتیب ذہنی سرگرمیوں کی آخری منزل نہیں ہوتی۔ اس کلیے کا مسائلی حالات میں استعمال بھی اتنا ہی اہم ہے۔ کلیہ بجائے خود بے معنی ہے اس کا استعمال ہی اس کی صحت اور صداقت کا ضامن ہے۔ یہ اقدام اگرچہ استقرائی ہے۔ لیکن ہر استقرائی تجزیہ کے بعد اس کا استعمال مفید ہوتا ہے۔ اس کی ایک علاحدہ تعلیمی حیثیت ہے۔

مسائلی طریقے کے فوائد

ہمارے مدرسوں میں مسائلی طریقے کا استعمال کم و بیش مفقود ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مدرسین کی ایک بڑی تعداد تجربوں کو اس لیے ٹال دیتی ہے کہ یہ تجربہ مغرب میں کیا گیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اس کا اطلاق ممکن نہیں اور اگر وہ بادل ناخواستہ یہ تسلیم بھی کر لیں کہ اس ملک میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو اقتصادی مشکلات اور انتظامی عزمیات راہ میں خارج ہو جاتی ہیں۔ اس میں سے بعض اعتراضات قدرت ہیں لیکن بعض اہل مفصل اس مفروضے پر کہ مغرب کا یہ تجربہ ہمارے مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ کام سے

جی چرانے کا بہانہ ہے۔ مغرب کے سامان تعیش، رقص و سرود، لباس، طرز معاشرت، جو اس مخصوص ماحول کی پیداوار ہیں اور جن کا ان کی تاریخی اور سماجی زندگی سے براہ راست تعلق ہے، یہ کہ ہمیں راس آسکتا ہیں اور اسے ہم ترقی کی منہاج سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے کام و دہن اور نفس دونوں کو لذت میسر آتی ہے۔ لیکن مغرب کے اس آمد کو اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی جس کا تعلق ہمت و کاوش سے ہے۔ جدید طریقہائے تدریس سے گریز اسی خلقی کم کوشی کی پیداوار ہے۔

اس وقت جو طریق تدریس ہمارے مدرسوں میں رائج ہے وہ بھی مغرب کی نقل ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مغرب نے اس سلسلے میں جو مزید تجربے کیے ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر کسی تجربے کا نام لیں یا کسی تجربے کا اقدام کریں تو اس قسم کی مضحکہ خیز باتیں سننے میں آتی ہیں کہ بعض اوقات یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہم پڑھے لکھے لوگوں کی مجلس میں تعلیم و تعلم کا کام کر رہے ہیں یا جاہلوں کے اکھاڑے میں۔ لیکن اس سے مایوس ہو کر تجربہ کرنے سے گریز کرنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے۔

مسائلی طریقے کا بھی میری دانست میں اب تک کوئی تجربہ نہیں کیا گیا۔ زیر تربیت مدرس اس کا نظری مطالعہ تو کر لیتے ہیں لیکن اس کی عملی افادیت کی تحسین سے معذور ہوتے ہیں۔ یہاں اس کے چند فوائد کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ شاید بعض صاحب نظر اس سے خود بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور طلبہ کو بھی متمتع ہونے کا موقع دیں۔

سبق میں دل چسپی

کسی سبق کی کامیابی کا انحصار طلبہ کی دل چسپی ہے۔ اگر طلبہ سبق میں دل چسپی نہیں لیتے تو مدرس کی ساری علمیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر طلبہ کو خود اس میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے تو نفسیاتی لحاظ سے خود کاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن مدرس کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے باوجود اس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کوئی مسئلہ طلبہ کے لیے مسئلہ نہیں ہوتا جب تک اسے اس میں کوئی حیرت انگیز انجام نظر نہ آئے اور وہ اسے قبول نہ کرے۔ تحریک کا اس اعتبار سے بہت ہی مشکل ہوتی ہے جس میں مدرس کی چابکدستی ہی اس کے کام آسکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد طلبہ کو از سر نو ابھارنے کی ضرورت پیش آئے لیکن اگر مسئلہ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ان کی دل چسپی آخر تک قائم رہ جائے تو یہ مدرس کی

بہت بڑی کامیابی ہے ۔

لچک

مسائلی طریقہ اصولی مجلس میں اسیر نہیں، اس میں خاصی لچک ہے اور تعلیمی ضروریات کے مطابق اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ مسائلی طریقہ میں حل کی اساس تخیلی فکر کے تابع استخراجی یا استقرائی طریق سے کی جاتی ہے اور پڑھاتے وقت طلبہ مختلف مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں جنھیں ان کی ذہنی اپج ہی حل کر سکتی ہے۔ اس صورت میں مسائلی طریقے کو دوسرے طریقوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ ایسے مسائلی طریقہ نہ کہیں منصوبی یا عملی طریقے میں ساز و سامان اور تجربہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن چوں کہ مسائل کے حل کا بالعموم انسانی فکر سے تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے استعمال سے مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے اور تجربہ گاہ اور ساز و سامان کے مزید تردد کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ساز و سامان اور تجربہ گاہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، ان کا ہونا فکر میں ایک نئی تحریک پیدا کر سکتا ہے اور ان کی مدد سے حل تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہو سکتی ہے۔

تربیت فکر

فکر اور بالخصوص تخیلی فکر کی تربیت کا اس سے زیادہ اور کوئی موثر طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ترتیب صرف منطقی اور استدلالی ہی نہیں نفسیاتی بھی ہے جس میں طلبہ کے ذہنوں کے پیش نظر کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا ہے اور پھر اس کی ترتیب میں منطقی استدلال تفحص سے کام لیا جاتا ہے استخراجی یا استقرائی یا دونوں کا امتزاج، مسائل کے حل کا یہ ایک فطری طریقہ ہے۔ اس سے صحیح سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور ذہن کو ادھر ادھر بھٹکنے کا کم موقع ملتا ہے ۔

طویل واحدے

جدید تدریس میں ان دنوں مضامین کے الگ الگ واحدوں سے اغماض کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کی بجائے نصاب کو ایک مربوط کل بنانے کا نظریہ ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے۔ مسائلی طریقہ اس سلسلہ میں مدرس کی مزید رہنمائی کرتا ہے۔ اگر وحدتی طریقہ (یونٹ میتھڈ) کا رواج ہمارے مدرسوں میں بھی

ہو جائے تو یہ وحدت ایک ہفتہ، دو ہفتے یا تین چار ہفتوں تک جا سکتی ہے، اور اس مدت میں طلبہ اپنا کام بآسانی مکمل کر سکتے ہیں۔

جولائی ۱۹۶۰ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور محکمہ تعلیم مغربی پاکستان (حلقہ لاہور) کے زیرِ اہتمام مری میں ایک تعلیمی مجلس منعقد ہوئی۔ چوں کہ اس مجلس کے انعقاد میں واشنگٹن اسٹیٹ کالج کا بھی دخل ہے۔ اس لیے ورک شاپ کا نام دیا گیا۔ لیکن محض نام سے اس کے کام کی نوعیت پر اشتباہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس ورک شاپ میں وحدتی طریقہ پر خاصی بحث و تمحیص رہی۔ اس کی رپورٹ پنجاب ایجوکیشنل جرنل میں چھپ چکی ہے اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

منزل کی تعیین

یوں تو تدریس کے مختلف طریقوں میں منزل کا مفقود ہوتا ہے۔ لیکن طلبہ کے لیے منزل کی تعیین نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حالات میں مدرس کے سامنے تو ایک منزل یا مقصد ہو لیکن طلبہ اس سے نابلد ہوں۔ جدید تدریسی تجربات کی روشنی میں اگر طلبہ منزل آشنا نہ ہوں گے تو ان کی رہنمائی مشکل ہو جائے گی لیکن اگر مسئلہ از خود طلبہ میں کام کی تحریک پیدا کر دیتا ہے تو اس سے فکر کا مقصد متعین ہو جاتا ہے اور پھر فکر اس متعینہ مقصد کے تابع ہو جاتی ہے۔

صحت کار کی تشکیل

تدریس میں بالعموم مدرس اور طلبہ دونوں کے ادھر ادھر بہک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بات میں بات پیدا ہو جاتی ہے اور خدانخواستہ مدرس کا مزاج خالص شاعرانہ ہو تو سبق میں لذت حکایت تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس سے جو اصل مقصد گم ہو گا، اس کی تلافی ممکن نہیں۔ لیکن اگر مدرس خود تخیلی فکر کے تابع ہو جائے اور طلبہ میں بھی ذوقِ فکر پیدا کر دے تو اس سے تعلم کی بہت سی قباحتیں دور ہو جاتی ہیں۔ مدرس کو بہکنے کا کم موقع ملتا ہے اس صورت میں وہ زیادہ اچھے طریقے سے طلبہ کی رہنمائی کر سکے گا۔

مسائلی طریقہ اور مدرس

مسائلی طریقہ کی اس بحث سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس میں مدرس کا کام بہ منزل صفر ہو تا ہو

لیکن حق یہ ہے کہ تدریس کے کسی طریقے میں مدرس خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا۔ ڈالٹن پلان منصوبی طریقہ ان سب میں اگرچہ طلبہ کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے لیکن مدرس ہر جگہ رہنما کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ مسائلی طریقہ میں بھی متعلم ہی کو ساری فکری سرگرمیوں کا مرکز تصور کیا گیا ہے لیکن مدرس کی قیادت سے انکار نہیں کیا گیا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس میں مدرس کا کام اور بڑھ جاتا ہے۔ ایک موضوع پر خوش آئند لہجے میں بحث کرنا اور بات ہے، لیکن طلبہ میں فکر کی گہرائی پیدا کرنا ذرا مشکل ہے۔ اس کے لیے پہلے مدرس کو خود اپنے آپ کو تربیت اور تہذیبی فکر کے جوکھوں میں ڈالنا ہوگا۔ مسائل کے حل میں رہنمائی کا مقصد مطالعہ اور فکر کو تربیت دینا ہوتا ہے۔ یوننگ نے پارکر کے حوالے سے مدرس کی رہنمائی کے چند اصول لکھے ہیں۔ پہلا اصول مسئلے کی توضیح و تشریح میں طلبہ کی اعانت دوسرا اس سے متعلق خیالات کے اعادے۔ ان کے تجزیے اور مفروضوں کے وضع کرنے میں اعانت۔ تیسرا ان کی پڑتال کرنے میں ان کی امداد۔ اس میں غیر متعصب فیصلہ، مشوروں کی تنقید، انتخاب میں ترتیب اور نتائج کی پڑتال شامل ہیں۔ اور چوتھا مواد کی ترتیب و تنظیم میں ان کا ہاتھ بٹانا ہے۔

تعلیم بذریعہ کھیل

ڈاکٹر عبدالرؤف

تعلیم کا بنیادی مقصد متعلم کی شخصیت اور انفرادیت کی نشو و نما کرنا ہے۔ تعلیم کا کوئی جامع اور متوازن نظام بچوں کو درسی تعلیم دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ان میں شگفتگی، حب، اختراعیت، تعاون، قیادت اور ہمدردی کی صلاحیتیں اجاگر کرتا ہے۔ ان اوصاف میں تربیت حاصل کیے بغیر بچے تعلیم کے اصل مفہوم سے کسی صورت بھی مستفید نہیں ہو سکتے۔

ہمارے نظام تعلیم کی بنیادی خامی

ہمارے مروجہ نظام تعلیم کی بنیادی خامی بھی یہی ہے کہ یہ بچوں میں تخلیقی اوصاف کی تربیت میں ناکام رہتا ہے۔ ہمارے طریق تعلیم میں کتاب، رٹائی اور امتحان کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے مدرسے ایسے بچے تیار کرتے ہیں جن کے اعصاب پر کتابیں سوار ہوتی ہیں۔ ان کے ذہن معلومات عامہ اور اعداد و شمار کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی انفرادیت کے اظہار اور تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنے کے مناسب مواقع میسر نہیں آتے۔

چنانچہ ہمارے طلبہ کی اکثریت مدرسہ کی تعلیم سے دلی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ انھیں اپنے اساتذہ کے زبانی جمع خرچ، پڑھائی کے لمبے لمبے پیریڈ اور دلچسپیوں سے یکسر خالی نصاب ایک بارگراں کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔ تعلیم مسلسل بے کیف، مصنوعی اور بور کن ہونے کی وجہ سے طلبہ میں اپنی کتابوں، اساتذہ یا مدرسہ سے متعلق قطعی کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیم ان کی شخصیت اور بصیرت پر کوئی خاطر خواہ اثر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

کھیل کے ذریعہ درس و تدریس

متعدد ماہرین تعلیمات نے مختلف ملکوں میں اسی قسم کی تعلیمی صورت حال پر کافی تحقیق کی ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک ایسا نظام تعلیم جس میں سے عمل، حرکت اور کھیل کود کو بے دخل کر دیا جائے، بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے

بارے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بچے مجسم حرکت اور توانائی ہوتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کھیل کود تفریحوں مشغلوں، کھیلوں وغیرہ میں جی بھر کے شامل ہونے کے مواقع ملتے رہیں۔ اگر مدرسہ ان کی ان جائز خواہشوں کو اچھی طرح سمجھ کر ان کی تشفی کا مناسب اہتمام کرے تو وہ نہ صرف بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحت کی ترویج کا باعث بنتا ہے۔ بلکہ درسی تعلیم کے فرائض کو بھی نہایت خوش گوار اور عمدہ طریقے سے سرانجام دیتا ہے۔

درس و تدریس کے اس نظریہ کو اصطلاحی زبان میں تعلیم بذریعہ کھیل کہتے ہیں۔ تعلیم بذریعہ کھیل کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت کو اس قدر دلچسپ اور فرحت انگیز بنا دیا جائے کہ انہیں درسی تعلیم میں کھیل کود کی طرح آسان اور لطف انگیز مشغلہ دکھائی دے۔ تعلیم بذریعہ کھیل کے ان تمام طریقوں میں کھیل کو بذات خود کوئی علیحدہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اسے بچوں کو کتابوں اور زندگی کی گتھیوں کے سمجھانے کے لیے محض ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

تعلیم بذریعہ کھیل کی اقسام

تعلیم بذریعہ کھیل کود کی چند معروف اقسام مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) مانٹسوری طریقہ (۲) ڈرامائی طریقہ (۳) منصوبی طریقہ (۴) ڈالٹن پلین (۵) انکشافی طریقہ (۶) معاشرتی طریقہ۔

تعلیم بذریعہ کھیل کے ان تمام جدید طریقوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ کھیل ہی کھیل میں بچوں کو تعلیم و تربیت کی پیچیدہ گتھیاں سمجھا دیتے ہیں۔ ساری تعلیم کے دوران میں بچہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے۔ کمرۂ جماعت ایک بوسیدہ قید خانہ نظر آنے کی بجائے کھیل کا ایک خوشگوار میدان سا دکھائی دیتا ہے۔

(۱) **مانٹسوری طریقہ:-** یہ طریقہ مشہور و معروف اطالوی ماہر تعلیمات خاتون ڈاکٹر میریہ مانٹسوری نے ایجاد کیا تھا۔ ڈاکٹر مانٹسوری ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۵۲ء میں وفات پا گئیں۔ آپ کی ساری زندگی بچوں کے لیے بہتر تعلیم و تربیت پر تحقیق اور تجربوں پر بسر ہوئی۔ وفات سے تین سال قبل آپ پاکستان بھی تشریف لائیں اور یہاں کے اساتذہ کو ایک مختصر سے کورس میں اپنے مخصوص طریقہ تعلیم میں تربیت دی۔

کھلونوں کے ذریعہ سے درس و تدریس :- مانٹسوری طریقِ تعلیم کھیل کے ذریعہ درس و تدریس کی ایک مشہور قسم ہے۔ یہ طریق اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ننھے بچوں کو آزادی، خود اختیاری اور تفریحی مشاغل کا ایک خوش گوار ماحول دے کر ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ اس غرض کے لیے بچوں کو کھیلنے کے لیے طرح طرح کے تعلیمی کھلونے دیے جاتے ہیں۔ یہ تعلیمی کھلونے بڑی احتیاط اور خصوصی ہدایات کے ماتحت تیار کیے جاتے ہیں۔ ان دل چسپ تعلیمی کھلونوں کی مدد سے بچے لکھائی پڑھائی اور ابتدائی حساب وغیرہ سیکھنے میں مسرت اور سہولت محسوس کرتے ہیں۔

مانٹسوری کے تعلیمی کھلونے :- مانٹسوری طریقہ تعلیم میں استعمال ہونے والے کھلونے عام کھلونوں سے کہیں زیادہ دل چسپ اور مفید ہوتے ہیں۔ لکڑی کے فریم۔ بلاک۔ کٹے ہوئے حروف تہجی۔ چھڑیاں برش، موتی وغیرہ ان کھلونوں کی چند اقسام ہیں۔ ان کھلونوں سے کھیل کے دوران میں بچوں کو اپنے اعضا کو حرکت میں لانے اور اپنے حواس کو تربیت دینے کے بہت خوش گوار مواقع میسر آتے ہیں۔ ایسے تعلیمی کھلونوں سے کھیل کر لکھائی، پڑھائی اور حساب کے علاوہ بچے بہتر اوصاف۔ عادات و اطوار وغیرہ میں بھی تربیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان میں خود اختیاری۔ توجہ تعاون اور خوش مزاجی کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔

خود اختیاری کی تربیت :- مانٹسوری طریقہ کا بنیادی مقصد بچوں کو خود انتظامی اور خود اختیاری کی تربیت دینا ہے۔ تعلیمی کھلونوں سے کھیل کے دوران میں انھیں ان اوصاف کی نشوونما کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ کھیل کے دوران میں ایک منتظمہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ بچوں کے آزادانہ کھیل کود میں قطعی دخل اندازی نہیں کرتی۔ جب بچوں کو اس کی رہ نمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ خود ہی اس سے مشورہ طلب کرتے ہیں۔

مانٹسوری طریقہ کا جائزہ

مانٹسوری طریقہ تعلیم چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ دنیا کے متعدد تعلیمی اداروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ تاہم اس طریقۂ تعلیم میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔

چند اہم خصوصیات :- مانٹسوری طریقہ کی تین بڑی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :-

(ا) خوش گوار تعلیمی رجحان کی تخلیق

(ب) حواس کی بہتر تربیت

(ج) پسماندہ بچوں کے لیے خصوصی افادیت

مانٹسوری کے تعلیمی کھلونے بچوں کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے اور ہنسی خوشی کام کاج کرنے کی تربیت دے کر مدرسہ اور اساس کے مشاغل سے متعلق ایک خوش گوار رجحان پیدا کر دیتے ہیں۔ بچوں کو تعلیم۔ کتابوں۔ اساتذہ اور مدرسہ سے طبعی لگاؤ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کا خوش گوار تعلیمی ماحول ان کو آئندہ تعلیمی زندگی میں بھی بہت کام آتا ہے۔

حواس کی ابتدائی تربیت کے لیے تو یہ طریقہ بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ ان تعلیمی کھلونوں کے ذریعہ سے بچوں کو رنگ، حجم، وزن، تناسب وغیرہ میں تمیز کی عملی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ یہ عملی تربیت انہیں درسی مضامین سمجھنے اور آئندہ سالوں میں سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے میں بہت آڑے آتی ہے۔

یہ طریقہ پسماندہ بچوں کے لیے خصوصی طور پر کامیاب رہتا ہے۔ ہر مدرسہ کی ہر جماعت میں چند ایک ایسے بچے ضرور ہوتے ہیں جو مجرّد، منطقی، تقریری اور استدلالی طریقوں کے سمجھنے کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے مانٹسوری کے تعلیمی کھلونے اور ان کھلونوں کے ذریعہ سے درسی تعلیم بے انتہا مفید ثابت ہوتی ہے۔

چند بنیادی خامیاں :-

مانٹسوری طریقہ کی چند بنیادی خامیاں مندرجہ ذیل ہیں :-

(ا) محدود اطلاق

(ب) بچوں کی حرکات پر پابندیاں۔

اس طریق تعلیم کا دائرہ اطلاق محدود ہے۔ اسے صرف ننھے بچوں کی تعلیم کے لیے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بڑے بچوں کو کھلونوں کے ذریعہ سے تعلیم دینے کی کوشش کرنا ان کی ذہنی نشو و نما پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

مانٹسوری طریقہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ طریق تعلیم بچوں کو خود اختیاری اور خود

انضباطی کا مکمل ماحول مہیا کرتا ہے۔ کسی حد تک یہ دعویٰ غلط ہے۔ مانٹسوری طریقہ تعلیمی کھلونوں سے کھیلنے کے چند اصول اور طریقے وضع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہدایات کر دی جاتی ہیں کہ بچے ان اصولوں اور طریقوں پر پوری طرح کاربند ہیں۔ ان طریقوں کی پابندی کا تقاضا بچوں کی انفرادی پسند اور ناپسند کے امور کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ بچوں کی حرکات پر اس قسم کی قید و بند بسا اوقات ان کی مناسب نشو و نما کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ طریقہ بچوں کو مانٹسوری کے تعلیمی کھلونوں کے علاوہ کسی اور قسم کے کھلونوں سے کھیلنے کی ممانعت کرتا ہے۔

(۲) ڈرامائی طریقہ

کھیل کے ذریعہ تعلیم کا یہ طریقہ درس و تدریس کو ایک ڈرامہ یا تمثیل کی صورت دے دیتا ہے۔ ہر سبق کو ایک دلچسپ ڈرامے کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے جس میں طلبہ اور بسا اوقات اساتذہ بھی حصہ لیتے ہیں۔

یہ طریقہ ادب، تاریخ اور معاشرتی علوم کی تدریس میں خاص طور پر کامیاب رہا ہے۔ بچوں میں کسی سبق کے مختلف حصے بانٹ دیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے حصے کو ایک تمثیل یا ڈرامے کے پارٹ کی طرح ادا کرتے ہیں۔ مختلف پارٹ ادا کرنے سے وہ سارے سبق کے رموز و نکات کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں تمثیلی طریقہ سے کو کتابیں اور تعلیم ایک دلچسپ ڈرامہ کی شکل اختیار کر کے بچوں کے لیے مزید دلچسپی اور تجسس کا باعث بن جاتی ہیں۔ یہ طریقہ درس و تدریس تکان، مردنیت اور جمود دور کرنے میں بھی بہت مدد دیتا ہے۔

ڈرامائی طریقے پر تبصرہ :— ڈرامائی طریقہ چھوٹے بچوں کے علاوہ بڑے بچوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طریقہ کی مدد سے تعلم اور یاد کرنے کا عمل بہت آسان اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ بچے مل کر یوں محسوس کرتے ہیں جیسے وہ کسی تھیٹر میں بیٹھے کوئی ڈرامہ دیکھ رہے ہوں اور لگتا ہے گا ہے اس کے مختلف پارٹ اسٹیج پر خود بھی ادا کر رہے ہوں، اس اعتبار سے ڈرامائی طریقے کو تعلیم کے عام طریقوں پر بہت فوقیت حاصل ہے۔

تاہم اس طریقے کا دائرہ اطلاق محدود ہے۔ اسے زیادہ آسانی سے فقط تاریخ، ادب اور معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تمام نصابی مضامین کی تعلیم اسی ایک طریق تعلیم سے نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر کیمیا۔ طبیعات، ریاضی وغیرہ کو ڈرامائی طریقے سے پڑھانا تقریباً ناممکن ہے۔

(۳) منصوبی طریقہ

منصوبی طریقۂ تعلیم بذریعہ کھیل کی ایک ایسی قسم ہے جو درس وتدریس میں منصوبہ، مقصد اور معاشرتی حقیقت کے عناصر کو نمایاں کرتی ہے۔

اس طریقہ کے مطابق طلبہ کی تمام تعلیم دلچسپ منصوبوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً طلبہ ایک چھوٹے سے شہر، ڈاک خانہ یا دوکان وغیرہ کا نمونہ تیار کرنے کا منصوبہ تیار کرتے ہیں۔ وہ اکٹھے مل کر اینٹیں مٹی اور دیگر سامان تعمیر فراہم کرتے ہیں اور ایک باقاعدہ اسکیم کے ماتحت اپنے منصوبہ کے مختلف حصوں کی تعمیر میں لگ جاتے ہیں۔

منصوبوں کی تکمیل میں طلبہ نہ صرف غیر معمولی مسرت اور فرحت ہی محسوس کرتے ہیں، بلکہ کھیل ہی کھیل میں بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ مثلاً ایک چھوٹے سے شہر کا ماڈل بنانے وقت وہ ننھے ننھے پیمانہ پر رہائشی مکان تعلیمی ادارے۔ تجارتی مرکز، دکانیں، سڑکیں اور باغات وغیرہ تعمیر کرتے ہیں۔ ان عمارتوں سے متعلق نقشہ بنانے اور انھیں تعمیر کرنے کے دوران میں انھیں شہریت، انجینئری وغیرہ کی عملی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ اسی عملی تربیت کی روشنی میں وہ ان علوم سے متعلق کتابیں بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح ڈاک خانہ بنانے کی منصوبہ بندی میں بچے خط وکتابت، آمد و ذرائع، نقل وحرکت سے متعلق کافی کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ چھوٹی سی دکان کا ماڈل بنانے سے انھیں فن دکانداری، تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ سے متعلق کافی دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اس سمت میں کئی مشکل گتھیاں بھی بڑی آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں۔

منصوبی طریقہ کی اہمیت :۔ منصوبی طریقۂ تعلیم مدارس میں کافی کامیاب ثابت ہوا ہے۔ دلچسپ عملی منصوبوں کی تکمیل کے مواقع مہیا کرکے یہ طریقہ طلبہ کو درسی مضامین سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں زندگی کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برا ہونے کی خوش گوار عملی تربیت بھی دیتا ہے۔

یہ طریق تعلیم مغرب کے بے شمار مدرسوں میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ مشرقی ممالک میں بھی اس طریقہ سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں موگہ کے مشہور و معروف تربیتی ادارہ کی اساس اسی طریقہ پر رکھی گئی ہے۔ اس ادارہ میں دیہاتی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں جامعہ ملیہ دہلی اور چند دوسرے ترقی پسند تعلیمی اداروں میں منصوبی طریق تعلیم سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی "بنیادی تعلیم کی تجویز" دراصل منصوبی طریقہ کی ایک ایسی صورت ہے جسے ہندوستان کے دیہاتی بچوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے تصرف پذیر کیا گیا ہے۔

اس قدر مفید ہونے کے باوجود منصوبی طریق تعلیم ہر قسم کے مضامین کی تدریس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر زبان، صرف و نحو، منطق وغیرہ کا علم اس طریقہ کے ذریعہ سے پڑھانا مشکل ہے۔

(۴) ڈالٹن پلین

یہ طریق تعلیم یورپ میں بہت مقبول ہوا ہے۔ اس طریقہ کو ہیلن پارک ہرسٹ نے ۱۹۱۹ء میں امریکہ میں تجویز کیا تھا۔ ابتدا میں یہ لنگڑے لولے اور جسمانی طور پر معذور بچوں کی دیگر اقسام کی تعلیم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اسے میساچوسیٹس میں ڈالٹن کے مقام پر عام بچوں کے ایک مدرسہ میں پہلی بار کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اس وقت سے یہ طریق تعلیم ڈالٹن پلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ڈالٹن پلین درس و تدریس کے عام طریقوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ طریقہ بچوں کو مقررہ تعلیم اوقات اور مروجہ نصاب تعلیم سے نجات دلا کر انھیں خود مختار رکھ کر دلچسپ طریق سے تعلیم و تربیت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مدرسہ میں بچے ایسے کمروں میں کام کرتے ہیں جنھیں "تعلیمی تجربہ گاہیں" کہتے ہیں۔ ان تجربہ گاہوں میں ہر قسم کا تعلیمی سامان، کتابیں، چارٹ، تجرباتی مواد، وغیرہ موجود ہوتا ہے۔ طلبہ کو ان کے کام کی قسطیں دے دی جاتی ہیں۔ ان قسطوں کو "حوالہ جات" کہتے ہیں۔ یہ حوالہ جات مختلف علوم و فنون کے کسی مخصوص شعبہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ طلبہ ان حوالہ جات کو لے کر اپنی تعلیمی تجربہ گاہوں میں چلے جاتے ہیں اور اساتذہ کی مدد کے بغیر انھیں پورا کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

تعلیمی تجربہ گاہوں میں حوالہ جات پر کام کرتے ہوئے بچے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی چھوٹے

کارخانہ میں ننھے ننھے کاریگر خوشی خوشی کام کر رہے ہوں، اُن میں خود مختاری، احساس ذمہ داری اور تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں اور وہ ہنسی خوشی بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔

ڈالٹن پلین کی تعلیمی اہمیت: تعلیم بذریعہ کھیل کے طریقوں میں ڈالٹن پلین کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ طریقہ اس فلسفہ تعلیم کی تعمیل کرتا ہے جو درس و تدریس کو معاشرتی رنگ دینا چاہتا ہے۔ بچے اپنی تعلیمی تسطح پر تعلیمی تجربہ کے خوش گوار اور خود مختار ماحول میں کام کرنے کا موقع دے کر یہ طریقہ اس میں احساس ذمہ داری اور خود انتظامی اجاگر کرتا ہے۔ بچوں میں علمی بصیرت پیدا ہوتی ہے انھیں اساتذہ کی نگرانی کے بغیر محنت کے کام کو خوشی خوشی کرنے اور اپنا وقت نامہ اور نصاب خود وضع کرنے کی بہترین عملی تربیت ہوتی ہے۔

ڈالٹن پلین سے متعلق اس وقت تک کوئی ایسی باضابطہ تحقیق شائع نہیں ہوئی جس سے اس کی تعلیمی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ اس لیے فی الحال اس سے متعلق رائے زنی کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

بہت ممکن ہے کہ تعلیمی تجربہ گاہوں کے قیام وغیرہ پر غیر معمولی مالی اخراجات کی وجہ سے یہ طریق تعلیم اقتصادی طور پر پسماندہ ممالک کے لیے قابل عمل نہ ہو۔ بہرکیف اگر ممکن ہو تو چند مدارس میں تجربہ کے طور پر ایک آدھ تعلیمی تجربہ گاہ بنا کر اس طریق تعلیم کے نتائج کا تجرباتی مطالعہ بہت دل چسپ اور مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

(۵) انکشافی طریقہ

اس طریق تعلیم پر پروفیسر آرمسٹرونگ نے کافی تحقیق کی ہے۔ اسے پہلے پہل سائنس کے مضامین کی تدریس کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

انکشافی طریقہ کتابوں اور سننے سنانے کے ذریعہ سے تعلیم کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ یہ طریقہ طلبہ کو ایسے ایسے ماحول میں رکھ کر تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہے جن میں حقائق اور اصولوں کا انکشاف وہ خود کر سکیں۔

مثلاً طلبہ بھاری اشیاء کو زمین کی طرف گرتا دیکھتے ہیں، انھیں اس بات کی رغبت دلائی جاتی ہے کہ

وہ اس طرح کے مشاہدات اور واقعات کے اسباب پر غور و فکر کریں۔ اس قسم کے غور و فکر کی روشنی میں طلبہ پر آہستہ آہستہ یہ حقیقت خود بخود منکشف ہونے لگتی ہے کہ بھاری اشیا، قانونِ کشش ارضی کی وجہ سے زمین کی طرف کھینچتی ہیں۔ انھیں اس قانون کو مزید سمجھنے اور نیوٹن کی سائنسی تحقیقات پر مزید بصیرت حاصل کرنے کی رغبت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ کیمیا طبیعات، فلکیات، ریاضی وغیرہ کی کئی مشکل ترین گتھیاں بھی بڑی آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں۔

طلبہ میں اپنے ماحول سے متعلق بصیرت پیدا کرنا اور انھیں علوم و فنون کے رموز و نکات کو اپنی ذاتی کوششوں اور انفرادی محنت سے دریافت کرنے کی تربیت دینا اس طریقے کے بنیادی مقاصد ہیں۔ یہ طریقہ ان بنیادی مقاصد کے حصول میں بہت حد تک کامیاب رہتا ہے۔

انکشافی طریقہ پر تنقیدی نظر:۔ تعلیم بذریعہ کھیل کے باقی طریقوں کی طرح انکشافی طریقہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر سائنسی مضامین مثلاً طبیعات، کیمیا، فلکیات وغیرہ کے مطالعہ میں خصوصی مدد دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے طلبہ سائنسی اصولوں اور حقائق میں کافی بصیرت حاصل کر لیتے ہیں۔

تاہم اس طریقہ کا دائرہ اطلاق محدود ہے۔ اسے صرف سائنس کے مضامین کے درس و تدریس کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ غیر سائنسی مضامین مثلاً ادب، تاریخ، زبان وغیرہ میں اس کا اطلاق محال ہے۔

اس کے علاوہ یہ طریقہ بذاتِ خود ایک باضابطہ طریقِ تدریس کا مقام نہیں رکھتا۔ اس کی افادیت بچوں میں محض ایک سائنسی زاویۂ نگاہ پیدا کر دینے تک ہی محدود ہے۔

(۶) معاشرتی طریقہ

بچوں کو تعلیم دینے کے چند عملی معاشرتی طریقے بھی وضع کیے گئے ہیں۔ تعلیم بذریعہ کھیل کے ان تمام معاشرتی طریقوں کو مندرجہ ذیل گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

(۱) سکاؤٹنگ اور گائیڈنگ کی تحریکات

(۲) بچوں کے متفرق معاشرتی ادارے اور تحریکیں۔

لڑکوں کے لیے سکاؤٹنگ اور لڑکیوں کے لیے گائیڈنگ کی تحریکیں معاشرتی تعلیم و تربیت کے بہترین طریقے ثابت ہوئے ہیں۔ ان تحریکوں کا مقصد بچوں کو گروہی فکر و کردار، تعاون و قیادت، مصائب کا دلیرانہ مقابلہ کرنے اور روزمرہ زندگی میں کام کرنے والے بیسیوں دیگر محاسن میں عملی تربیت دینا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ تحریکیں رکن بچوں کے لیے کیمپ، میلے اور طرح طرح کے اجتماع منعقد کرنے کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان کیمپوں اور اجتماعوں میں مختلف قسم کے بچے متفرق قسم کی عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے بچوں سے ملنے جلنے کھیل کود اور سیر و تفریح سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بچوں کو بے انتہا خوش گوار انداز میں معاشرتی نظم و نسق اور فکر و عمل کا سلیقہ سکھانا بس انھی تحریکوں کا کام ہے۔

سکاؤٹنگ اور گائیڈنگ کے علاوہ بچوں کے چند متفرق معاشرتی اور تفریحی ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں جو ان کی تعلیم و تربیت کے کام کو ہنسی خوشی ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں: بچوں کی دولت مشترکہ بچوں کی بستی، بچوں کے کلب اور تفریحی مراکز، بچوں کے معاشرتی خدمت کے ادارے نوجوانوں کی تحریک۔ نوجوانوں کے قیام خانے وغیرہ مفید اداروں کی چند مثالیں ہیں۔ ان اداروں کی رکنیت سے بچوں کو اپنے فکر و عمل کو تخلیقی سانچوں میں ڈھالنے، شخصیت و سیرت کو سنوارنے اور گروہی کردار کو اپنانے کی بہترین تربیت میسر آتی ہے۔

معاشرتی طریقہ کی تعلیمی افادیت: معاشرتی طریقہ کی تعلیمی افادیت محتاج وضاحت نہیں ہے۔ سکاؤٹنگ، گائیڈنگ، یا بچوں کے کسی اور معاشرتی ادارے میں قبولیت سے بچے کی معاشرتی شخصیت میں سلجھاؤ اور سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے صحت مند، قانون پسند، کارآمد، اور کامیاب بالغ شہری بننے کی خوش گوار، اور عملی تربیت ملتی ہے۔

مصنف کو پاکستان اور برطانیہ میں بگڑے بچوں کی متعدد انواع سے واسطہ پڑتا رہا ہے اس نے دیکھا ہے کہ ان معاشرتی تحریکوں اور اداروں میں شمولیت کرنے والے بچے شاذ ہی کسی ذہنی علت یا کردار کی خامی کا شکار ہوتے ہیں۔ کسی ذاتی تکلیف سے متعلق رہنمائی یا علاج کی خاطر چائلڈ گائیڈینس کلینک

میں آنے والے بچوں کی اکثریت عموماً ایسے بدنصیب بچوں پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں بچوں کے کسی منظم معاشرتی ادارے میں شمولیت کا کوئی موقع میسر نہیں آیا ہوتا۔ اکثر ایسے بھی دیکھا گیا ہے کہ متعدد بچوں کی جذباتی تکالیف کسی باضابطہ معاشرتی ادارے کے رُکن بننے پر خود بخود ہی رفع ہو گئی ہوں۔ اس اعتبار سے ان معاشرتی تحریکوں اور اداروں کو بہت نمایاں نفسیاتی اہمیت بھی حاصل ہے۔

سکاؤٹنگ گائیڈنگ اور دیگر متفرق معاشرتی اداروں اور تحریکوں کی نفسیاتی اور تعلیمی اہمیت کے پیش نظر اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو ان میں سے کسی نہ کسی کے رکن بننے اور اس کے تمدنی اور معاشرتی مشاغل میں حصہ لینے پر آمادہ کیا کریں۔

تعلیم بذریعہ کھیل کا جامع طریق

تعلیم بذریعہ کھیل کے چیدہ چیدہ طریقوں کا ذکر مندرجہ بالا صفحات میں کر دیا گیا ہے۔ ان سب طریقوں کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ یہ تعلیم و تربیت کے عمل کو کھیل کی طرح آسان اور خوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اساتذہ کو ان طریقوں سے حتی الوسع استفادہ کرنا چاہیے۔

مگر یہ بات یاد رہے کہ کسی ایک طریق تعلیم ہی کو کامل رہ نما بنا لینا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بچوں کے درس و تدریس میں موقع و محل کی مناسبت سے ہر طریقے کی تمام خوبیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔

معلم اگر سوچ بچار سے کام لے تو کھیل کے ذریعہ تعلیم کا ایک ایسا جامع طریق اختیار کر سکتا ہے جس میں تمام طریقوں کے محاسن شامل ہوں۔ مثلاً ننھے اور چھوٹی بچوں کی تعلیم کے لیے معلم مانٹسوری طریقہ تعلیم سے استفادہ کر سکتا ہے۔ تاریخ، ادبیات اور معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ڈرامائی طریقہ بہترین ثابت ہوتا ہے۔ ڈالٹن پلین کے چند مخصوص مضامین کے مختلف پہلوؤں میں تعمق اور بصیرت پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

بچوں میں منصوبہ بندی کی صلاحیت اجاگر کرنے اور ان کی علمی دلچسپیوں کو عملی رنگ دینے کے لیے ...ی طریقہ بہت مدد دے سکتا ہے۔ سائنس کی تدریس کے لیے انکشافی طریقے کا استعمال بہت

موزوں رہتا ہے۔ بچوں کی معاشرتی شدھ بدھ اور ان کی شخصیت اور سیرت کی جامع نشوونما کے لیے معاشرتی طریقہ اپنی نظیر آپ ہے۔

تعلیمی جمود پر ضرب کاری

وطن کے تعلیمی نظام کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو اس کی بوسیدگی اور جمود پر افسوس بھی آتا ہے، اور ہنسی بھی۔ ہمارے مدارس کے اس فرسودہ نظامِ تعلیم پر صدیوں کی گرد چھائی ہوئی ہے۔ دنیا کے تمام تعلیمی ادارے بچوں کی جذباتی معاشرتی اور تمدنی تعلیم و تربیت کے مناسب سامان مہیا کر کے انھیں مہذب شہری بنانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ مستند ماہرینِ تعلیم طلبہ میں تعلیم سے بیزاری اور نفرت کے اسباب اور نتائج کا گہرا جائزہ لے رہے ہیں وہ ان سب باتوں کے سائنسی علاج کے لیے مسلسل تحقیق اور تجربے کر رہے ہیں۔

ہمارے طلبہ میں تعلیم و تربیت سے بیزاری اور بغاوت کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نظامِ تعلیم کی بوسیدگی اور جمود ہے۔ کھیل کے ذریعہ تعلیم کے طریقے اس تعلیمی جمود اور بوسیدگی پر ضرب کاری ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے نظامِ تعلیم سے بوسیدگی اور جمود کو واقعی طور پر مٹانا چاہتے ہوں تو ہمیں اپنی تعلیم کو خوش گوار اور موثر بنانے کے ذرائع پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے تعلیم بذریعہ کھیل کے جدید طریقے ہماری بہترین رہنمائی کر سکتے ہیں۔

چمنِ طفلاں (۲ سال سے پانچ سال)

منور جہاں رشید

چھوٹے بچوں کے لیے باغ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جماعت کا کمرہ۔ باغ نفسیاتی صحت کے لیے مفید ہے۔ اس کے ذریعے تعلیمی ترقی سہل اور دلچسپ ہے۔ باغ کی ہمہ گیر نشوونما میں معاون ہے۔ بچے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے کھیلنا ہر لحاظ سے مفید ہے۔ وہ اچھے باغ کو دیکھ کر خواہ مخواہ باہر کھیلنا پسند کریں گے۔ آزاد کھیل کو تعلیمی کھیل آسانی سے بنایا جا سکتا ہے۔ آزاد کھیل کو تعمیری اور تعلیمی کھیل میں تبدیل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ باغ میں رنگ اور خوشبو ہے۔ ہوا اور چمکیلی دھوپ ہے۔ باغ بچے کی فطری ضرورتوں کو کئی طرح سے مہیا کرتا ہے۔ وہ فطری طریقے جو نشوونما میں مد ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جسمانی نشوونما (۲) جذباتی سکون اور جذباتی نشوونما (۳) مجلسی آداب کی تربیت و مجلسی نشوونما (۴) تخلیقی کھیل کے مواقع (۵) زباندانی کا فروغ (۶) فنونِ لطیفہ کے ذوق کی نشوونما (۷) ذہنی و معلوماتی نشوونما (۸) روحانیت کی نشوونما۔

(۱) **جسمانی نشوونما و باغ** :- بچہ ایسے کھیل پسند کرتا ہے جس میں وہ اپنے اعضاء استعمال کرتا ہے اس عمر میں حرکت جسمانی فطری تقاضا ہے۔ وہ جسم کو متحرک کرنے پر مجبور ہے۔ ان حرکات کو روکنا اس کی نشوونما میں مداخلت ہے۔ باغ کی تازہ ہوا، اور دھوپ کی ہلکی شعاعیں اس کی صحت کی افزائش کا باعث ہیں۔ وہ باغ میں تیز بھاگتا ہے، درختوں پر چڑھتا ہے۔ کودتا ہے۔ اچھلتا ہے۔ گھاس میں لوٹنیاں لگاتا ہے۔ دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھاگتا ہے، کودتا ہے۔ زمین پر لوٹتا ہے۔ کھلونا گاڑیوں میں سامان لادتا ہے۔ گاڑیاں کھینچتا ہے وہ لگاتار مصروفِ حرکاتِ جسمانی ہے اور ان کے ذریعے پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ حرکات متوازن کرتا ہے۔ حرکات میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ یہ تیز دوڑ و حرکات کا کھیل باغ کی خوش گوار اور روحانیت سے گھری ہوئی فضا میں بچہ کی جسمانی و دیگر نشوونما کے لیے مفید ہے۔

(۲) جذباتی سکون اور جذباتی نشو و نما :- بچہ باغ کی خوشبو سے مسرور ہوتا ہے۔ رنگ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کھیل سے خوش ہوتا ہے۔ باغ کے دلآویز مناظر سے فرحت حاصل کرتا ہے۔ تیز حرکات کا کھیل بچے کے گہرے دماغ میں دبے ہوئے غصہ و انتقام کی آتش کو نکال دیتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے کھیل میں خیالی راموں کے ذریعے وہ اپنی آتش رقابت کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ انتقام لے لیتا ہے۔ بخت سزائیں جھوٹ موٹ کے کردار کو دے دیتا ہے۔ ناممکن خواہشات کو پورا کر لیتا ہے۔ جذباتی سکون کے امکانات مہیا ہو جاتے ہیں۔ گہرے دماغ کی غلاظتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ باغ کی منقش اور رنگین دنیا خوشی کا باعث ہے۔

(۳) مجلسی آداب کی تربیت اور مجلسی نشو و نما :- بچے مل جل کر کھیلتے ہیں۔ باغ کے پھولوں کو دیکھتے ہیں۔ پتوں میں چھپی ہوئی سبز بوٹیوں کو دیکھتے ہیں۔ تیز تیز بھاگتی ہوئی گلہریاں کو مل کر دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں۔ اپنے تجربات و مشاہدات سے دوسروں کو متعارف کرتے ہیں اور لطف اٹھانے کا موقع دیتے ہیں۔ سامانِ کھیل کو مل کر استعمال کرتے ہیں۔ درختوں کی ٹہنیوں پر۔ باڑوں کے نیچے مل کر بیٹھتے ہیں اور کھیلتے ہیں۔ گھاس پر قلابازیاں مل کر لگاتے ہیں۔ مختلف قسم کا کھیل بھی مل جل کر کھیلتے ہیں اور اسی بچوں کی محفل میں یہ مجلسی ادب سیکھتے ہیں کہ جب ایک بچہ ایک گروہ میں مل کر کھیلتا ہے تو اس کی ایک مقرر جگہ ہے اور ایک محدود ماحول ہے۔ بچہ اس محفل میں باہمی احترام۔ احساسات کا خیال۔ رواداری و تعاون سیکھتا ہے۔

(۴) تخلیقی کھیل کے مواقع :- بچے باغ میں آزادی سے کھیلتے ہیں۔ آزادی سے سوچتے ہیں۔ فضا خاموش ہے لیکن پھر بھی اس سکون میں زبان ہے جو کسی قسم کے عمل کی ترغیب دیتی ہے۔ دماغوں کے منجمد پردوں کو کھولتی ہے۔ سبزے کا گہرا ہوتا ہوا قرب نئے خیالات کی آماجگاہ ہے۔ نئی سوچیں بیدار ہوتی ہیں۔ طرح کی گہری آواز نئے خیالات برانگیختہ کرتی ہے۔ ان کی ترجمانی بچہ بے ساختہ کھیل میں کرتا ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیوں پر تیتریاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ بچے کے مشاہدہ کو گہرا کرتی ہیں۔ اس کی اپنی سوچ بیدار ہوتی ہے۔ اپنی سوچ سے اپنا کھیل اور اپنا کام پیدا ہوتا ہے۔ بچے میں تخلیقی عمل بیدار ہو جاتا ہے۔ بچہ تعمیری اور تخلیقی کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس کی جدت طبع مصروف ہو جاتی ہے۔

(۵) زباندانی کا فروغ :- باغ میں ایک اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک شے کا نام ہے

از نام کے پس پشت اپنی خاصیتیں ہیں۔ درخت ہے۔ اس کا تنہ ہے۔ شاخیں ہیں، اور پتے ہیں۔ درخت کا پھل لگتا ہے۔ باغ میں باڑیں لگتی ہیں۔ ان کے اندر گلہریاں تیز بھاگتی ہیں۔ گلہریوں کی کھال پر رنگین دھاریاں ہیں۔ بچے کے تجسس پر ایک تازیانہ لگتا ہے اور بعد ازاں سوالات پوچھتا ہے۔ اس کی لغت کھیل ہی کھیل میں وسیع ہوتی ہے۔ وہ درختوں۔ پھولوں۔ پودوں۔ جانوروں۔ پرندوں۔ کیڑوں مکوڑوں کے نام کھیل ہی کھیل میں سیکھ جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں سیکھتے ہیں وہ کہاں رہتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کس رنگ کے ہیں۔ بچے ان سے کیا کرتے ہیں وغیرہ۔

(۶) **فنونِ لطیفہ کے ذوق کی نشو و نما:** - باغ کی فضا میں ایک گہرا حسن ہے جس کو بچہ محسوس کرتا ہے۔ وہ رنگا رنگ کے پھول دیکھتا ہے۔ رنگ کی دلآویزیوں سے متعارف ہوتا ہے۔ کہیں سُرخ رنگ گلاب ہے اور کہیں پیلا۔ کہیں سفید سوتیا ہے تو کہیں گل داؤدی۔ بچہ باغ میں نیچر کو دیکھتا ہے۔ بچہ دیکھتا ہے کہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ شاخیں جھولتی ہیں پتے سرسراتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہوا کی آواز درختوں کی شاخوں سے ٹکرا کر کچھ اور ہے، اور گھنی جھاڑیوں میں گھستی ہوئی کچھ اور ہے۔ وہ پرندوں کی آوازوں کو غور سے سنتے ہیں۔ ان کے پروں کے رنگوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا فرق شناخت کرتے ہیں۔

(۷) **ذہنی و معلوماتی نشو و نما:** - باغ کا ماحول بچے کے شوق جستجو کو تیز کرتا ہے۔ ذہانت کے فروغ کے لیے ذخائر مہیا کرتا ہے۔ بچہ میں تفتیش و تحقیق بیدار ہو کر عمل میں آتی ہے۔ بچے کی معلومات میں اضافہ ہونے کے امکان ہیں۔ سائنس میں دلچسپی اور معلومات زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ نباتات سے دلچسپی بڑھتی ہے اور بیدار ہوتی ہے۔

بچے باغ میں خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پودوں کو دیکھتے ہیں جانداروں کو دیکھتے ہیں وہ آسمان کے وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ بادلوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سورج کو دیکھتے ہیں اس کی چمکیلی کرنوں کو دیکھتے ہیں۔ روشنی آتی ہے تدریجاً بڑھتی ہے اور گھٹتی ہے۔ سورج اللہ کا روشنی آسمان کے ایک کرنے میں گم ہو جاتی ہے۔ اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ سائے بڑھتے اور گھٹتے ہیں پودے بوئے جاتے ہیں۔ بیج چھوٹا سا ہے اس کو زمین میں بو دیتے ہیں وہ مٹی میں گم ہو جاتا ہے۔ کچھ

تی ہے۔ بڑھتی ہے۔ پودا بنتا ہے۔ شگوفہ پھوٹتا ہے۔ پھول بنتا ہے۔ کھلتا ہے۔ وہ پھول کو حیرت و تعجاب سے دیکھتے ہیں، وہ خوشبو کو پسند کرتے ہیں۔ کھلے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ سب ان کے لیے مطالعہ ہے۔ قدرت کی تخلیق میں باقاعدگی ہے۔ خالق ایک پودوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔ زندگی میں ایک ترتیب ہے بالیدگی میں ایک مرتب روانی ہے۔ بچے پتوں کو دیکھتے ہیں وہ پتوں اور پنکھڑیوں کی بناوٹ کو دیکھتے ہیں ان کا فرق شناخت کرتے ہیں۔ گلاب کی جھاڑیوں میں کانٹے ہیں۔ یہ معلومات ذاتی تجربہ سے حاصل ہوئیں۔ بچے باغ کی بیلوں اور پتوں میں چھپے ہوئے مختلف جانداروں کو دیکھتے ہیں اور بعد ازاں پہچاننے لگتے ہیں۔ مکڑیاں جالا بنتی ہیں، پتنگے اڑتے ہیں، چیونٹیاں اور چیونٹے رینگتے ہیں، تیتریاں پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کن جانداروں کو کہاں رہنا پسند ہے۔ کن کو کونسے پھول پسند ہیں۔ وہ بہت سے سوالات پوچھتے ہیں کیوں؟ کب؟ کیسے؟ وہ اپنی یاد میں معلومات کا وسیع ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔ سائنس و نباتات میں تجسس ذہنی معلومات کے فروغ کی بنیاد ہے۔

(۸) روحانیت کی نشوونما

باغ خاموش و گہرا مطالعہ ہے۔ سکون کی گہرائی روح پر اثر رکھتی ہے۔ پودوں اور پھولوں کی خوشبو کی چاہنے والے کی عظمت سے متعارف کراتی ہے۔ یہ روحانیت کی نشوونما کے لیے موثر ماحول ہے۔

باغ کی بناوٹ

باغ لگانے سے پہلے اس کی سکیم بہت سوچ بچار کے بعد تیار کرنی چاہیے۔ اس میں تفریح کے عنصر کے علاوہ بچے کی نفسیاتی صحت، فطری ضرورتیں اور تعلیمی تجربہ پر نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔

باغ میں کھلا کھیلا میدان بہت ضروری ہے۔ گھاس پر بچے ڈنڈیاں لگا سکتے ہیں۔ قلا بازیاں کھا سکتے ہیں۔ پھاٹک سے ایک سڑک باغ کو آنی چاہیے۔ یہ سڑک کم از کم ۵ فٹ چوڑی ہو۔ یہ سڑک جب باغ میں آ جائے تو ۳ فٹ ہو جائے۔ اس میں سے بہت سی اور سڑکیں نکلنی چاہئیں اور یہ سڑکیں باغ میں مختلف رخوں پر پھیلا دی جائیں۔ برسات میں اور جاڑوں کی ہلکی دھوپ میں بچے ان سڑکوں پر

اپنی کھلونا گاڑیاں۔ چھکڑے۔ موٹریں۔ ٹرائی سکل چلا سکتے ہیں۔ چھوٹے موٹے کے خود بنائے ہوئے چھکڑے اور دوسرا سامان کھیل جس کو سڑکوں پر کھینچ اور دھکیل سکتے ہیں۔ ان سڑکوں پر چلا سکتے ہیں۔

باغ میں ایک طرف چھوٹا سا کھلونا مکان ہو۔ یہ چار فٹ اونچا ہو۔ اس میں کھڑکیاں اور دروازے ہوں۔ اس کے اندر ایک لمبا بنچ ہو۔ ایک میز ہو اور کافی جگہ کھیلنے کی ہو۔ ان کھلونا مکانوں پر بیلیں چڑھی ہوں۔ سامنے کھلونا گملے رکھے ہوں۔ چھوٹا سا باغ لگا ہو۔ ان بیلوں سے مکان چھپ جائیگا اور بچوں کے کھیلنے کے لیئے "خفیہ مکان" بن جائے گا۔ جو کہ سب کی آنکھوں سے اوجھل ہوگا۔ بچوں کو سب سے چھپ کر پوشیدہ جگہوں پر بیٹھ کر کھیلنا مرغوب ہے۔ بیلوں میں قسم قسم کی تتیریاں مکڑیاں اور جاندار پلتے ہیں۔ بچے ان کو دیکھنا پسند کرتے ہیں، یہ دلچسپ مشغلہ ہے اور معلومات کی وسعت کا باعث ہے۔

باغ میں خفیہ کونے ہوں۔ کسی جگہ پر ایک جنگلہ لگا کر چار دیواری بنادی جائے۔ یہ چار دیواری نیچی ہو۔ اس جنگلے پر گھنی بیلیں چڑھادی جائیں۔ بچے ان بیلوں کے پیچھے اس چار دیواری میں بیٹھ کر کھیل سکتے ہیں۔

باغ کے کسی مناسب کونے میں ایک ڈھلوان ٹیلہ بنایا جائے جس پر بچے چڑھ جائیں اور پھر ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے نیچے آجائیں۔

باغ کو صاف کرنے کے بعد بہت سا ایسا سامان اکٹھا ہوجاتا ہے جو کہ بچوں کے کھیلنے کے کام آسکتا ہے اور اس کو باغ کے کسی کونے میں پھیلا دینا بچے کے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ مثلاً جھاڑیاں۔ پتوں کا ڈھیر۔ پرانے درخت کا تنا اور ٹہنیاں۔ بچے ان پر کئی قسم کا چھوٹے موٹے کا خیالی کھیل کھیل سکتے ہیں۔ گھاس والے میدان کی صفائی بہت ضروری ہے۔ اس میں کانٹے لکڑیاں اور ایسا نقصان دہ سامان نہ ہو جس سے بچوں کو چوٹ کا ڈر ہو۔ علاوہ ازیں اگر لان کی صفائی نہ ہو تو اس میں سانپ، بچھو جیسے نقصان دہ جانور موجود ہوں گے۔ بچوں کے باغ کا ہر کونہ لان کی طرح ہموار ہونا ضروری نہیں۔ کسی کونے میں گھاس ڈھلوان لگا ہو۔ اس میں رنگین پھول لگے ہوئے ہوں۔ وہ بچوں کے لیے اتنے ہی دلچسپ ہیں جتنا کہ ہموار تراشا ہوا میدان اور روشوں پر بہت قرینے سے لگے ہوئے پھول۔

باغ کے کسی اور گوشے میں پتوں کا نرم اور اونچا ڈھیر ہو۔ بچے اس میں لوٹنیاں لگا کر خوش ہوں۔

باغ میں کسی حصے میں گھاس یا نرم زمین پر لکڑی کے تختے، لکڑی کے ڈبے، لکڑی کے ڈرم، پیپے لکڑی کی اینٹیں، رسیاں وغیرہ پھیلا دیے جائیں۔ بچے ان کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اور ان پر بیٹھ کر ان کو کسی طرح سے استعمال کر کے چھوٹ موٹ کا کھیل کھیل کر کئی طرح سے مستفیض ہوں گے۔ رسیوں کو درختوں کی ٹہنیوں پر باندھ کر جھولے بنا دیے جائیں۔ پرانے موٹے ٹائر جھولے پر گدی کا کام دے سکتے ہیں۔ ایسے پرانے درخت جن کی شاخیں ملائم و مضبوط ہوں بچوں کے کھیلنے کے لیے خوب ہیں۔

زمین دوز باغ: - بچوں کے لیے بہت دلچسپ ہے۔ باغ میں ایک گڑھا کھودا جائے۔ اس میں چند سیڑھیاں نیچے جانے کے لیے ہوں۔ بچوں کو اترنے چڑھنے اور چھپ کر کھیلنے کے لیے یہ جگہ بہت خوب ہے باغ کا ایک کونہ بالکل ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ بچے یہاں پر زمین کھود کر مٹی کو مختلف سانچوں میں ڈال کر مختلف شکلیں بنانے کا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ یہاں پر بچے چھوٹی سی غار بنا کر اس کے اندر بیٹھ کر کھیل سکتے ہیں۔

پہاڑی باغ: - باغ میں ایک چھوٹ موٹ کی پہاڑی بنائی جائے۔ اس پہاڑی پر بہت سے پھول لگائے جائیں۔ بچوں کو سطح زمین سے اونچے لگے ہوئے پھول زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

بچوں کے باغ میں درخت، جھاڑیاں اور پھول لگانے سے پہلے بہت سوچ بچار سے کام لینا چاہیے۔

بچوں کے باغ میں درختوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ گرمامیں سایہ کا کام دیتے ہیں۔ ان پر پرندے آتے ہیں، بچے کے لیے ان کا مشاہدہ کئی طرح سے مفید ہے۔ بچے درخت پر چڑھنا چاہتے ہیں مضبوط شاخوں پر جھولے ڈالے جا سکتے ہیں۔ درخت ہوا کو صاف کرتے ہیں۔ نیم و یوکلپٹس کے درخت خوب ہیں۔ شیشم کے درخت مفید ہیں۔ پھلوں کے درخت بچوں کے علمی تجربہ کو وسیع کرتے ہیں۔ طبیعت کو فرحت دیتے ہیں۔ روح کے لیے گہرا و خاموش مطالعہ ہیں۔ خدا کی عظمت سے شناسائی ہے۔

بچے پھولوں کو توڑ کر گلدانوں میں لگاتے ہیں اور اپنے جماعت کے کمروں کو سجاتے ہیں۔ بعض پھولوں پر تتلیاں و پرندے آتے ہیں اور یہ بچوں کو دیکھنا مرغوب ہیں۔

بچوں کو باغبانی پسند ہے۔ باغ کا ایک کونہ باغبانی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ بچے سبزیاں لگائیں اور شوق باغبانی کی تسکین کریں۔ پالتو پرندوں اور جانوروں کے لیے باغ بہت مناسب جگہ ہے پرندوں کا رکھ رکھاؤ بچوں کی معلومات کی افزائش کرتا ہے۔ باغ میں پنجرے لٹک جائیں۔ ان میں مختلف پرندے ہوں۔ بچے ان کی دیکھ بھال کریں۔ مرغی خانہ بھی مفید و مرغوب ہے۔

باغ کو تعلیمی مشاغل کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بچے کا سامان کھیل اندر کے کمرے سے باہر باغ میں لے جایا جا سکتا ہے۔ اس میں مختلف قسم کا سامان کھیل شامل ہے۔ مثلاً وہ سامان جو تربیت جسمانی کے کھیل کے کام آتا ہے۔ تعمیری کھیل کے کام آتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے کھیل کے کام آتا ہے جیسی تربیت اور ذہنی نشو و نما کے کھیل کے کام آتا ہے۔ ریت و پانی کے لیے ٹرے یا گڑھے نقاشی کا سامان۔ مٹی وغیرہ۔ بچے اس کھیل سے آزاد عمل میں معروف ہو جائیں گے۔ باغ کی آزاد اور خوب صورت فضا میں کھیل میں کام کی لذت سے لطف اندوز ہوں گے۔

باغ میں سامان کھیل:- چڑھنے والا جنگلا بچوں کو بہت مرغوب ہے۔ اس کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔ سی، سا۔ توازن کے تختے۔ کودنے کا اسٹینڈ۔ جنگل جیم وغیرہ دلچسپ ہیں۔

باغ میں بہت سا سامان کھیل اپنا ہے۔ مثلاً پتے۔ شاخیں۔ چھڑیاں - تنے۔ لکڑی کے بڑے چھوٹے تختے وغیرہ۔ بچے ان کو کئی طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ لادنا۔ لیجانا وغیرہ۔ باغ میں بوجھل شہتیر دور دور پھیلا دینے چاہئیں۔ بچے ان کو کئی طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ گاڑیاں، بسیں، ہوائی جہاز بنا کر کھیلتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے کھیل میں ان کے قلعے بھی تعمیر کیے جاتے ہیں۔ چھوٹی شہتیریاں بھی خوب بچے مل کر لڑھکاتے ہیں، دھکیلتے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ مل کر کھیلنا سیکھتے ہیں شہتیروں پر بیٹھتے ہیں۔ میز تصور کر کے مہمان مہمان کھیلتے ہیں۔

باغ میں ریت سے بھرا ہوا ایک گڑھا ہو۔ یہ گڑھا بہت ہی کم گہرا ہو۔ ۴۰ بچوں کے لیے ۱۴۴ مربع فٹ کافی ہے مستطیل شکل میں ۶ فٹ چوڑا اور ۲۴ فٹ لمبا ہو۔ اس کی تہ پختہ اینٹ کی بنی ہو۔ گڑھے کے آس پاس پختہ جگہ ہو جہاں بچے بیٹھ کر ریت کو مختلف سانچوں میں

ڈھال کر کھیل سکیں۔ ریت میں چکنی مٹی نہ ہو۔ تاکہ گیلی ریت سے دلدل نہ بن جائے ایک پانی کا نلکہ قریب ہو تاکہ بچے پانی کا کھیل بھی آسانی سے کھیل سکیں۔

ایک بہت کم گہرا گڑھا کھودا جائے۔ اس کے چاروں طرف دو اینٹ کی چار دیواری بنائی جائے اس میں تین یا چار انچ گہرا پانی ہو۔ اس کی صفائی باقاعدگی سے ہو۔ اس میں بچے پانی کا کھیل کھیل سکیں گے۔

جہاں سکول دوسری منزل پر ہو یا جگہ کی قلت سے باغ نہ لگایا جا سکے۔ وہاں چھت گملے رکھ کر بیلیں چڑھا کر باغ کی ہریاول مہیا کی جائے۔ نباتات میں زندگی کی گردش دکھائی جائے اور چھت پر باقی سامان کھیل مہیا کیا جائے۔ چھت کی دیواریں اونچی ہوں تاکہ بچے گر نہ جائیں۔

نرسری سکول کی استاد کو نیچر سے بہت مس ہو۔ بچے کو باغ میں کھیلنے کے بہت مواقع مہیا ہوں۔ تاکہ اس کی قوت اختراع و قوت تخلیق عمل میں آ سکے۔ بچہ باغ میں کھیل کی ترغیب دینے والا سامان کھیل خود منتخب کرے اور اپنی سوچ سے اپنی پسند کا کھیل کھیلے۔ یہ بچے کی صحت مند نشوونما میں ممد ہوگا۔ قدرتی ماحول بچے کی جبلی ضرورتوں کی تسکین کے امکانات مہیا کرے گا۔ بچے کے گہرے وجود میں خوابیدہ مجلسی اخوت کے امکانات بیدار کرے گا۔ جذباتی سکون مہیا کرے گا۔ تخلیقی قوتیں بروئے کار آئیں گی، اور تندرست شخصیت جواں ہوگی اور پرورش پائے گی ۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

برطانیہ میں طلباء کے شب و روز

آکسفورڈ اور کیمبرج کی سماجی سرگرمیاں زیادہ تر انڈر گریجویٹوں کے کمروں میں ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک زمانہ میں دوستوں کو لنچ پر یا ڈنر پر مدعو کرنا ایک فیشن سا ہو گیا تھا۔ اور طلباء کے مہمانوں کے لیے کالج کے باورچی خانہ سے کھانا پک کر آجاتا تھا۔ آج کل معاشی نقطہ نظر سے یہ ضروری سا ہو گیا ہے کہ کالج کے کھانے کے کمرہ میں اکٹھے مل جل کر کھانا کھایا جائے۔ اور دوستوں کی دعوت مہمانداری محض تیسرے پہر کی چائے یا دوسرے مشروبات تک محدود رہے۔

ہر کالج میں انڈر گریجویٹوں کے لیے مشترکہ کمرہ ہوتا ہے اور یونیورسٹی میں متعدد دوسرے سماجی کلب ہوتے ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں یونین سب سے بڑا کلب ہے جس میں ایسے تاحیات اراکین کی وسیع تعداد بھی شامل ہے جو یونیورسٹی میں قیام پذیر نہیں ہیں۔ لیکن جب کبھی وہ واپس آتے ہیں تو یونین کلب کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ بالعاد نوجوان کھلاڑیوں کی بھی ایک مختصر سی تعداد ہے جس کی نگرانی آکسفورڈ میں ہڈ ننگ کلب اور کیمبرج میں ہپٹ کلب کے سپرد ہے۔ ان کی دلچسپیاں کھلاڑی دوڑ تک محدود ہیں۔ آکسفورڈ ونسنٹس اور کیمبرج ہاکس کا رکن ہونے کے لیے شجاعت شرط ہے دونوں یونیورسٹیوں میں سیاسی کلب بھی ہیں۔ مشہور ترین آکسفورڈ کا کارلٹن ہے جو لندن کی پارٹی کی طرح سے قطعی طور پر قدامت پسند ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے چھوٹے کلب ہیں۔ ہر ممکن تفریح، مذاق اور دلچسپی کے فروغ کے لیے انجمنیں ہیں۔

درحقیقت طالب علم سکول سے فراغت پاکر جیسے ہی آکسفورڈ یا کیمبرج میں داخل ہوتا ہے تو متعدد دعوت نامے دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ ان دعوت ناموں میں اسے ترغیب دی جاتی ہے

کہ کس طرح فلاں کلب کا ممبر ہو جانا اس کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ کس طرح، دریا فٹ بال اور کرکٹ کے میدانوں میں کالج کو اس کی خدمات درکار ہیں۔ مختلف پُرجوش اور سرگرم کارکن اسے سیاسی کلب کا رکن بننے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسے ہر زاویۂ خیال کی مذہبی انجمنوں کا ممبر بننے کی پیش کش کی جاتی ہے اسے فلم سوسائٹی۔ تھیٹر گروپ۔ انجمن موسیقی کوہ پیمائی کلب کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ اگر خود اس کے پاس قدیم ادب یا تاریخ یا طب کا موضوع ہے تو اس کے لیے انجمن قدیم ادبیات۔ تاریخ، کلب یا طبی سوسائٹی ناگزیر سمجھی جاتی ہیں۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کو کام کرنا ہے وہ ان دعوت ناموں کو بڑے اخلاق اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ البتہ اسے اگر کھیلوں کا شوق ہے تو وہ محض ایک کھیل موسم سرما کا اور موسم گرما کا منتخب کر لیتا ہے۔ اور لاتعداد کلبوں اور سوسائٹیوں میں سے چند میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کو اپنی مخصوص دلچسپیوں کو ترقی دینے یا نئی دلچسپیاں حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنے ذوق وشوق اور تجربہ کو وسعت دیتا ہے۔ جو یونیورسٹی تعلیم کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا خود نصاب تعلیم۔

ان میں سے بعض کلب اور سوسائٹیاں ان طلباء کے لیے بے حد مفید ہیں جو کسی خاص پیشہ یا ہنر کے لیے تیاری کر رہے ہوں۔ خواہ ان کا ڈگری کے کام سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ یونین اور سیاسی کلبوں کو برطانیہ کی تین خاص سیاسی جماعتیں۔ قدامت پسند۔ لیبر اور لبرل، جن میں سے ہر ایک کا صدر مقام لندن ہے۔ مستقبل کی طاقت کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کرتی ہیں۔ چناں چہ ممتاز سیاست دان ان کے جلسوں میں شرکت کرنے اور ان کو خطاب کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ دوسرا گروپ ڈرامائی سوسائٹیوں کا ہے یونیورسٹی ڈرامائی سوسائٹی اور تجرباتی تھیٹر کلب (آکسفورڈ) شوقیہ ڈرامائی کلب اور فٹ لائٹ کلب (کیمبرج) وہ ادارے ہیں جن کے پیش کردہ ڈراموں میں سے بعض سنجیدہ ہوتے ہیں اور بعض مزاحیہ لیکن سب ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں اور آج لندن اسٹیج پر بہت سی ایسی نمایاں شخصیتیں ہیں جو ان کلبوں میں ہی تجربہ اور تربیت حاصل کر کے ترقی اور کامرانی کے راستہ پر گامزن ہیں۔

بہت سے انڈر گریجویٹوں کے لیے انشا پردازی کا مشغلہ بڑی کشش رکھتا ہے۔ ان میں سے بہت سے

طلبا کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کتاب لکھ سکیں. لیکن بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنھیں طالب علمی کے زمانہ میں اپنی اس خواہش کی تکمیل کا موقعہ ملتا ہو. البتہ رسالہ نکالنے کی مشترکہ کوشش کے بار آور ہونیکا ضرور امکان ہوتا ہے اور بہت سے مشہور و معروف انشاپردازوں کے مضامین سب سے پہلے گرانٹا کیمبرج اور آئی سس آکسفورڈ میں طبع ہوئے ہیں. یہ دونوں بڑے قدیمی اور معیاری جریدے ہیں. بہت سی برطانوی یونیورسٹیاں اور کالج مختلف وقفوں کے بعد کم از کم ایک رسالہ نکالتی ہیں جسے انڈر گریجویٹ ہی مرتب کرتے ہیں. نئے جریدہ کا اجرا کرنا بڑا اولین شغل معلوم ہوتا ہے. چناں چہ وقتاً فوقتاً اس قسم کی مہمیں جاری ہوتی رہتی ہیں. اکثر اس قسم کی تحریکیں مالی امداد کی کمی اور ادارت میں ناتجربہ کاری کی بنا پر ناکام ہو جاتی ہیں. البتہ متعلقہ طلبا کے لیے یہ ایک تفریح طبع اور دلچسپی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

آزادی اور ضبط نفس :۔ اس باب میں طلبا کی جن سرگرمیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان میں طالبات کا بھی برابر کا حصہ ہے. بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی یونیورسٹیاں تقریباً راہبانہ اداروں کی طرح تھیں اگر اس زمانہ کا انڈر گریجویٹ پھر سے زندہ ہو جائے اور یونیورسٹی کی زندگی میں عورتوں کی سرگرمیاں دیکھے تو اسے اتنا ہی تعجب ہوگا جتنا جدید زمانہ کی نت نئی عملی ترقیاں دیکھ کر ہو سکتا ہے. اب طلبا اور طالبات دونوں سماجی سرگرمیوں میں برابر کا حصہ لیتے ہیں اور برطانوی یونیورسٹیوں اور کالجوں کا یہی منشا ہے کہ ترقی کی دوڑ میں دونوں دوش بدوش چلیں. یہاں ہر ایک آزادی میسر ہے. لیکن یہ آزادی قابل قدر ہونے کے ساتھ ساتھ ضبط نفس کی بھی تلقین کرتی ہے۔

مقابلہ کی بہت سی دلچسپیوں میں یہ حقیقت لازمی طور پر ذہن میں رکھنی چاہیے کہ امتحانات دن بدن قریب آ رہے ہیں. اور یہ دریافت کرنے کے لیے کہ آیا طالب علم اپنا وقت تو ضائع نہیں کر رہا ہے۔ امتحان سے بہتر طریقہ اب تک کوئی وضع نہیں کیا جا سکا ہے۔

خصوصی تعلیم کے ادارے :۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں خالص ادبی کورسوں کے علاوہ فنی کورسوں کا بھی انتظام ہے. بعض یونیورسٹیوں نے تو کافی عرصہ سے اس قسم کے خصوصی کورس کی بنا پر شہرت حاصل کر رکھی ہے. اور یہاں فنی علوم کے بےشمار کالج اور ادارے ہیں۔

ـــلاقائی اثر :- یونیورسٹی یا کالج کی بجائے وقوع خصوصی فن پر اثر انداز ہوتی ہے
ریہ ایک فطری بات ہے۔ مثال کے طور پر برسٹل، طیارہ سازی کی صنعت کا ایک بڑا مرکز ہے جہاں کی
ں کی یونیورسٹی میں طیارہ سازی کے مضبوط شعبہ کا موجود ہونا ناگزیر تھا۔ لیڈز کی یونیورسٹی پارچہ بافی
صنعتوں کے کورسوں کے لیے مشہور ہے۔ کیوں کہ یہ شمالی انگلستان میں واقع ہے جو ان صنعتوں کا مرکز ہے
رتین دوسری یونیورسٹیاں، مانچسٹر، گلاسگو اور بلفاسٹ ایسے اضلاع میں واقع ہیں جہاں پارچہ بافی
صنعت کے تربیتی کورسوں کا انتظام ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ متعدد کالج بھی اس موضوع
ے لیے مخصوص ہیں۔ دوسری مثال یہ ہے کہ برطانیہ میں کوئلہ کی کانوں کے قرب وجوار میں جو یونیورسٹیاں
ور کالج واقع ہیں ان میں کان کنی اور اس سے متعلقہ انجینیری کے مطالعہ کا انتظام ہے۔

مستقبل کے کاشتکار :- برطانیہ کی بارہ یونیورسٹیوں میں زراعت کے ڈگری کورسوں کا انتظام
ہے۔ ان میں ایک میں ڈیری فارم کا قومی ادارہ یونیورسٹی کا ایک جزو ہے جس کے اپنے سات سو
ایکڑ سے بھی زیادہ رقبہ کے تین کھیت ہیں اور ایک باغبانی کا مرکز۔ طلبا کی اکثریت زراعت یا باغبانی
کے مضامین اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ تمام دوسری برطانوی یونیورسٹیوں کی طرح آرٹ اور دوسرے کورسوں
کا بھی انتظام ہے۔ برطانیہ میں زراعت کے گیارہ مخصوص کالج ہیں۔ ان میں سے دو لندن یونیورسٹی
کی ڈگری کے لیے نجی طور پر تیار کراتے ہیں۔

فنی کالج :- اگرچہ بہت سے انڈر گریجوایٹ سائنس اور فنی علم (ٹیکنولوجی) کی حیثیت اپنے یونیورسٹی
کورس کے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ سنہ ۵۶-۱۹۵۵ء کے تعلیمی سال میں ایک تہائی سے زیادہ طلبا جن میں سے
اکثر مستقبل کے فنی ماہرین ہیں۔ فنی کالجوں میں شریک ہوئے ہیں۔ انگلستان اور ویلز میں تین سو سے زائد
اور اسکاٹ لینڈ میں تقریباً ستر ایسے کالج ہیں جو اپنا تمام وقت فنی تعلیم کے حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں
ان تین سو طلبا میں سے چند ہی یونیورسٹی سے رسمی تعلق رکھتے ہیں۔ انجینیری کی تمام اقسام کے علاوہ ہر قسم کے
فنی علوم مثلاً تعمیرات۔ پارچہ بافی، کان کنی، پلاسٹکس اور عملی طبعیات و نامیات کے مختلف پہلو سکھائے جاتے
ہیں۔ موجودہ زمانہ میں فنی علوم کی اہمیت کے پیش نظر برطانوی حکومت ان کالجوں میں اعلیٰ تعلیم کی نشستوں میں

اضافہ کے لیے عملی قدم اٹھا رہی ہے۔ مزید برآں اس نے ٹیکنالوجی میں ایک نئے ڈپلومے کا اجرا کیا ہے۔ یہ قابل قدر اور اعلیٰ ڈپلومہ یونیورسٹی کی آنرز ڈگری کے برابر ہوتا ہے۔

دولت مشترکہ کھیلوں میں پاکستان کی نمایاں کامیابی

پاکستان نے دولت مشترکہ کے کھیلوں کے مقابلوں میں، جو حال ہی میں کارڈف میں ختم ہوئے ہیں تین طلائی، پانچ نقرئی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ تینوں طلائی تمغے پہلوانی کے مقابلے میں جیتے گئے ہیں۔ پہلوانی کے ان مقابلوں میں جنوبی افریقہ کے بعد پاکستان کا دوسرا نمبر تھا۔

کھیلوں کے یہ عظیم الشان مقابلے جن میں ۳۷ ممالک کے کھلاڑی منتظمین اور سیاح شریک ہوئے دولت مشترکہ کھیلوں کے منتظمین کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ کھیلوں کے شاندار کارنامے اور مظاہرے سیاح اور تماشبین کافی عرصہ تک فراموش نہ کر سکیں گے۔

پیراکی اور کھیلوں میں جو نئے عالمی ریکارڈ قائم کئے گئے ہیں برسوں تک یادگار رہیں گے۔ چار سال پیشتر وینکوور میں منعقد ہونے والے کھیلوں کی طرح شمالی افریقہ اس مرتبہ بھی کشتی کے مقابلوں میں بازی لے گیا۔

پیراکی کے مقابلوں میں انگلستان اور آسٹریلیا نے مسلسل اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پیراکی کے آخری دن کے مقابلوں میں آسٹریلیا کے قابل فخر نوجوانوں جان اور السا کونروڈس نے شاندار کامیابی حاصل کر کے طلائی تمغے جیتے۔

اعزازات کی فہرست میں تیئیس ممالک کے نام شامل ہیں جن میں انگلستان کا نام سر فہرست ہے۔ کھیلوں کے ان مقابلوں انگلستان اول رہا جس نے اسی تمغے جیتے۔ آسٹریلیا نے چھیاسٹھ تمغے حاصل کر کے دوسرے نمبر پر رہا۔ جنوبی افریقہ نے اسی تمغے حاصل کیے اور کنیڈا نے ۷۰ تمغے حاصل کر کے چوتھے نمبر پر رہا۔ ان کے بعد نمبر حاصل کرنے والے ممالک کے نام یہ ہیں۔ نیوزی لینڈ ۱۹ ۔ اسکاٹ لینڈ ۱۳، ویلز ۱۱ پاکستان ۱۰ ۔ شمالی آئرلینڈ ۵ ۔ ہندوستان ۳ ۔ ویلز میں کھیلوں کا یہ عظیم الشان میلہ جسمانی کارناموں کا شاندار مظاہرہ تھا اور ایک ناقابل فراموش تقریب ۔:۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱۔ پاکستا بھر میں یہ دوہی تعلیمی رسالے ہیں۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے۔

۲۔ پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں۔

۳۔ ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں۔ ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے۔

۴۔ یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے۔ جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے۔

۵۔ ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی۔ تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں۔

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۹ کچہری روڈ۔ لاہور (پاکستان)